حُسنِ انقلاب

اِسلام کا سیاسی، معاشی اور ثقافتی نِظام

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

حُسنِ اِنقلاب

اِسلام کا سیاسی، معاشی اور ثقافتی نظام

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ایم۔اے۔ ڈی لٹ

سابق وائس چانسلر اِسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پُور

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

انتساب

زندہ انسانوں کے نام

جن کے دلوں میں معاشرتی سرطانوں، فرعونوں،
ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے ظلم و استحصال اور
محکومی و غلامی سے نجات اور حسنِ حیات و انقلاب کی
سچی آرزو ہے!

فہرست

۹

باب ۸ : حرفِ آخر

اِن چار سرطانی نظاموں کا اِستیصال ناگزیر ہے:

(۱) فرعونی۔ ہامانی یا غیر قرآنی سیاسی نظام۔

(۲) قارونی یا غیر قرآنی معاشی نظام۔

(۳) آزری نظامِ پیشوائیت۔

(۴) غیر قرآنی یا سرطانی ثقافتی نظام۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ وَنَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

آرزو و دُعا

(بحضورِ الٰہ و ربّ العالمین)

میرے اِلٰہِ جمیل، تُو ربِّ ذوالجلال والاکرام اور مستجیب الدعوات ہے!

ہم میں اپنے قرب[1] و رضوان[2]، حیات[3] و حسنہ[4] اور حُسنِ انقلاب[5] کی آرزو پیدا کرے!

ہمیں معاشرتی سرطانوں[6]: فرعونوں[7]، ہامانوں[8]، قارونوں[9] اور آزروں[10] کے ظُلم و استحصال، اور محکومی و غلامی سے نجات دے اور اپنے بندے بنالے۔

ہم عدل و احسان، امن و سلامتی اور طمانیت و مسرت کو ترس گئے ہیں، ہمیں یہ نعمتیں عطا فرما!

ہم نام کے مسلمان ہیں! ہمیں ایمان و تقویٰ اور علم و ہُنر کی روشنی و قوت عطا فرما! نیز ہمیں مُؤمن و موحّد، مجاہد و جفاکش، صالح و عادل اور شہید و صدّیق بنا دے!

ہم تیرے زندہ و حیات بخش کلامِ پاک[11] کو چھوڑ کر جمال و جلال، نور و زندگی اور رحمت و حسنہ سے محروم ہو چکے ہیں، ہمیں زندہ و بیدار کر دے اور اس سے ہمارا رشتہ استوار کر دے، نیز ہمیں تلامیذ القرآن[12] بنا دے۔

بارِ الٰہا! ہم نورِ بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں، ہم میں خیر و شر، حسنہ و سیئہ[13]، سود و زیاں، نفع و ربوا، عدل و ظُلم اور کامیابی و محرومی میں تمیز کرنے کی بصیرت و توفیق عطا فرما۔

ہم خوگرِ محکومی و غلامی ہیں، ہم ضمیر فروش و قلم فروش اور منافق و قوم فروش ہیں، ہم میں آرزوئے آزادی کا اِحیاء کر دے، اور ہمیں زندہ و صالح اور آزاد و سرفروش مجاہد بنا دے!

معاشرتی سرطانوں کو خوئے ظلم و استحصال ہے، ان کو نیست و نابود کر دے۔

ہم اسلامی معاشرے اور قرآنی نظام سے ناآشنا ہیں، ہمیں اسلامی معاشرے کی تعمیر اور
اس میں قرآنی نظام قائم کرنے کی طلب و آرزو اور ہمّت و توفیق عطا فرما!
ہمیں ایک بار پھر مثالی اُمّت بنادے اور اقوامِ عالم کی امامت تفویض کردے، نیز ہمیں
بنی نوعِ انسان سمیت جملہ مخلوقات کے لیے رحمت بنادے۔

ربِّ کریم! ہم ذلّت و مسکنت اور خوف و حزن میں زندگی کر رہے ہیں! اور ہلاکت و بربادی کے بادل
ہم پر منڈلا رہے ہیں، ہم اس عذاب اور قیامتِ صغرٰی سے تیری پناہ مانگتے ہیں ہمیں
فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریّت کی عملداری و سیادت، ظُلم و استحصال اور
خون آشامی و شر سے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ!
ہم حسنِ انقلاب کی دُعا کرتے ہیں، ہم معاشرتی سرطانوں کے استیصال کی التجا کرتے ہیں۔
تجھے اپنے جمال و رحمت کا واسطہ! ہمیں آتشِ خوف و حزن[۱۲] سے بچا اور اس آگ کو ٹھنڈا
کردے اور ہمیں اہلِ حسن و سرور[۱۴] بنادے۔

ہم میں محنت و مشقت کی افادیت و اہمیّت اور عظمت و فرضیت کا شعور نہیں رہا، اس لیے
ہم پسماندہ و مفلوک الحال، محتاج و دست نگر، ذلیل و خوار اور محتاج و دست نگر ہیں، ہم
میں یہ شعور پیدا کردے اور ہمیں محنتی و جفاکش اور صابر و متوکّل بنادے۔
ہم نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کلمہ پڑھتے اور آپؐ کی محبّت کا دعوٰی بھی کرتے ہیں، لیکن
آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کا اِتباع کرتے نہ آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی ہی کرتے ہیں!
ہم پر رحم و کرم فرما اور ایسا کرنے کی آرزو و توفیق عطا فرما۔
اس سودی و سرطانی معاشرے میں ہمیں رزقِ خبیث و حرام سے بچا اور رزقِ طیّب و
کریم عطا فرما۔

ربّ ہمارے! ہمیں دُنیا میں حسنہ عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنہ عطا فرمانا اور ہمیں آگ کے عذاب
سے محفوظ رکھنا۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

حواشی

۱۔ آرزو و دُعا: قرآنِ مجید کے فلسفۂ دُعا میں یہ اصل مضمر ہے کہ سچّی آرزو قبولیتِ دُعا کی پیش شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُعا مانگنے والے کے لیے پہلے اس کے دل میں سچّی آرزو کا زندہ وفعّال ہونا لازمی ہے۔ سچّی آرزو ایک تو خلوصِ نیّت، دوسرے موزوں عمل اور تیسرے تقدیری موزونی کو چاہتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دُعا ایسی مانگنی چاہیے جو انسان کے احوال و ظروف اور استعداد و قابلیت کے لحاظ سے موزوں ہو، یعنی وہ معروضِ دُعا کا سزاوار بھی ہو، نیز وہ اس کے لیے حتّی المقدور محنت و مشقّت، سعی و جہد اور ریاض و مزاولت بھی کرتا ہو۔

لوازماتِ دُعا میں سے ایک یہ ہے کہ اسے اس اعتماد و ایقان کے ساتھ مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ربِ رحمٰن و کریم، وہاب و مُعطی، غفار الذّنوب و توّاب الرّحیم، سمیع و بصیر، علیم و حکیم، و دود و غنی اور مستجیب الدعوات ہے۔

قرآنِ حکیم کے فلسفۂ آرزو کا لُبِ لباب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک انسان کی، چاہے فرد ہو یا قوم، اچھّی یا بُری حالت نہیں بدلتا، جب تک اس کے دل میں آرزوئے انقلاب پیدا نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر، تقدیر بننے یا بگڑنے کا دار و مدار انسان کی آرزو کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ فلسفۂ آرزو کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ "آرزو بر مراد" یہ فلسفۂ آرزو و دُعا قرآن مجید کی آیاتِ جلیلہ خصوصاً الانفال ۸: ۵۳، اور الرّعد ۱۳: ۱۱ سے ماخوذ ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انھیں آیاتِ جلیلہ کے مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

۲۔ قُرب و رضوان: قرآنِ حکیم کی یہ از بس اہم و فکر انگیز مُصطلحات اس کے فلسفۂ حیاتِ انسانی کی آئینہ دار ہیں۔ قرب کا مطلب تقربِ الٰہی اور رضوان کا اللہ تعالیٰ کی رضا یا خوشنودی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قربِ الٰہی پیش شرط (Pre-requisite) ہے، رضوانِ الٰہی کی، یعنی تقربِ الٰہی کے

بغیر رضائے الٰہی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب ان اصطلاحات کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے:

قربِ الٰہی: احوالِ ثلاثہ پر دلالت کرتا ہے: اوّلاً، انسان کی اپنے معبودِ محبوب اور مطلوب و مقصود (اِلٰہ) کی سچی آرزو پر۔ اور سچی آرزو سے مراد طلب و جستجوئے مدام، جذب و شوق اور محبّت بشرطِ استواری ہے۔ ثانیاً، انسان کے مقامِ "احسان" پر متمکن ہونے پر۔ مقامِ احسان سے مراد مشہودیت و شاہدیت کا حُسنُ المقام ہے، جو انسان کو اس کے حسنِ ذات کے نور کے اِتمام کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ "احسان" بلاشبہ عبدیّت کا ارفع و اعلیٰ حُسن المقام ہے، لیکن اس کے احوال ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جو الحسن والحق اور الجمیل و ربِّ جلیل ہے، ہر آن اپنے حُسن کی ایک نئی شان میں اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے۔ آیۂ جلیلہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

رضوانِ الٰہی: قربِ الٰہی بلاشبہ عبدیّت کا ارفع و اعلیٰ حسن المقام اور ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ ہے، لیکن جملہ عظیم و حسین اور ارفع و اعلیٰ نعمتوں میں سے افضل و اعلیٰ و ارفع ترین نعمت رضوانِ الٰہی ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے یا بندوں سے خوش ہونا اور ان سے اپنی خوشی کا اظہار کرنا اور اس نویدِ جانفزا سے اُنھیں سرورد کیفِ سرمدی عطا کرنا (دیکھیے التوبۃ ۹: ۷۲)۔

۳۔ حیات: قرآنِ مجید کا فلسفۂ حیاتِ انسانی تفصیل و اطناب کا متقاضی ہے، لیکن یہ موقع اجمال و اختصار چاہتا ہے، لہٰذا اس سے مختصراً گفتگو کی جاتی ہے:

حیات کی ضد و نقیض موت ہے۔ موت احساس و شعور، حرکت و فعلیت، قوت و توانائی اور جمال و جلال کے فقدان، نیز جمود و تعطّل، خرابی و فساد، برہمی و انتشار اور ہلاکت و بربادی پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا وظیفہ نفسِ انسانی کو اپنی لذّت سے آشنا کر کے جہانِ آخر (: الحیوان) میں پہنچانا اور خود فنا و معدوم ہو جانا ہے۔ زندگی ایک لطیفۂ سِرّی ہے، جو انسان کے حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کے قیام و فعلیت کی علّتِ غائی ہے؛ نیز اس کی بدولت اس کے وجود و ذات کا نشو و ارتقا ہوتا ہے اور ان میں حسن و نور، جمال و جلال، قوّت و توانائی اور حرکت و نمو پیدا ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان میں جذبات و احساسات، امیال و عواطف اور خواہشات و تمنیات پیدا ہوتی ہیں؛ نیز اس میں احساس و شعور، اظہار و بیان اور تخلیق و تعبیر کی قوّت اور علم و حکمت اور

فن و ہنر (ٹیکنالوجی) حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ جلالِ زندگی اگر انسان کو تسخیرِ کائنات کی تحریک کرتا ہے تو جمالِ زندگی اس کو اشیائے کائنات کے حسن سے جمالیاتی لذّت و حظ حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

یہاں ایک ازبس اہم و فکر انگیز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ الحیّ والقیوم ہے، یعنی زندہ بالذّات اور قائم بالذّات ہے؛ نیز وہ خالقِ حیات و ممات ہے، اس لیے موت اور اس کی ہر صورت سے وراء الوراء ہے، اور اس کو ثبات و دوام مستلزم ہے۔ چونکہ حیاتِ انسانی نفخۂ روحِ الٰہی ہے، لہٰذا ایک تو اس میں رنگِ صفاتِ الٰہی ہے اور دوسرے اُسے اُس میں فنا و معدوم ہو جانے کی نہیں، بلکہ زندۂ جاوید ہو کر اُس کے قرب و حضورِ سرمدی اور وجد در رضوانِ مدام کی آرزو ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ہر فردِ بشر میں وحدت و یکتائی اور حیاتِ جاودانی و بقائے دوام کی آرزو بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے؟ چنانچہ قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے وہ امر اور جاوید ہے اور لذّتِ موت سے آشنا ہونے کے بعد موت ناآشنا جہانِ دیگر میں، جسے قرآنِ مجید نے "الحیوان" سے تعبیر کیا ہے، موت سے محفوظ (Death-proof) پیکرِ نو میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ حیاتِ انسانی کسی حال میں بھی ذاتِ الٰہی میں فنا و معدوم ہونا نہیں چاہتی۔ چنانچہ بعض ادیان و مذاہب کا یہ نظریہ کہ روحِ انسانی مکتی و شانتی حاصل کرنے کے لیے ذاتِ الٰہی میں فنا ہونے کی طلب و جستجو رکھتی ہے اور بالآخر اپنے اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں اس میں فنا و معدوم ہو کر مکتی و شانتی حاصل کر لیتی ہے۔ باطل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ روح نہ رہی تو شانتی کیسے ہو گی؟ الغرض، فنا و عدمیت زندگی کو نہیں موت کو مستلزم ہے۔

حیاتِ انسانی دو قسم کی ہے! ایک خالص و حسین اور دوسری ناخالص و قبیح۔ چونکہ حسن میں طمانیت آفرینی و سرور انگیزی کی تاثیر پائی جاتی ہے، لہٰذا حسین زندگی خوف و حزن سے ناآشنا مطمئن و مسرور ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ناخالص و قبیح زندگی میں خوف و حزن کی آمیزش ہوتی ہے، جس کے باعث وہ نار بداماں ہوتی ہے۔ چنانچہ صاحبِ حسنِ زندگی کے لیے ہم نے صاحبِ حسن و سرور کی اور قرآنِ مجید نے نفسِ مطمئنہ و صاحبِ جنّت کی تعبیریں اختیار کی ہیں، جب کہ اس شخص کو جس کی زندگی ناخالص و قبیح ہوتی ہے، "اہلِ نار" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسے اشخاص جن کی زندگی نار بداماں ہوتی ہے، وہ آگ کے کپڑے

کے مانند ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں "بشری سمندر" کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۴۔ حسنہ: قرآنِ حکیم کی اہم ترین اخلاقی۔ جمالیاتی اصطلاحات میں سے ہے، جو اپنے اندر معانی کا دفتر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب ہے ہر دنیوی و اخروی نعمتِ حُسنیٰ، مثلاً ایمان و صالحیت، صدق و تقویٰ، آرزوئے حسن و زندگی، شرافت و سعادت، طمانیت و مسرّت، قناعت و توکّل، صبر و حلم، علم و حکمت، رزقِ کریم و کشادگیِ زیست، صحتِ قلبی و جسمانی، عقلِ سلیم و نورِ بصیرت، عزّت و وقار، راحت و آرام، برکت و رحمت، فلاح و کامیابی؛ نیز اللہ اور ربّ کی دوستی و حضوری اور قرب و رضوان وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ حسنِ انقلاب: اس اصطلاح سے مراد ہمہ گیر انقلابِ رحمت ہے، جس کا مثالی نمونہ ہمیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابِ رحمت میں ملتا ہے۔ یہ حُسنِ انقلاب آپؐ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے ذریعے جزیرہ نماعرب میں لائے، لیکن اس کے مقدّر میں ہمہ گیر و عالمگیر ہونا لکھا تھا اور اسی بنا پر آپؐ کو ربّ و رحمٰن کی طرف سے "رحمۃ للعالمین" ایسا عظیم و منفرد خطاب ملا، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ میرے فلسفۂ آرزو کی رُو سے جو قرآنِ حکیم سے مأخوذ ہے، آرزوئے انقلاب جو دراصل موضوعی انقلاب سے عبارت ہے، معروضی یا ثقافتی انقلاب کی پیش شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ثقافتی انقلاب، جس سے ہیئتِ اجتماعیہ کا انقلابِ کُلّی مراد ہے، عموماً جدال و قتال د[illegible] میں آتا ہے، لیکن جس انقلاب کے مقاصدِ جلیلہ میں افرادِ قوم یا افرادِ نسلِ انسانی کو معاشرتی سرطانوں کے طوق و سلاسل، ظلم و استحصال، جبر و اکراہ اور خوف و حزن سے نجات دلانا، ان کے دامنِ زندگی کو جمالیاتی ثروت یا حسنہ و رحمت اور خیر و سعادت سے معمور کرنا ہو، وہ جدال و قتال اصل میں جراحتِ مسیحائی ہوتا ہے، جو مریض یا مجروح شخص کے حق میں رحمت و حیات ہوتی ہے۔ ایسے انقلابِ رحمت کے لیے ہم نے حسنِ انقلاب کی تعبیر اختیار کی ہے۔ حسنِ انقلاب کی مثال اس جرّاحی یا اپریشن کی سی ہے، جو جرّاح یا سرجن کسی مریض یا مجروح شخص کی جان بچانے کی خاطر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ رحمت اور حسنہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، لہٰذا انقلابِ رحمت اور حسنِ انقلاب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

۶۔ معاشرتی سرطان: اس اصطلاح سے مراد وہ معاشرتی طبقے ہیں، جو اپنے آپ کو بڑا اور لوگوں کو

چھوٹا اور اپنا محکوم و غلام سمجھتے، ان کی تحقیر و تذلیل اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے فرعون و ہامان اور قارون و آزر کی قرآنی تلمیحات استعمال کی ہیں۔

۷۔ **فرعون:** متکبّر و سرکش، مستبد و ظالم اور مطلق العنان حکمران کی علامت ہے، جو رعایا پر احکام الٰہی کے بجائے اپنا حکم چلاتا ہے اور اپنے آپ کو رعایا کا اِلٰہ و ربّ سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے قصیدے پڑھیں، گُن گائیں اور اسے اپنا بطلِ عظیم، نجات دہندہ، رازق، محافظ اور قائد سمجھیں؛ نیز وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ سارے ملک میں ایک وہی ہے جو حکومت کرنے کی قابلیّت رکھتا ہے اور صرف اس کی ذات و حکومت ہی پر ملک کی سالمیت و استحکام، قوم کی بقا و ترقی اور دین کی حفاظت و صیانت کا دار و مدار ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اگر وہ حکمران نہیں رہے گا تو قوم کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ملک اغیار کے قبضے میں چلا جائے گا۔ علاوہ بریں وہ اپنے آپ کو قوم کا ممدوح و مطاع اور حاکم سمجھتا اور اس پر مختلف ناموں سے اپنا حکم چلاتا ہے۔

فرعونی حکومت کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی نہیں، حکمران اور اس کی جماعت کی ہوتی ہے؛ نیز اس میں احکامِ الٰہی یا آئینِ قرآنی کے بجائے حکمران اور اس کے جماعت کے احکام و قوانین کی عملداری ہوتی ہے۔

۸۔ **ہامان:** سیاسیاتِ جدیدہ کی زبان میں اس سے مراد ایسی نوکر شاہی یا بیورو کریسی (Bureaucracy) ہے جو مفاد پرست، ابن الوقت، منافق و طالع آزما اور فرعون کی ہمنوا و معاون ہوتی ہے؛ اور فرعون اور اس کی حکومت کے مفادات کی خاطر قوم و ملک کے حقوق و مفادات کو قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ اُسے قوم کی خوشحالی و ترقی اور امن و سلامتی کی پروا نہیں ہوتی اور فرعون کی خوشنودی کی خاطر "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" اس کی حکمت عملی ہوتی ہے۔

۹۔ **قارون:** علامت ہے ایسے جاگیر دار و سرمایہ دار طبقے کی، جو سود خور و حرام خور، متکبّر و مغرور، بخیل و تعاثر پسند، ظالم و قوم فروش اور منافق و مفاد پرست ہوتا ہے؛ نیز استحصال و جلبِ منفعت، اکتناز و احتکار، اسراف و تبذیر اور خود نمائی و فرعونیت پرستی اس کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ چنانچہ قارونیت علامت ہے

سرمایہ داری و سود خوری، تکبر و غرور، اکتناز و احتکار، بخل و ہوس پرستی، خودنمائی و خوشامد پسندی، بے ضمیری، ابن الوقتی اور قوم فروشی و سنگدلی کی۔

۱۰۔ آزر: علامت ہے باطل و مشرک مذہبی پیشواؤں کی، جو اپنے آپ کو دین و مذہب کا محافظ و اجارہ دار اور لوگوں کا شفیع و نجات دہندہ، پیر و مرشد اور مطاع و مخدوم سمجھتے اور ان کا طرح طرح سے استحصال کرتے، نیز مذہب کے نام پر ان میں شرک و قبر پرستی، اوہام و اکابر پرستی اور رسوم قبیحہ پھیلاتے ہیں۔ اس آزری طبقے کی ایک پہچان یہ ہے کہ یہ فرعون و ہامان اور قارون کا ہمنوا و معاون اور وہ اس کے سرپرست و مددگار ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں، تلبیس بالباطل سے قوم و ملت میں تفرقہ پیدا کرنا، فرقے بنانا اور قرآن حکیم کے احکام و تعلیمات میں باطل کی آمیزش کرنا اور ان کی صورت و معنویت کو بگاڑنا، ان کا شعار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی زبان میں آزروں کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ وہ

تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

۱۱۔ **زندہ و حیات بخش کلامِ پاک**: اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا زندہ و مطہر کلام ہے اور اس میں مردہ دلوں کو زندہ کرنے کی تاثیر ہے۔ ہمیں قرآن مجید سے متعلق یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ یہ انسان کی کتابوں کی طرح بے جان و گنگ نہیں، بلکہ زندہ بالذات و قائم بالذات علیم و حکیم اور سمیع و بصیر ربِ ذوالجلال والاکرام کا کلام ہے اور اس میں اس کی روح ہے جس کی بدولت یہ زندہ و ناطق اور طیب و مجیب الدعوات ہے، لیکن ان کے لیے جنھیں علم و حکمت، حق و صداقت، حسن و حیات اور اپنے الٰہِ حقیقی کی سچی آرزو ہوتی ہے، اور وہ مخلص و مطہر بھی ہوتے ہیں؛ نیز انھیں قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے پر یقینِ محکم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے سچے سائلوں اور تلامیذ کے استفسارات کا جواب دیتا اور ان کی رہنمائی و مدد کرتا ہے۔ قرآن مجید معلم و مزکی اور مربی ہے اور اپنے سچے تلامیذ کو علم و حکمت سکھاتا اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ تزکیہ قرآن مجید کی ازبس اہم جمالیاتی۔ نفسیاتی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قلب و نفس کی بیماریوں کو شفا دیتا، ان میں ودیعت صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لاتا، اور قوتوں کو نشوونما دیتا ہے۔

۱۲ا۔ تلامیذ القرآن: اس کے لغوی معانی تو ہیں قرآنِ مجید کے شاگرد؛ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد وہ طالبانِ حق ہیں جو سچے دل سے اُسے اپنا حقیقی مُعلّم سمجھتے ہیں اور اس کی ہر بات، حکم اور اُصول کو سمجھنے اور قبول کرنے کی خاطر اس پر خلوصِ دل سے غور و فکر کرتے اور اس پر یقینِ کامل رکھتے ہیں۔ خلوصِ دل کا مطلب قبولِ حق کے لیے اپنے دل کو موروثی و مذہبی وغیرہ اعتقادات و نظریات اور خیالات و تعصبات سے پاک و صاف کرنا ہے۔

۱۳ا۔ آتشِ خوف و حزن: قرآنِ مجید کے فلسفۂ خوف و حزن کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے خوف و خطر اور غمِ دُنیا سے دِل کو آگ لگ جاتی ہے، جس کی اذیتیں اسے جہنم بنا دیتی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے غمِ محبت سے انسان کو سوزِ دروں ملتا ہے، جس میں سرور انگیز و روح پرور ٹھنڈک ہوتی ہے، جو دل کو جنّت بنا دیتی ہے۔ قرآنِ مجید نے اولیاء اللہ یا اللہ کے دوستوں کی پہچان یہ بتائی ہے کہ انھیں خوف ہی ہوتا ہے نہ وہ غم ہی کرتے ہیں (یونس ۱۰: ۶۲)، بلکہ ان کے نفسِ مطمئن ہوتے ہیں (الفجر ۸۹: ۲۷)۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جنھیں خوف و غم ہوتا ہے وہ اہلِ نار یا دوزخی ہوتے ہیں۔ یہ ایسا سچّا موضوعی معیار ہے جو ربِّ رحمٰن و ستّار العیوب نے ہر فردِ بشر کو ودیعت کیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے خود ہی آسانی سے معلوم کرلے کہ وہ صاحبِ حسن و سرور یا جنّتی ہے یا اہلِ نار یعنی دوزخی ہے؛ نیز اگر وہ اہلِ نار ہے تو اپنے دل میں آرزوئے جنّت کا احیاء و ارتقاء کرے اور حسنِ عمل سے اپنی آتشِ خوف و حزن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے اور جنّتی بننے کے لیے سب راہوں کو چھوڑ کر فقط صراط المستقیم پر گامزن ہو جائے۔ بخلاف اس کے اگر وہ صاحبِ حسن و سرور یا جنّتی ہے تو ایسا رہے اور اپنے درجات کو بلند کرنے، نیز اپنے نورِ حسنِ ذات کے ارتقاء و اتمام کے لیے مساعیِ جمیلہ کرتا رہے اور صراطِ المستقیم پر گامزن رہے۔

۱۴ا۔ اہلِ حُسن و سُرور: یہ تعبیر ہم نے ان اہلِ ایمان و مطمئن انسانوں کے لیے اختیار کی ہے جو محسن ہوتے ہیں۔ محسن اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا شعارِ زندگی لوگوں سے احسان کرنا اور اپنے حسنِ عمل سے ان کی زندگیوں کو حسین و مطمئن بنانا ہے۔ چونکہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے احسان و حسنہ یا حسنِ عمل کا ردِّعمل بھی حسین و سرور انگیز ہوتا ہے، لہٰذا محسن کی اپنی زندگی بھی نورِ حسن و سرور سے منوّر و معمور ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کی نظر میں ایسے ہی لوگ نفوسِ مطمئنہ، اصحاب الجنۃ اور کامران و کامیاب ہوتے ہیں (دیکھیے الفجر ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خونچکانی و نشتر زنیِ قلم: کیوں؟

یہ خونچکانیِ قلم، جو میری خون فشانیِ چشم و قلب بھی ہے، اس لیے ہے کہ میری خوگرِ حُسن آنکھوں کو قدرت کے حسین و عظیم بشری شاہکاروں کی سرطان گزیدگی کے انسانیت سوز و روح فرسا نظاروں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھنے کا موقع ملا تو وہ حریفِ نظارہ نہ ہوسکیں اور خونابہ فشاں ہوگئیں۔ تجسّس و تحقیق کی نظر سے بارِ دیگر دیکھا تو معاشرتی سرطانوں کو اس سفاکانہ انداز میں مفلوک الحال محنت کشوں اور سادہ لوح انسانوں کا استحصال کرتے، خون چوستے، ان کی عزت و ناموس سے کھیلتے، ان پر ظلم کرتے، ان کی تحقیر و تذلیل کرتے اور انھیں حُسن و زندگی سے محروم کرتے دیکھا تو خون کھول اُٹھا اور آنکھوں میں اُتر آیا۔ لیکن میں کرتا تو کیا کرتا؟ میری حالت "قہرِ درویش برجانِ درویش" ایسی تھی۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس و رنج بھی تھا اور غصہ بھی آتا تھا۔ دل خون کے آنسو بھی روتا تھا، لیکن میں کیا کر سکتا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں ایک مدت تک رنج و الم، درد و سوز اور غیظ و غم کے عالم میں سوچتا رہا کہ مظلوم و محروم سرطان گزیدہ انسانوں کے دکھوں کی دوا اور محرومیوں کا مداوا ہو تو کیونکر ہو؟ اور میں ان کے لیے کچھ کروں تو کیا کروں؟ غوّاصِ فکر حسبِ معمول گوہرِ مقصود کی طلب و جستجو میں مستغرق تھا کہ دفعتاً دل کی دُنیا میں برقِ حسن آواز لہرائی اور لذّتِ حُسنِ الفاظ و معنی سے آشنا کر گئی۔ صدائے بازگشت میں رنگِ ارشاد تھا، جس کی نمود کچھ اس طرح تھی،

"اُٹھو: ایک ہاتھ سے قرآن مجید کو جو حبل اللہ ہے، مضبوطی سے تھام لو اور دوسرے ہاتھ سے قلم کو پوری قوت سے پکڑ لو اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ان خون آشام بشری سرطانوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ قلم عجائباتِ قدرت میں سے ہے۔ اس میں ایٹم سے زیادہ قوّت و توانائی، نیز حُسن و نور

ہے۔ یہ جمالیاتی۔ تخلیقی قوت کا لامتناہی سرچشمہ ہے۔ سنو! صریرِ خامہ صورِ اسرافیل بھی ہے اور اس میں تاثیرِ کُن" بھی ہے؛ اس کا دم، دمِ جبریل، اس کا نفس، نفسِ مسیحائی اور اس کی ضرب، ضربتِ کلیمی بھی ہے۔ قلم ترجمانِ قرآن ہو تو مثلِ جبریلِ امین ہے، اور اس کے کلام میں تاثیرِ برقِ حُسن ہوتی ہے، جو دلوں کو زندہ اور ظلمتوں کو دُور کرتی، نیز بیماریوں کو شفا بخشتی اور زندگی کے جادۂ مستقیم کو روشن کرتی ہے۔

قلم سیف اللہ بھی ہے۔ اس سے بشری سرطانوں کو چرکے لگاؤ، انھیں گھائل کرو اور اس کی قوّتِ رستاخیز سے ان کے محلّوں، ایوانوں، بنگلوں اور حویلیوں میں قیامت برپا کر دو اور سب کا استیصال کر دو۔ اس کے ساتھ قلم کے دمِ مسیحائی سے سرطان گزیدہ مظلوم و مفلوک الحال مُردہ عوام کو زندہ و بیدار کرو؛ ان میں حُسن و حیات اور انقلاب کی آرزو کا احیاء کرو۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ آرزو زندہ و فعّال اور سچی ہو تو قدرت اُسے پورا کر دیتی ہے، اس لیے کہ یہ اس کا قانونِ احترامِ آرزو ہے۔"

واردات سچی ہو تو یہ عام طور سے جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ کی وقوع پذیری کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس سے قلب کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ میں اس کیفیت سے نکلا تو مجھ پر حقیقت منکشف ہو چکی تھی۔ میں نے قرآنِ حکیم کو دل و جان میں بسایا اور اسے اپنا معلّم و مرشد بنایا۔ ایک مخلص متعلم و سائل کی طرح اس سے جو پوچھا، اس نے بتا دیا، اور جو بتایا، اُسے معرضِ اظہار میں لانے کی سعیِ جمیل کی، اس کا حاصل یہ کتاب "حسنِ انقلاب" ہے اور جو میری خونچکانی و نشتر زنی قلم کی علّتِ غائی ہے۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے انسان کو اکتساب اور اکتساب کو محنت و مشقت لازم ہے اور ربِّ کریم کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے لیے اکتساب یا محنت و مشقّت لابدی ہے۔ اس اعتبار سے اکتساب و تمتع لازم و ملزوم ہوئے؛ لہٰذا فلسفۂ اکتساب و فلسفۂ تمتع ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ اس فلسفے کا لُبِ لباب یہ ہے کہ انسان محنت و مشقت اور سعی و جہد کے ذریعے کسبِ علم و ہنر کرے، یا بالفاظِ دیگر، سائنس و ٹیکنالوجی کی تحصیل کرے، پھر کائنات کی نعمتوں سے استفادہ و تمتع کرنے کے لیے اسکی تسخیر کرے۔ اس اعتبار سے سائنس و ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں؛ لیکن اُمّتِ مسلمہ کی پسماندگی و محکومی، کمزوری و دست نگری اور ذلّت و مسکنت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ معاشرتی سرطانوں کی سازش کی وجہ سے نام نہاد "دینی" مدراس میں سائنس و ٹیکنالوجی کا داخلہ ممنوع ہے، اور آزریت کے نزدیک علومِ جدیدہ اور ٹیکنالوجی جن کے

بغیر کوئی قوم نہ تو ترقی و دفاع کر سکتی اور نہ قوّتِ تسخیر ہی حاصل کر سکتی ہے، "شجرِ ممنوعہ" ہیں۔ یہ صورتِ حال قرآنِ مجید کے اس ارشاد کا زندہ ثبوت ہے کہ انسان ظلوم و جہول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانتا ہے پر مانتا نہیں"

چونکہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے کائنات کی جملہ حسین نعمتیں کل اولادِ آدم کے لیے پیدا کی ہیں، لہٰذا ہر شخص کو بقدرِ سعی و ضرورت ان سے تمتّع کرنے کی رخصت ہے، لیکن انھیں ضائع کرنے یا ان سے دیگر حاجت مند افرادِ نسلِ انسانی کو محروم کرنے کا کوئی فرد یا قوم مجاز نہیں۔ یہ ظلم اور فساد[۵۲] ہے۔ قرآنِ مجید کے فلسفۂ معاشیات کا حاصل یہ ہے کہ دولت کو جو ربِّ کریم کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی "قوّت" ہے، محجوب[۵۳] و ناکارہ بنانا[۵۴] کفرانِ نعمت ہے، جو ظلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ یہ یاد رہے کہ گردشِ دولت کو غیر متوازن و محدود بنانے اور اس میں رکاوٹ پیدا کرنے سے دولت محجوب و ناکارہ بنتی اور ہیئتِ اجتماعیہ پر قبیح، منفی اور مسموم اثرات مرتب کرتی ہے۔ علاوہ بریں، اکتناز[۵۵] و احتکار[۵۶]، اسراف و تبذیر اور بخل[۵۷] و سود کاری (مثلاً مضاربت[۵۸] و مزارعت[۵۹]، بینک کاری و سرمایہ کاری، کرایہ کاری و دستار گیری وغیرہ وغیرہ) اور ظلم کاری و حرام کاری (مثال کے طور سے کاروباری بددیانتی و خیانت، نقضِ عہد، چور بازاری، سمگلنگ، قمار بازی و ضمیر فروشی، قلم و عصمت فروشی، چوری، سرقہ بالجبر، ٹیکس چوری وغیرہ وغیرہ) سے بھی دولت محجوب و ناکارہ اور قبیح و مسموم بنتی ہے؛ نیز ان افعالِ قبیحہ سے نہ صرف زندگی کے معاشی بلکہ ہر گوشے میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں فساد اور اس کی تباہ کاری کے یہی عوامل ہیں۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ سب افعالِ قبیحہ غارتگرِ حسنِ زندگی اور رہزنِ طمانیت و مسرّت بھی ہیں اور غم انگیز و خوف آفرین بھی۔ یہاں اس فکر انگیز و بصیرت افروز حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے اولیاء اللہ یا اہلِ جنّت کی ایک سلبی نشانی یہ ہے کہ انھیں خوف و حزن نہیں ہوتا؛ یعنی وہ آتشِ خوف و حزن کے عذاب سے محفوظ ہوتے ہیں؛ اور ان کی ایجابی نشانی یہ ہے کہ اُن کے نفسِ مطمئن یا خنکی لذّتِ طمانیت سے متکیّف ہوتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ خوف و حزن میں آتشِ سوزاں اور طمانیت و سکینت میں لذّت انگیز و راحت افزا ٹھنڈک مضمر ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے زکوٰۃ و انفاق بالعفو، صدقہ و خیرات اور عدل و احسان میں دولت کا تزکیہ یعنی اس کی تطہیر و تحسین کر کے اس کی نشو و نما کرنے اور اس کی گردش کو متوازن و ہموار اور دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی قوّت پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے قارون و آزر اور فرعون و ہامان ربِّ کریم کے جمیل و جلیل شہکار انسان کے کھلے دشمن اور اس کی زندگی اور حسن کے

دُزد و رہزن ہیں اور اس کا خونِ حیات اس انداز سے چوستے ہیں کہ اُسے حسن و حیات و انقلاب کی آرزو ہی نہیں رہتی؛ کچھ اس لیے بھی کہ سرطان زدہ لوگوں کو اپنی مرگِ مسلسل کا بہت کم شعور ہوتا ہے۔ چونکہ یہ معاشرتی سرطان ایک تو ان کی جمالیاتی حِس کی نشو و نما اور دوسرے اُنھیں لذّتِ حُسن و زندگی سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتے، لہٰذا اوّل تو ان میں حسنِ حیات و انقلاب کی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی، اگر پیدا ہو بھی جائے تو یہ ظالم اُسے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ حسن و حیات اور انسانیت کے ان اعدائے سفاک کی بیخ کنی کرنے کی خاطر سعی و جہد کرنا ہی جہادِ اکبر ہے، جو اہلِ ایمان پر فرض ہے؛ لیکن اس کی سعادت ان اہلِ درد و صلح اور اولوالعزم انسانوں کے حصّے میں آتی ہے، جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔

غور سے دیکھیں تو ترقی پذیر ممالک میں بالخصوص ناخواندگی و بے ہنری، محرومی و تنگیِ زیست، بیماری و گرسنگی، بیکاری و آوارگی، احتیاج و دست نگری اور ذلّت و مسکنت کے ذمے دار سرطانی طبقات ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں فحشا، منکرات اور جرم کیشی و سیاہ کاری کی گرم بازاری کے عوامل بھی فرعونی و قارونی طبقے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جب تک دُنیا سے سرطانی طبقات کا اِستیصال نہیں ہوگا، بنی نوعِ انسان خوف و حزن، محرومی و نامرادی، بیماری و مفلوک الحالی، ناخواندگی و جہالت، احتیاج و دست نگری کی اذیتوں سے نجات پا سکیں گے نہ لذّتِ حسن و حیات سے آشنا ہی ہو سکیں گے۔ ربِّ کریم نے دُنیا کو رنگ و بُو، حُسن و نور اور لذّت انگیز و روح افزا نعمتوں کی جنّت اور انسان کو حسین و صاحبِ ذوق بنایا ہے۔ لیکن یہ سُمّند رسرشت مفسد و ظالم معاشرتی سرطان ہیں، جنھوں نے دُنیا کو جہنم اور انسان کو اہلِ نار بنا دیا ہے؛ لہٰذا ان سرطانوں کا اِستیصال کیے بغیر انسان نہ تو لذّتِ حسن و حیات سے آشنا ہو سکتا اور نہ اپنی گمشدہ جنّت کو حاصل ہی کر سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر گلشنِ ہستی کو ان خون آشام و انسانیت کُش سرطانوں سے پاک و صاف کرنے کی خاطر دُنیا بھر کے سرطان زدہ محنت کشوں کو متحد ہو کر "جہادِ اکبر" کا آغاز کر دینا چاہیے تاکہ تاخیر کی صورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سرطانوں کی آتشِ حرص و آز خرمنِ ہستی پر برقِ فنا بن کر گرے اور اُسے خاکستر کر دے۔

حسن و زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ انسان کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اُسے جمالیاتی حِس ودیعت کی ہے۔ لہٰذا زندہ وہ ہے جس کی آرزوئے حسن زندہ ہے اور جس کی آرزوئے حسن زندہ نہیں، وہ مُردہ ہے۔ اسلام انسان میں آرزوئے حُسن کو زندہ و

حر کی دیکھنا اور اس کا اِتمام چاہتا ہے۔ بخلاف اس کے قارون و آزر اور فرعون وہامان اوّل تو انسان میں آرزوئے حسن کو پیدا ہونے ہی نہیں دیتے، اگر وہ پیدا ہو بھی جائے تو اس کا خون کر دیتے ہیں۔ انسان کا خون چوسنا اور اس کی آرزوؤں کا خون کرنا معاشرتی سرطانوں کی سرشت بھی ہے اور حاجت بھی، اس لیے کہ خون ہی تو ان کی غذا ہے۔ دوسرے وہ زندہ و اہلِ آرزو انسانوں سے خوف کھاتے ہیں کہ کہیں وہ حسنِ انقلاب کے ذریعے ان کا طلسم توڑ نہ دیں اور ان سے ان کے صدیوں کے مظالم و خون آشامی کا انتقام نہ لیں۔

حسن و زندگی کے دشمن اور سارق و رہزن سرطانوں کے نظامِ معیشت میں مظلوم و مفلوک الحال محنت کش صدیوں سے حُسن و زندگی سے محروم ہیں، لیکن دل کی موت اور مرگِ آرزو اور سرطانوں کی تشہیر بالباطل کے سبب بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ انسان خود آگاہ نہ ہو تو خدا آگاہ بھی نہیں ہوتا۔ حیاتِ انسانی کا ایک عبرت ناک المیہ یہ ہے کہ انسان اوّل تو آیاتِ الٰہیہ اور زندگی کے عبرت انگیز و حکمت آموز حادثات و سانحات کو دیکھتا ہی نہیں، اور اگر دیکھتا بھی ہے تو بیگانہ وار دیکھتا ہے اور حقیقت سے آنکھیں چُرا کر گزر جاتا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا المیہ جو اس کے ظلم و جہل کا نتیجہ اور آئینہ دار ہے، یہ ہے کہ طلسمِ فرعونی وہامانی اور سحرِ قارونی و آزری کے باعث، نیز اپنی جاپاناتی حِس، عقلِ سلیم اور آرزوئے حُسن و حیات کے مفلوج و مردہ ہو جانے کے سبب یہ سرطان گرفتہ و سحر زدہ زندہ نہ مُردہ انسان اپنے سود و زیاں اور دوست و دشمن میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس کے نتیجے میں وہ سرطانوں کی شہ پر اپنے ناصح و خیر خواہ دوستوں ہی کی مخالفت کرنے لگتے ہیں جو انھیں حسن و زندگی کی لذت سے بہرہ مند کرنے کے لیے معاشرتی سرطانوں سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے، اس لیے کہ اس پر تاریخ اور قرآنِ مجید دونوں شاہد ہیں تو ان کی رُو سے یہ بھی صحیح ہے کہ قرآنِ مجید کے انقلاب انگیز و حیات آفرین کلماتِ توحید: "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"[۱] اور "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ"[۲] کے ذریعے مُردہ دلوں اور ان میں مُردہ آرزوئے حسن و حیات کا احیاء اور معاشرتی سرطانوں کا استیصال کیا جا سکتا ہے۔

میں جب سنگدل و خون آشام سود خور قارونوں، حرام خور آزروں، رشوت خور ہامانوں اور متکبر و مستبد فرعونوں کو اپنے بھائیوں کا خون چوستے، استحصال کرتے اور انھیں ربِّ کریم کی نعمتوں، خصوصاً حسن و زندگی

سے محروم کرتے؛ نیز ان پر مظالم توڑتے، ان کی تحقیر و تذلیل کرتے، عصمت و ناموس سے کھیلتے اور عزتِ نفس کو مجروح کرتے دیکھتا ہوں تو خون کے آنسو روتا ہوں۔ مجھے یہ سب ناگ، بچھو، کنکھجورے اور سرطان دکھائی دیتے ہیں، جو مرگِ زندہ کی بھیانک صورتیں ہیں۔ بخلاف اس کے ہر مظلوم و مقہور اور محروم و مفلوک الحال محنت کش زبانِ حال سے یہ فریاد کرتے سنائی دیتا ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

ایں قدر ہست کہ ایں بندہ خداوند نداشت (غالبؔ)

مجھے مظلوم و مفلوک الحال انسان ایسے لگتے ہیں جیسے وہ حسن و زندگی کی لذت سے بہرہ مند ہونے کے لیے نہیں بلکہ خوف و حزن کی آگ میں جلنے کے لیے جی رہے ہوں۔ زندگی جو ربِّ کریم کی نعمتِ عظمیٰ ہے، ان کے لیے کربِ مرگ ہے۔ تندرست ہوں تو قارونوں کے لیے عرق ریزی و خون فشانی کرتے اور انھیں اپنا خون پلاتے رہتے ہیں، بیمار ہوں تو علاج معالجے اور دوا دارو کو ترستے رہتے ہیں۔ ان کے بچے اس طرح زندگی کرتے ہیں جیسے اسیرانِ بلا موت سے نبرد آزما ہوں۔ میں انھیں اور ان کے معصوم بچوں کو مر مر کر جیتے اور جیتے جی مرتے دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ میں حسن و زندگی اور دیگر نعمتوں سے محروم بچوں کو سرما کی تند و تیز سردی اور گرما کی چلچلاتی دھوپ میں علم و ہنر سیکھنے کے بجائے برہنہ جسم و پا محنت و مشقت کرتے دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں۔ دل پوچھتا ہے: کیا ظالموں کو ظلم سے باز رکھنا اور مظلوموں کی حمایت کرنا، نیز ان کو سفاک سرطانوں کی خون آشامی سے بچانے کے لیے سعی و جہد کرنا، انسانیت، زندگی اور دین کا تقاضا نہیں؟ کیا یہ جہاد نہیں؟ اگر یہ جہاد ہے اور یقیناً ہے، اس لیے کہ اسکو جھٹلانے کا ہمارے پاس کوئی منطقی جواز نہیں تو پھر ایسا نہ کرنا، جرم و گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟ علاوہ بریں، کیا فرعونوں، ہامانوں اور آزروں کے ہمنوا شرک و ظلم اور جرم و گنہگار نہیں ہوتے؟

سود خور و حرام خور قارونوں، آزروں، فرعونوں اور ہامانوں کے کارخانوں، نیز محلوں، بنگلوں اور حویلیوں میں ربِّ جلیل کے حسین و مکرم شاہکاروں کو محنت و مشقت اور کسبِ حلال کرنے کے باوجود محتاج و دستِ نگر اور ذلیل و خوار دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر اسیرانِ آلِ فرعون بنو اسرائیل کا گمان گزرتا ہے، جو اپنی نجات کے لیے

کسی صاحبِ عصائے کلیمی کے منتظر و طلب گار ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ان عظیم عمارات کی "متعفن و تاریک" اور بظاہر صاف و روشن فضا ہی میں جرم و گناہ اور ظلم و عدوان کے مار و کژدم نشو و نما پاتے اور اللہ کے بندوں کو ڈستے، اِن کے قلب و جاں میں زہر گھولتے، نیز معاشرے میں فتنہ و فساد برپا کرتے اور خوف و ہراس پھیلاتے ہیں۔ سرطانوں کے عشرت کدے ان زلزلوں کے مرکز ہیں جو مفلوک الحال انسانوں کی بستیوں اور جھونپڑوں میں آئے دن قیامت برپا کرتے رہتے ہیں؛ نیز وہ آتش فشاں کوہستان ہیں، جن میں لڑائیوں اور جنگوں کا لاوا پکتا رہتا ہے اور پھٹتا ہے تو دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلِ سلیم کا فتویٰ یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کے دین و ایمان، مال و جان اور عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے ان زلزلوں کے مرکزوں کی بیخ کنی ناگزیر ہے؛ جس کا بہترین ذریعہ "حُسنِ انقلاب" ہے۔ ساتھ ہی اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ انقلاب عبارت ہے احوال و ظروف کے تغیّر سے، اور تغیّر قبیح و سیّئہ کا ہو اور حُسن و حسنہ، عدل و احسان اور خیر و رحمت کے لیے ہو تو اس کے لیے ہم نے "حُسنِ انقلاب" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

حُسنِ انقلاب کا اصل الاُصول یہ ہے کہ معاشرتی۔ نفسی سرطانوں[۱۳] سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک تو حُسنِ انقلاب ناگزیر ہے اور دوسرے اس کے لیے قیادت کا صالح اور عوام میں آرزوئے حسنِ انقلاب کا زندہ و فعّال ہونا لازمی ہے۔ قرآن حکیم کا فلسفۂ آرزو یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں اپنی حالت کو بدلنے کی آرزو زندہ و فعّال نہیں ہوتی، ربِّ ذوالجلال والاکرام اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔[۱۴] فرد ہو یا قوم، مردہ سے زندہ ہونے اور حسین انداز زندگی گزارنے کے لیے اس میں آرزوئے حسن و زندگی کا زندہ و فعّال ہونا ناگزیر ہے۔ بالفاظِ دیگر، نفسیاتی انقلاب خارجی و معاشرتی انقلاب کی پیش شرط ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر مظلوم و مفلوک الحال لوگوں کے دلوں میں ان کی محرومی و محکومی، مظلومی و دست نگری اور ذلّت و مسکنت[۱۵] کا احساس و شعور بیدار کرنا اور حسنِ انقلاب کی طلب و جستجو پیدا کرنا، لابدی ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حسنِ انقلاب کے عظیم و بے مثال داعی و علمبردار حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلّم کی مکّی زندگی مشرک و مظلوم اور سرطان گرفتہ لوگوں کے مردہ دلوں میں محرومی و

نامرادی اور ضلالت و زیاں کے احساس و شعور اور حسنِ حیات و انقلاب کی آرزو کو زندہ و فعال کرنے کا شکیب رُبا دُور رِسی وجہ تھا تو مدنی زندگی مسلمانوں میں بالخصوص حسنِ انقلاب لانے اور حسین و مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے کا ہمّت طلب و صبر آزما عہد اور تاریخ کا ایک حسین و مثالی دور تھا۔[۲۶] اس وقت پھر اقوامِ عالم اور خاص طور سے مسلم اقوام کو ایسے حسین و مثالی معاشرے کی ضرورت و حاجت اور طلب و جستجو ہے، لہٰذا میری خونچکانی و نشتر زنیِ قلم کی غایت بھی ایسے ہی معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو اور اس کے لیے ایسا ہی انقلاب لانا ہے۔ حُسنِ انقلاب سے مراد حسین و منوّر نفسیاتی۔معاشرتی انقلاب ہے۔ نفسیاتی انقلاب کا مطلب مظلوم و محروم انسانوں کی آرزو کا بدل جانا اور حسنِ حیات و انقلاب کی آرزو کا زندہ ہو جانا ہے؛ اور معاشرتی انقلاب عبارت ہے توحید و رسالت، عدل و احسان، اخوّت و مساوات اور حُرّیت و رحمۃ للعالمینی کی بنیادوں پر حسین و مطہر معاشرے کے قیام سے۔ ایسے ہی حسین و مثالی معاشرے کو اسلامی یا قرآنی معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حسن المآب یا جنّت ہوتا ہے، شرّ المآب یا جہنّم نہیں ہوتا۔ اس کی دیگر امتیازی خصوصیات میں سے چند ایک یہ ہیں: اس کا آئین، آئینِ قرآن، اس کا الٰہ و ربّ تنہا اللہ تعالیٰ، اس کی ثقافت، ثقافتِ محمدیؐ؛ نیز اس کے افراد صالح و متقی، محسن و مجاہد، حق گو و حق شناس، محنتی و جفاکش، صابر و متوکّل، آزاد و مکرّم، خوف و حزن اور افلاس و احتیاج سے مصئون ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں، اس میں کفر و عدوان، شرک و اصنام پرستی، ظلم و استحصال، فحشا و منکر، فتنہ و فساد اور جہالت و ناخواندگی کے اندھیروں کا فقدان ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ قرآن و توحید، علم و حکمت اور ادب و ہنر (اور ٹیکنالوجی و دیگر فنون) کی روشنی سے منوّر اور اخوّت و محبّت، آزادی و مساوات، عدل و احسان اور امن و سلامتی کی جنّت ہوتا ہے۔

یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ یہ انقلاب آفرین کارنامہ کون سر انجام دے سکتا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ایسا عظیم کارنامہ وہ مخلص و صاحبِ آرزو مردِ مجاہد سر انجام دے سکتا ہے، جسے ہوسِ تکاثر ہو نہ حکومت کی پروا، بلکہ اس کے دل میں حُسنِ انقلاب کے ذریعے قرآنی معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو کرنے کی آرزو ہو۔

اگر دُنیا کے مظلوم و مقہور اور محروم و مفلوک الحال انسانوں کو خصوصاً، آزادی و خوشحالی اور عزت و آبرو سے زندہ رہنا ہے تو اُن کے لیے آرزوئے حسن و حیات کی انقلاب انگیز قوت کے ذریعے پہلے اپنے اندر اور پھر باہر معاشرے میں حسی انقلاب لانا ناگزیر ہے؛ ورنہ بصورتِ دیگر، قدرت خود انقلاب لائے گی کہ یہ اُس کی سُنت ہے اور وہ قیامت بداماں ہوگا۔ چونکہ معاشرتی نفسی سرطانوں کے استیصالِ کُلّی کے بغیر حسنِ انقلاب کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے سب سے پہلے دُنیا کو ان کے وجود سے پاک وصاف کرنا ہوگا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے عظیم و عہد آفرین کارنامے کو سرانجام دینے کا بہترین طریقہ رحمۃ للعالمینؐ کی سُنتِ حسنہ کے مطابق "لا" کی منفی قوتِ سلب و نہب اور "الا" کی اِثباتی قوتِ تکوین و تعمیر کا حکیمانہ استعمال ہے۔

توحید کا سِرِّ نہاں یہ ہے کہ کُل افرادِ نسلِ انسانی آدم کی اولاد اور نفسِ واحدہ کے مانند ہیں؛ نیز وہ فقط اللہ تعالیٰ کے عیال اور بندے ہیں اور تنہا وہی سب کا اِلٰہ و ربّ ہے؛ اور اس نے حسنِ کائنات کی حسین نعمتیں اپنے جملہ بندوں کے تمتع و استفادے کے لیے پیدا کی ہیں اور کر رہا ہے؛ لیکن معاشرتی سرطانوں نے ان پر یعنی وسائلِ پیداوار پر ناجائز قبضہ جما رکھا ہے، جس کے نتیجے میں وہ قوت و سطوت حاصل کر کے محنت کشوں کو بالخصوص اپنا محکوم و غلام اور محتاج و دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ ان خون آشام معاشرتی سرطانوں سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے حسنِ انقلاب، جس کی کامیابی مندرجۂ ذیل تین چیزوں پر منحصر ہے:

آرزوئے حُسنِ حیات و انقلاب، ایمان بالقرآن اور حُسنِ عمل۔

ایک طرف ہماری خوش قسمتی کی انتہا یہ ہے کہ ہم ربّ ذوالجلال والاکرام کے آخری زندہ و محفوظ کلامِ طیّب قرآنِ حکیم کے وارث ہیں جو بے نظیر ولازوال نعمتِ عظمیٰ و حسنیٰ ہے؛ یعنی علم و حکمت، رُشد و ہدایت اور تزکیہ و شفا کا زندۂ جاوید معجزہ ہے! لیکن دوسری طرف ہماری شقاوت و محرومی کی انتہا یہ ہے کہ ہم تارکِ قرآن ہونے کے باعث کفرانِ نعمت ایسے گناہِ کبیرہ کا صدیوں سے ارتکاب کیے جا رہے ہیں اور اس نتیجے میں ایک تو ہم بے علم و ہنر و پسماندہ، کمزور و ناتواں، اور اغیار کے محکوم و مقلد اور محتاج و دست نگر ہیں، دوسرے ہمارا معاشرہ سرطان زدہ، فتنہ و فساد کا مظہر اور ظلم و جرم، فحشا و منکر، شرک و اکابر پرستی اور

خوف و حزن کی جولانگاہ اور شرّ المآب ہے۔ غور کریں اور سمجھیں تو ہم ہی وہ ظالم و جاہل اور نام نہاد اہل ایمان ہیں، جنھیں ربّ عزیز و قدیر مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ.... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا (النساء ۴: ۱۳۶)،

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (سچ مچ) ایمان لاؤ۔ اللہ اور اس کے رسول (حضرت محمدؐ) اور کتاب (قرآن مجید) پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے، نیز اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے (اپنے پیغمبروں پر) نازل کی تھی۔ اور (دیکھو) جس کسی نے اللہ سے انکار کیا اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان نہ رکھا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستے سے بہت دور جا پڑا۔

اصل یہ ہے کہ ایمان بالقرآن کو جزوِ زندگی بنائے اور اس کے مطابق زندگی کیے بغیر ہم مؤمن و مسلمان ہو ہی نہیں سکتے! نیز جس معاشرے کی اساس قرآنِ مجید نہ ہو وہ کسی عنوان اسلامی ہو ہی نہیں سکتا۔ چونکہ بے قرآن معاشرہ بے بنیاد ہوتا ہے، لہٰذا اساسِ قرآنی فراہم کیے بغیر اسے اسلامی بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا معاشرہ قارونی، فرعونی ہوتا ہے، لہٰذا پہلے اس کا استیصال ناگزیر ہوتا ہے — اور پھر قرآن مجید کی اساس پر اس کی تعمیرِ نو اُسوۂ حسنہ کے مطابق کرنا ہوتی ہے۔

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ہم تارکِ قرآن ہیں تو پھر ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ ہمارا ایمان عمل بالقرآن کے بغیر بے جان و مردہ ہے اور ہم محض نام کے مسلمان ہیں اور ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں، فرعونی۔ قارونی ہے اور ہم پر خون آشام معاشرتی سرطان مسلّط ہیں، جنھوں نے ہمیں حسنِ زندگی سے محروم کر کے خوف و حزن کے شرّ المآب میں مقید کر رکھا ہے! نیز ہم ہی وہ حرماں نصیب قوم ہیں، جس کی زبوں حالی کو دیکھ کر رحمۃ للعالمینؐ کس درد و سوز سے اپنے الٰہ و ربّ سے فریاد کریں گے:

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (الفرقان ۲۵: ۳۰)؛

اے میرے رب! یہ میری قوم ہے جس نے قرآن کو متروک کر رکھا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ جب تک ہم اسلام میں پورے طور سے داخل نہیں ہوں گے" اور قرآنِ حکیم کو اپنی زندگی میں جذب کر کے اس کے مطابق زندگی نہیں کریں گے، ہمارے مسلمان ہونے اور نظامِ اسلام

قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ تعمیرِ نو کے لیے پہلے عمارتِ کہنہ کی بیخ کنی ناگزیر ہوتی ہے، لہٰذا ہمیں پہلے ہر حال میں قارونی و آزری اور فرعونی و ہامانی سرطانوں اور اُن کے نظاموں کا استیصال کرنا ہوگا اور پھر قرآن و سُنّہ کے مطابق حسین و مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو کرنا ہوگی۔ یہ یاد رہے کہ سرطانوں نے وجودِ معاشرہ کو اس طرح مجروح و زہر آلود کر دیا ہے کہ اگر فوری طور سے علاج بالجراحی نہ کیا گیا تو اس کی ہلاکت یقینی ہے، لہٰذا پیشتر اس کے کہ یہ سرطان قوم کا کام تمام کر دیں، ان کا کام تمام کر دینا ناگزیر ہے اور اس کا اب ایک ہی طریقہ ہے وہ ہے:

حُسنِ انقلاب بِالقُرآن و سُنّہ

حواشی

۱۔ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ: ربِ ذوالجلال والاکرام نے انسان کے قلب کو حسین بنایا اور اُسے حسن و زندگی کی آرزو ودیعت کر دی؛ اس کے نتیجے میں اُسے موت تک یہ آرزو رہتی ہے، چاہے وہ مشرک و کافر، مجرم و گناہ گار، ظالم و جاہل یا معاشرتی سرطان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ آرزوئے حسن و حیات خواہشاتِ قبیحہ کے بارِ گراں تلے دب کر مضمحل و بے جان بھی ہو جاتی ہے لیکن اس میں پھر سے زندہ ہو جانے کا ہر آن امکان رہتا ہے۔ قلب کی مثال صدف کی سی ہے، جو گوہر دار بننے کی آرزو میں ابرِ نیساں کے قطرۂ باراں کی منتظر رہتی ہے اور اس میں قطرۂ باراں گرے تو اسے جذب کر کے گوہر دار بن جاتی ہے۔ چنانچہ بعض اوقات قلب میں بھی اضطراری طور سے از سرِ نو حسین و زندہ بننے کی آرزو زندہ و فعّال ہو جاتی ہے اور اُسے اس حسین و جان آفرین لمحے کی طلب و جستجو ہوتی ہے، جو اس کی آرزو پوری کر دے۔ ایسا لمحہ سمعی یا بصری جمالیاتی مشاہدے سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس کے قلب کی کایا پلٹ کر دیتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن و حیات کو زندہ و حرکی بنا دیتا ہے۔ اسے ہم جمالیاتی موضوعی انقلاب سے تعبیر کر سکتے ہیں؛ اور اس حسن آفرین اور جانفزا لمحے کے لیے ہم نے جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے تعبیر اختیار کی ہے۔ فرد کی طرح قوم کی زندگی میں بھی ایسے جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحات کے وقوع پذیر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام نے "تبلیغ" کی اہمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے اور تاریخی عمل کے سلبی و مضر اور نقصان دہ نتائج و عواقب سے محفوظ

رہنے کے لیے ایمان واعمالِ صالحہ کے ساتھ حق وصبر اور معروف یعنی جمالیاتی۔ اخلاقی اقدار کی تبلیغ باہمی کو ناگزیر قرار دیا ہے (دیکھیے سورۃ العصر ۳۔۱۰ اور الحج ۲۲: ۴۱ و بمواضع کثیرہ) اس موضوع پر مزید بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب "آرزوئے حسن" فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۲۔ ظلم وفساد: یہ دونوں قرآنِ مجید کی ازبس اہم وفکر انگیز اور وسیع المعانی اصطلاحات ہیں۔ ان کا اطلاق کُلّ زندگی پر ہوتا ہے۔ ظلم کی اصطلاح میں ناانصافی، اندھیرا، قبیح وناموزونی، جبر واکراہ، جور وجفا، حق تلفی و بددیانتی، خیانت ومنافقت، کذب وکتمانِ حق، جرم وگناہ، استحصال وراہزنی، کفر وشرک وغیرہ وغیرہ کے معانی پائے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ظلم کے ہیولے میں فساد کی صورت مضمر ہوتی ہے، لہٰذا اس کے نتائج وعواقب فساد کی صورت میں نکلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ظلم سے زندگی کا توازن بگڑتا ہے اور اس کے نظام میں برہمی وخرابی پیدا ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید اور تاریخ دونوں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ظلم وفساد ہمیشہ معاشرتی سرطان کیا کرتے ہیں، جو رہزنِ حسن وحیات اور غارت گرِ امن وسلامتی ہوتے ہیں۔ ظلم وفساد کی نمودِ قبیح دلیلِ انقلاب ہوتی ہے۔

انقلاب بالحق ہو اور اس میں رحمتِ حسنہ مضمر ہو تو اس کے لیے ہم نے حسنِ انقلاب کی تعبیر اختیار کی ہے۔ بخلاف اس کے اگر اس میں ظلم وفساد یا "سرطانیت" پنہاں ہو تو یہ ہلاکت آفرین ہوتا ہے اور اسے "سرطانی انقلاب" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی رُو سے جب ملک میں معاشرتی سرطانوں کی سطوت وسیادت اور حکومت وقہرمانی کے سبب ظلم وفساد اپنی نمود دکھائیں تو لوگوں کو حسنِ انقلاب لانے کے لیے معاشرتی سرطانوں کے خلاف جہاد کرنا فرض یا ناگزیر ہو جاتا ہے؛ ورنہ بصورتِ دیگر، انھیں ذلت ومسکنت اور ہلاکت وبربادی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اربابِ عقلِ سلیم اور خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو سرطان زدگی، ذلّت ومسکنت اور ہلاکت وبربادی پر جہاد وشہادت کو ترجیح دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ جہاد وشہادت سے ڈرتے یا ان کی اہمیت وسعادت سے غافل رہتے ہیں اور ان پر سرطان زدگی کو ترجیح دیتے ہیں' وہ ظالم وجاہل، محروم ونامراد اور اہلِ نار ہوتے ہیں۔

۳۔ محجوب: (Shy) یہ معاشیات کی اصلاح ہے۔ دولت کو محجوب بنانے کا مطلب اُسے جمع کرنا اور اُسے چھپا کر رکھنا ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت کی گردش میں رکاوٹ پیدا ہوتی اور اس کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ بخل ہے جو جرم کا گناہ ہے

۴۔ ناکارہ: (Idle)۔ یہ بھی معاشی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دولت کو جمع و محجوب کر کے جامد و بے فائدہ بنانا۔ یہ کفرانِ نعمت بھی ہے اور لوگوں کو اس کے فوائد سے محروم کرنا بھی ہے؛ نیز قومی دولت کی گردش کی رفتار کو سُست اور اس کے دائرے کو تنگ کرنا ہے۔ اس سے عوام خصوصاً محنت کشوں کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے، لہٰذا دولت کو ناکارہ بنانا بھی جرم و گناہِ کبیرہ ہے۔

۵۔ اِکتناز: ضرورت سے زائد مال و دولت کو جمع کرنا۔ کنز کے معنی ہیں خزانہ۔ اسلام نے اکتناز کی ممانت کی ہے، اس لیے کہ یہ "بخل" (اصطلاحِ قرآن میں) بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان "انفاق بالعفو" (یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو فی السبیل اللہ خرچ کرنے کے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی بھی۔)

۶۔ احتکار: اس کے معنی ہیں اشیائے صرف کا گراں فروشی کی غرض سے ذخیرہ کرنا۔ دوسرے لفظوں میں چور بازاری (Black marketing) کے لیے ذخیرہ اندوزی کرنا۔ اسلام میں اکتناز کی طرح احتکار کی بھی سخت ممانعت اور وعید آئی ہے، اس لیے کہ یہ ناجائز نفع خوری اللہ تعالیٰ کے بندوں کا استحصال اور ان پر ظلم کرنا ہے۔

۷۔ بُخل: قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے، صدقات و خیرات، جود و سخا اور احسان و قربانی، نیز "انفاق بالعفو" کے احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرنا۔ بخل انسان کو دولت پرست و حریص اور تکاثر پسند و ہوس پرست بنا دیتا ہے؛ اور مکارمِ اخلاق کو گھُن کی طرح کھا جاتا ہے۔ دولت جمع کرنا، اسے گن گن کر رکھنا اور دیکھ دیکھ کر ہوس پوری کرنا اور لوگوں سے اسے پوشیدہ رکھنا، نیز اسے محجوب و ناکارہ بنانا، بخیل کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ بُخل نفس کا سرطان ہے اور یہ اس کا مہلک مرض ہے؛ نیز یہ انسان کو قسی القلب، ظالم اور اہلِ نار بنا دیتا ہے، اس لیے قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبہ میں اس کی سخت وعید آئی ہے۔

۸۔ مضاربت: فقہ اسلامی میں اس معاشیاتی اصطلاح کا مطلب ہے: کسی شخص کو کاروبار یا صنعت کاری کے لیے روپیہ فراہم کرنا اور Sleeping partner کی حیثیت سے طے شدہ شرحِ حساب سے نفع لینا، لیکن نقصان میں شریک نہ ہونا۔ مضاربت صریحاً سود کاری اور سرمایہ کا معاوضہ یا نفع صاف سود ہے، اس لیے شرعاً حرام ہے؛ لیکن حرمتِ مضاربت اسلام کا نظامِ کفالتِ قومی چاہتی ہے۔

۹۔ مضارعت کا مطلب ہے کسی زمیندار کا مضارع یا مضارعین کو قطعہ اراضی بٹائی، ٹپے یا ٹھیکے پر دینا؛ اور

اس کے عوض ان سے فصل کا نصف یا مقررشدہ حصّہ بطور نفع وصول کرنا۔ یہ نفع حقیقت میں سود ہے، جسے آزروں نے بے قرآن مسلم ملوکیت میں معاشرتی سرطانوں کی خوشنودی و سرپرستی اور مفادات و مراعات حاصل کرنے کی خاطر تسمیۂ و تاویل بالباطل کے ذریعے جائز قرار دے دیا، اور عامۃ النّاس نے ان کی مذہبی سیادت و اجارہ داری اور اثر و نفوذ اور اپنی عقیدت مندی و اکابر پرستی اور مرعوبیت کے سبب یہ باطل فتویٰ قبول کر لیا۔ علاوہ بریں، معاشرتی سرطانوں کی سحرکاری سے سود کو نفع اور ظلم و استحصال کو عدل و احسان سمجھ لیا؛ نیز محنت و عرق ریزی سے اناج پیدا کرنے والے مزارعین اپنے زمینداروں کو اُلٹا اپنا ان داتا، مخدوم و مطاع اور مالک و حاکم سمجھنے لگے اور زمیندار و جاگیردار خان، سردار، مخدوم اور وڈیرے کے القاب سے ملقب ہو کر ان پر "فرعونی" کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ مضارعت جو سودکاری کی ایک شکل ہے، اسلام میں حرام ہے۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے منصفانہ و حکیمانہ حکم سے حضرت بلالؓ کی ان کی فالتو اراضی کو بحقِ سرکار ضبط کر لینا، مضاربت کی حرمت پر برہانِ قاطع ہے۔

۱۰۔ تشہیر بالباطل: (False propaganda) جھوٹا پراپیگنڈا جو کذب و باطل کی حمایت و فروغ کے لیے کیا جائے۔

۱۱۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (محمدؐ ۴۷:۱۹، بمواضع کثیرہ)۔ اس کلمۂ توحید کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اصل دین و ایمان ہے اور اس کے اقرار باللّسان اور تصدیق بالقلب کے بغیر کوئی شخص مسلمان اور اسے جزوِ زندگی بنائے بغیر سچا مومن و موحّد نہیں بن سکتا۔ "لَا" جملہ جھوٹے خداؤں، حاکموں، معبودوں، نیز معاشرتی سرطانوں اور ان کے دعوائے اُلوہیّت و ربوبیّت کی نفی کی علامت ہے؛ اور "اِلَّا" اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت و ربوبیّت کے اثبات کی علامت ہے۔ لَا اور اِلَّا دونوں کلموں کی معنویت کو قولاً و فعلاً تسلیم کرنا ہی اصل ایمان و مسلمانی ہے۔ چنانچہ جس معاشرے میں "لَا" اور "اِلَّا" پر ایمان رکھنے والوں کی کثرت ہو گی وہ اسلامی ہو گا؛ یعنی وہ معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف، حسین و مطہر، اور عدل و احسان، اخوت و مساوات، آزادی و خوشحالی اور امن و سلامتی کی جنت ہو گا۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو "لَا" قبح و باطل کی تخریب و بطلان اور "اِلَّا" حسن و حق کی تصدیق و تائید چاہتا ہے۔ اگر اخلاقی و معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو "لَا" شرّ و سیئۃ، سود و استحصال اور ظلم و فساد کی نفی کی اور "اِلَّا" خیر و حسنہ اور عدل و احسان کے اثبات کی علامت ہے۔ متن میں اس سے مفصّل بحث کی گئی ہے۔

۱۲۔ اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہِ (الانعام ۶: ۵۷ و یوسف ۱۲: ۴۰، ۶۷)۔ یہ کلمۂ توحید اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کے اثبات و اقرار اور غیر اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کی نفی کی تکذیب کا نعرۂ حق ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ دُنیا بھر کے متکبر و سرکش اور ظالم و خون آشام معاشرتی سرطانوں کی حاکمیتِ اعلیٰ اور ان کے غیر قرآنی احکام کے انکار و بطلان کا اعلان ہے۔ اس کلمے کی رُو سے کوئی حکمران یا معاشرتی سرطان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا دوسرا کوئی حکم نہیں چلا سکتا، چاہے وہ عسکری و آمرانہ قانون ہو یا حکومت کا منظور شدہ۔ یہ کلمۂ توحید اسلام کا زبردست انقلابی نعرہ ہے، جو جملہ معاشرتی سرطانوں کے لیے مستقل چیلنج اور پیامِ مرگ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر زمان و مکان میں جب بھی بعثتِ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسل علیہم السلام نے یہ انقلاب انگیز نعرہ لگایا تاکہ لوگوں میں حسنِ انقلاب و حیات کی آرزو کو زندہ و فعال کریں اور انھیں "سرطانیت" سے بچائیں اور اس سے ان کے تحفظِ مدام کا اہتمام کریں تو معاشرتی سرطانوں نے اپنے نخچیروں کو ساتھ ملا کر ان کی اور اس نعرۂ توحید کی حتی الوسع مخالفت کی اور انھیں شہید و ملک بدر کرنے پر تیار ہو گئے۔

۱۳۔ معاشرتی نفسی سرطان: اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ معاشرتی سرطانوں سے مراد فرعون و ہامان اور قارون و آزر ہیں، لیکن جہاں تک نفسی سرطانوں کا تعلق ہے، ان سے مراد خوف و حزن ہیں، جو قلب و نفس کو آگ لگا کر آدمی کو کربِ مسلسل اور سکراتِ موت کے عذابِ مقیم میں مبتلا کر دیتے اور اہلِ نار بنا دیتے ہیں۔

۱۴۔ قرآنِ حکیم کا فلسفۂ آرزو: اس کے لیے دیکھیے الانفال ۸: ۵۳؛ الرّعد ۱۳: ۱۱۔

۱۵۔ ذلّت و مسکنت: قرآنِ مجید ان الفاظ کو عموماً اصطلاحاً استعمال کرتا ہے اور ان سے محکومی و غلامی کا مفہوم لیتا ہے، جن کے ہیولوں میں بے قدری و رسوائی، بے عزتی و خفت، حقارت و بے وقری اور دست نگری و محتاجی کی صورتیں مضمر ہوتی ہیں۔

۱۶۔ آپؐ کی مکی و مدنی زندگی: اس کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخرؐ، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۲ء، طبع ثانی ۱۹۸۴ء۔

۱۷۔ دیکھیے سورۃ البقرہ ۲: ۲۰۸۔

باب (۱)

انقلاب کیوں؟

انقلاب کیوں؟ اس لیے کہ انقلاب کے بغیر نہ تو حیاتِ انسانی کا جمود و تعطل توڑا جا سکتا ہے اور نہ اس میں قوت و توانائی ہی پیدا کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کا نشو و ارتقا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ انقلاب ہر ذی روح شے کی آرزو ہے، کیونکہ وہ اپنے نشو و ارتقاء کی آرزو رکھتی ہے جس کو انقلاب ہی پورا کر سکتا ہے۔ اہلِ نظر کے لیے اس سوال کا جواب خود حیاتِ انسانی ہے جو روزِ آفرینش سے آج تک رہینِ انقلاب ہے، وجہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہے۔ (الرحمٰن ۵۵ : ۲۹)۔ علاوہ بریں قدرت کا قانونِ انقلاب ہے کہ جو قوم انقلاب کی آرزو نہیں رکھتی وہ جمود و تعطل کا شکار ہو کر شجرِ زمانہ سے ٹوٹ کر اس طرح آغوشِ فنا میں گر جاتی ہے، جیسے شجرِ خزاں رسیدہ کے خشک پتے ہوا کے جھونکوں سے جھڑ کر برباد ہو جاتے ہیں۔ تغیر ہر چیز کی تقدیر ہے۔ چنانچہ جو باغبان اشجارِ ثمرور کا تزکیہ نہیں کرتا، ان میں برگ و بار لانے کی قابلیت نہیں رہتی۔ اس طرح جو قوم اپنا تزکیہ نہیں کرتی، وہ شجرِ بے برگ و بار کی طرح ناکارہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قدرت کے قانون بقائے انفع و احسن کی رُو سے اس کی کاٹ چھانٹ ضروری ہو جاتی ہے، چاہے یہ جبر و اکراہ سے ہو یا اس کی اپنی مرضی سے۔ جبر و اکراہ سے کانٹ چھانٹ ہو تو اس کے عواقبِ مہلک ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے رضاکارانہ ہو تو اسے تزکیہ کہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف قوم ہلاکت و بربادی سے بچ جاتی ہے، بلکہ اُسے نشو و ارتقاء کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ شجرِ قوم کو آکاس بیلوں، طفیلی کیڑوں اور دیگر بیماریوں سے پاک و صاف کرنے کی خاطر اس کی کانٹ چھانٹ، علاج معالجہ اور تغذیہ افرادِ قوم کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ جو قوم اپنی اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتی یا اسے اپنی اس اہم ترین ذمے داری کا احساس و شعور نہیں رہتا، کرم خوردہ و بوسیدہ درخت کی طرح اس کی بربادی اس کا مقدّر بن جاتی ہے۔ قدرت کا قانونِ آرزو یہ ہے کہ جس چیز میں آرزوئے حسنِ زندگی

نہیں رہتی، وہ حسنِ زندگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس سے ملتا جُلتا قانون بقائے انفع و احسن ہے۔ اس کا مطلب ہے جو چیز مفید و حسین نہیں رہتی اور دُنیا کو اس کی ضرورت نہیں رہتی تو قدرت اُسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔

قدرت کی ہر چیز تخلیق بالحق ہے، لہٰذا وہ حسین بھی ہے اور مفید بھی۔ چنانچہ جب کوئی چیز اپنی جمالیاتی و افادی قدروں سے محروم ہو جاتی ہے اور اس میں حسین و مفید بننے کی آرزو بھی نہیں رہتی تو قدرت ایسی بے فائدہ و بے مصرف اور قبیح چیز کو مٹا دیتی ہے۔ قدرت کی ہر شے نعمت ہے اور جب وہ شے لوگوں کے لیے نعمت نہیں رہتی تو خود بھی نہیں رہتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے، جسے قدرت کے قانونِ بقائے انفع و احسن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ہماری قومی و ملّی زندگی سرطان زدہ مریض ہے اور وہ نہ صرف بے مصرف و بیکار اور حیاتِ انسانی پر بارِ گراں ہے، بلکہ اس میں آرزوئے حسنِ زندگی بھی مردہ ہو چکی ہے، لہٰذا اس سے پیشتر کہ قدرت کا قانونِ آرزو اور بقائے انفع و احسن کا قانون حرکت میں آ کر ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے، ہمیں معاشرتی۔ نفسی سرطانوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اپنی قوم و ملّت کا تزکیہ کرنا ناگزیر ہے اور تزکیہ نفسیاتی۔ معاشرتی حسنِ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔

انقلاب کیوں؟ اس کا جواب معلوم کرنے کی خاطر اب ہم تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قومِ نوحؑ کی کُلّی غرقِ آبی اور قومِ فرعون کی جزوی غرقِ آبی قدرت کے قانونِ آرزو اور بقائے انفع و احسن کے قانون کے تحت ہوئی تھی۔ ان دونوں اقوام میں آرزوئے حُسنِ زندگی مُردہ ہو چکی تھی۔ اس کے نتیجے میں ان کے مُردہ قلوب میں نہ صرف آرزوئے حسنِ انقلاب نہ تھی، بلکہ وہ حُسنِ انقلاب کے تصوّر تک بھی تاب نہ لا سکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام ایسے جلیل القدر پیغمبرانِ خدا ان اقوام کی آرزوئے حسن و انقلاب کا احیاء نہ کر سکے جو معاشرتی انقلاب کی پیش شرط ہے تو قدرت نے ان اقوام کی آرزوئے مرگ و نار کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان میں آرزوئے حُسنِ زندگی نہ رہے تو وہ رفتہ رفتہ سمندر سرشت، یعنی خوگرِ تیرہ و نار بن جاتا ہے۔ قدرت کا قانونِ آرزو یہ ہے کہ وہ انسان (فرد ہو یا قوم) کی آرزو کو اس کے

ظرف و وسعت کے مطابق پورا کرتی ہے۔ چنانچہ قومِ نوحؑ نے جو سمندر سرشت بن چکی تھی، اس کی آرزوئے نار و مرگ کو پورا کرنے کے لیے طوفانِ باراں کے ذریعے اسے غرقِ آب کر دیا۔ قومِ نوحؑ میں معاشرتی سرطانوں کی کثرت تھی اور ساری قوم سرطان زدہ تھی، لہٰذا اسے غرقِ آب کرنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا وجود سمندری آبی جانوروں کی غذا بن کر اس طرح فنا ہو جائے کہ اس کے آثار بھی باقی نہ رہیں۔

قومِ نوحؑ اور قومِ فرعون کی ہلاکت ہمیں قدرت کے قانونِ آرزو اور قانونِ بقائے انفع و احسن سے متنبہ کرتی ہے کہ اگر ہم نے اپنی آرزوئے مرگ و نار کو آرزوئے حسنِ انقلاب سے نہ بدلا تو قدرت اپنے قانونِ آرزو کے تحت ہماری بقا کو فنا میں بدل دے گی۔

حسنِ انقلاب کی احسن و اکمل مثال ہمیں رحمتہ للعالمینؐ کے انقلاب میں ملتی ہے۔ یہ حسین انقلاب ایک تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں آیا، اس لیے ہمہ گیر و کلّی تھا؛ دوسرے یہ لوگوں کے لیے ایمان و تقویٰ، عدل و احسان، خیر و حسنہ، آزادی و عزت، اخوت و مساوات، امن و سلامتی، خوشحالی و ترقی اور جمالیاتی ثروت و ارتقائے نورِ ذات ایسی نعمتیں لے کر آیا، اس لیے باعثِ رحمتہ للعالمینی تھا۔ اس سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ حسنِ انقلاب کیوں؟ بہر حال، حسنِ انقلاب میں رحمتہ للعالمینی مضمر ہوتی ہے، جو اس کی غیر معمولی اہمیت پر دلالت کرتی ہے؛ نیز وہ دین کی غایتِ حقیقی ہے جس کے لیے ربِّ رحمٰن نے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتہ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا تھا اور اس میں بنی نوعِ انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ یا زندگی کرنے کا حسین نمونہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انقلاب دو قسم کا ہوتا ہے: موضوعی اور معروضی۔ موضوعی انقلاب سے مراد انسان کا حسّی، قلبی، نفسی انقلاب ہے، اور معروضی انقلاب کا مطلب معاشرتی انقلاب ہے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی انقلاب کی دو قسمیں ہیں: حسین اور قبیح۔ اب ان نکات کی صراحت کر دی جاتی ہے!

۱۔ موضوعی انقلاب: اس کا مطلب نفسیاتی انقلاب ہے، لیکن اس کے مفہوم کی صراحت ضروری ہے۔ ربِّ کریم نے انسان کو بے شمار ملکات ودیعت کیے ہیں، جن کو قوّت سے فعل میں لا کر وہ ایک طرف اپنے نورِ حسن سے

ذات کا نشوو ارتقاء اور دوسری طرف کائنات کی تسخیر کر کے ان گنت نعمتوں سے تمتع کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں[۱]
اللہ تعالیٰ نے انسان میں آرزوئے حسن ودیعت کی ہے، جس کی بدولت اس میں خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو
رہتی ہے اور یہ دراصل انسان میں اپنے اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کی آرزو ہے۔ جمالیاتی زبان
میں ہم اپنے اِلٰہ کو معروضِ حسن و محبت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آرزوئے اِلٰہ زندہ و حرکی ہو تو
بشر کو انسان اور انسان کو صالح، شہید اور صدیق بناتی ہے۔ ایسا انسان ہی اللہ تعالیٰ کا بندہ و دوست، نفسِ
مطمئنہ اور وارثِ جنت ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے طمانیتِ نفس جنت میں جانے کی پیش شرط اور اہلِ جنت
کا موضوعی معیار ہے۔[۲] آرزوئے "دوست" ہو تو اس کا ذکر وجہِ طمانیتِ قلب ہوتا ہے اور انسان میں اس کی
اور اس کی حسین مخلوقات کی محبت کے چشمے پھوٹتے اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی مزرع کو سیراب
کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، آرزوئے "دوست" ہی سے انسان میں آرزوئے حسن و زندگی زندہ فعّال ہوتی ہے،
جو اُسے اپنے اور دوسروں کے لیے رحمت بناتی ہے۔ "دوسروں" سے مراد اللہ تعالیٰ کی جملہ ارضی و سماوی
مخلوقات ہیں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دین کی غایت اور سُنّتِ پیغمبریؐ رحمۃ للعالمینی ہے۔
دوسرے لفظوں میں دین انسان کو جملہ عالموں کے لیے رحمت بنانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان نہ صرف
عالمِ انسانی بلکہ حیوانی نباتاتی، جماداتی، سماوی، سب عالموں کے لیے رحمت بن جائے۔

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے عظیم ترین انسان ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آپؐ
صاحبِ خُلقِ عظیم اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ آپؐ کی عظمت کا راز رحمۃ للعالمینی ہے، جو
آپؐ کی سنت اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ اس سے یہ ضمنی نتیجہ نکلا کہ انسان کی رحمت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، وہ
اتنا ہی عظیم ہوگا اور عظمتِ انسانی کا معیار رحمۃ للعالمینی ہے۔

چونکہ رحمۃ للعالمینی ہی دین کی غایت اور اس کا اصل الاصول ہے، لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے اس
ازبس اہم اساسی مصطلحۂ قرآنی کے معنی و مفہوم کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ رحمت کی اصطلاح میں ہمدردی و
غمگساری، عدل و احسان، حسنہ و خیر، مودّت و محبت، ایثار و قربانی اور امن و طمانیت کے معانی پائے جاتے ہیں۔
رحمۃ للعالمینی چونکہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ حسنہ ہے، لہٰذا وہی مسلمان اور ان کے لیے ایثار و قربانی کرنا
اس کا شعارِ زندگی ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص عادل و محسن تو ہوتا ہے لیکن قرآنِ مجید کی تلمیحی زبان میں فرعون و ہامان اور قارون[۳]

آرزو نہیں ہو سکتا، رحمت انسان میں آرزوئے "دوست" اور حسن و زندگی کی طلب و جستجو کی بھی غمازی کرتی ہے۔ اس نکتے کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اپنے نفس کے لیے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایمان و حسن عمل کے ذریعے اپنے آپ کو نفسِ مطمئنہ یا صاحبِ حسن و سرور بنائے؛ اور کفر و شرک، ظلم و استحصال، فحشاء و منکر اور جرم و گناہ کی آتش خوف و حزن کے عذاب سے بچائے اور اسے اہلِ نار نہ بننے دے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ارتقائے حیاتِ کُلّی کے لیے رحمت ناگزیر ہے، اور ارتقائے حیاتِ کُلّی سے مراد بحیثیت فرد و نوع، انسان کے نورِ ذات کا ارتقاء ہے۔ یہ ارتقاء اللہ تعالیٰ کے قرب و رضوان کی نسبت سے بھی ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات کے حوالے سے بھی۔ بہر حال، فرد کے حسنِ انقلاب کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حسّی، قلبی، نفسی نظام میں ایسی مثبت تبدیلی آجائے کہ وہ صالح و درست کار اور حسین و منیر ہو جائے اور اس کے عقائد و نظریات، افکار و تخیلات اور جذبات و احساسات میں توازن و ہم آہنگی، حیات و ثبات اور جمال و جلال پیدا ہو جائیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں "دوست" اور حسن و زندگی کی آرزو زندہ و حرکی ہو جائے اور اس کے نتیجے میں اس کا نورِ ذات نشو و ارتقاء کرنے لگے۔

ب۔ معروضی انقلاب سے مراد معاشرتی انقلاب ہے، یعنی معاشرے کے نظام میں نمایاں و مؤثر تغیر و تبدل۔ چنانچہ معروضی حسنِ انقلاب کا مطلب معاشرے میں ایسی مثبت و تعمیری اور حسین و رحمت بداماں تبدیلی ہے، جس سے اس میں فتنہ و فساد اور ظلم و طغیان کی خوف انگیز و حُزن آفرین تاریکیاں چھٹ جائیں اور وہ صلح و آشتی، آزادی و مساوات، عدل و احسان، حسنہ و خیر، محبت و رحمت اور امن و سلامتی کے انوار سے منوّر ہو جائے۔

تلمیحاتِ قرآنی کی مدد سے ہم معروضی حسنِ انقلاب کی تعریف اس طرح بھی کر سکتے ہیں:

"ہیئتِ اجتماعیہ کے مثبت و تخلیقی اور حسین و رحمت بداماں تبدّلِ کُلّی کی خاطر اس کا اس حکیمانہ انداز میں تزکیہ کرنا کہ وہ فرعونی و ہامانی اور آزری و قارونی سرطانوں سے پاک و صاف اور اس کی نشاۃ الثانیہ اور ارتقائے کُلّی کا آغاز ہو جائے؛ نیز اس کے فکر و عمل کی جہت صالحہ ہو جائے۔" الغرض، حسنِ انقلاب کا مطلب انفرادی و اجتماعی زندگی کو معاشرتی سرطانوں سے آزاد کرانا اور اسے حسین و حرکی اور ارتقائی بنانا ہے۔

یہ یاد رہے کہ معاشرہ حسین ہو تو اس میں اہلِ حسن و سرور کی اکثریت ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے قبیح

معاشرے میں سیاہ کار و اہلِ نار کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمالیاتی نقطہ نظر سے انقلاب دو قسم کا ہے: حسین اور قبیح۔ حسین انقلاب اُسے کہیں گے جس میں معاشرہ زندہ و حسین ہو کر مادّی۔ روحانی ترقی کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ اس جگہ اس از بس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ معاشرے میں حسن و زندگی فقط توحید ہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور اس کی احسن و اکمل مثال اسلام کے حسنِ انقلاب میں ملتی ہے۔ بخلاف اس کے قبیح انقلاب سے معاشرہ فقدانِ توحید کے سبب حُسن و زندگی سے محروم ہو جاتا ہے، اور اس کی ایک زندہ مثال اشتراکی انقلاب ہے۔ اشتراکی انقلاب نے معاشرتی سرطانوں کا اِستیصال تو کر دیا، لیکن فقدانِ توحید کے سبب ہیئتِ اجتماعیہ کا تزکیہ نہ کر سکا، جس کے نتیجے میں وہ حسن و نور اور حیات و طمانیت سے محروم ہے۔

یہاں اس غیر معمولی اہمیت کے حامل نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اشتراکی اقوام کی مادّی قوّت و ترقی کا راز ان کے ایمان بالباطل[۲] میں مضمر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اشتراکی عقائد کو انتہائی جوش و خروش اور قوّت و زور سے اپنی حیاتِ کُلّی میں جذب کر لیا ہے؛ نیز کچھ اس ایمان بالباطل کی قوّت و توانائی کے بل بوتے پر اور کچھ اپنی حریف قوموں کی قیامت بداماں قوّت و توانائی کے خوف سے وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنے جملہ وسائل کے ساتھ انتہائی سرگرمی سے ترقی کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہ درست ہے کہ اشتراکی معاشروں میں بظاہر امن ہے، لیکن نفسِ اجتماعی اپنے الٰہ و ربّ کو بھلا کر طمانیت کو ترستا ہے، اور وہ حسن و سرور اور لذّتِ زندگی سے ناآشنا ہے۔

جہاں تک غیر اشتراکی اقوام کا تعلق ہے، وہ عدل و احسان سے محروم سرمایہ دارانہ زندگی کے سبب سرطان زدہ اور حیات و ممات کی کشمکش میں مبتلا ہیں، وہ بھی نورِ حسن[۳] لذّتِ زندگی[۴] اور طمانیتِ نفس[۵] کو ترستی ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے ہیولے ہی میں فساد کی صورت میں مضمر ہوتی ہے جس میں معاشرتی سرطان پیدا ہوتے ہیں، جیسے گندی، تاریک اور متعفّن زمین میں ہلاکت آفرین جراثیم، زہریلے حشرات الارض اور مہلک امراض ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اقوامِ عالم بالعموم اور مسلم اقوام بالخصوص اس وقت سرطان زدہ ہیں اور معاشرتی سرطانوں نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ خوف و حزن کی آگ میں جل رہی ہیں اور اُن کے کرب و اضطراب

کا یہ عالم ہے کہ وہ لذتِ حیات سے آشنا ہیں نہ لذتِ موت سے۔ چنانچہ اقوامِ عالم کو ان خون آشام معاشرتی سرطانوں کے چنگل سے چھڑانے، آتشکدۂ خوف و حزن سے نکالنے اور ان کے کرب و اضطراب کو دور کرنے کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہے، ورنہ بصورتِ دیگر، حسن و حیات اور سرور و طمانیت سے محروم بنی نوع انسان کی ہلاکت و بربادی شدنی ہے۔

عصرِ حاضر کے انسان کے سامنے صرف دو متبادل راستے ہیں، ایک حسنِ انقلاب کا اور دوسرا ہلاکت و بربادی کا۔ ان میں سے اُسے ایک انتخاب کرنا ہے۔ چونکہ زندگی حسنِ انقلاب میں ہے، لہٰذا ہم اُسے جتنی جلدی لائیں اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے، کیونکہ یہ قرآن و سُنت سے ثابت ہے کہ اسلام کے نظامِ حیات میں آزری و فرعونی اور ہامانی و قارونی سرطانوں کی قطعاً گنجائش نہیں، تو پھر ہمیں یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ ہمارا نظامِ حیات غیر اسلامی ہے اور اسے اسلامی بنانے کے لیے سب سے پہلے معاشرے کو ان چار سرطانوں سے پاک و صاف کرنا ہوگا۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ سرطانوں کے استیصال کے بغیر معاشرے میں آئینِ قرآن کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت ہے جس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ معاشرتی سرطان اولادِ آدم کے دشمن اور غارت گرِ آئینِ قرآن ہیں، لہٰذا معاشرتی سرطان اور آئینِ قرآن ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہوئے۔ چونکہ اجتماعِ ضدین محال ہے، لہٰذا جب تک ہم معاشرتی سرطانوں کی بیخ کنی نہیں کریں گے۔ ہم کسی صورت آئینِ قرآن کو اپنے معاشرے میں نافذ نہیں کر سکیں گے۔ ان سرطانوں کی موجودگی میں معاشرے میں آئینِ قرآن کے نفاذ کی کوشش مخلصانہ ہی کیوں نہ ہو، لایعنی و لاحاصل اور سطحِ آب پر نقش بنانے کے مانند ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں معاشرتی سرطان پیدا ہوئے ہیں، مسلسل ان کا استحصال اور خون آشامی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُمتِ مُسلمہ کمزور و نحیف اور روبہ تنزل ہے۔ چنانچہ اس سے پیشتر کہ اس کی ضعیفی وجہِ مرگِ مفاجات بن جائے، ہمارے لیے اپنے انفس و آفاق میں حسنِ انقلاب لائے بغیر کوئی اور چارۂ کار نہیں۔

کاش کوئی مردِ مجاہد ایسا پیدا ہو جو اسلام کے پیروؤں اور دیگر بنی نوع انسان کی آزادی و سلامتی اور خوشحالی و طمانیت کی خاطر حسنِ انقلاب کے ذریعے ان معاشرتی سرطانوں کا استیصالِ کلی کر دے اور حسنِ انقلاب عالمگیر بن جائے۔

حُسنِ انقلاب اور فلسفۂ آرزو

اگر یہ کہا جائے کہ آرزوئے حسن پیش شرط ہے حسنِ انقلاب کی تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی حقیقت کا اعتراف ہوگا جس پر قرآنِ حکیم شاہد ہے۔ پہلے فلسفۂ آرزو کی مختصر اُصراحت کر دی جاتی ہے۔

ربِّ رحیم و کریم نے انسان کو اِرادہ و اِختیار کی نعمتِ عظمیٰ بطورِ امانت ودیعت کی ہے، اور اُسے اس کا اس قدر پاس ہے کہ وہ کسی قوم سے کوئی نعمت اس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک اسے اس کی سچی آرزو رہتی ہے۔ کوئی قوم اپنی کسی نعمت مثلاً آزادی، خوشحالی، علم و ہنر، عزّت و اعتبار، توحید و تقویٰ، ایمان، یا حسنِ عمل سے اس وقت محروم ہوتی ہے، جب اُسے اس کی سچی آرزو نہیں رہتی۔ علاوہ بریں، جب تک کسی قوم کے نفس میں انقلاب نہ آئے، اس کی آرزو نہ بدلے اور آرزوئے انقلاب پیدا نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کی حالت نہیں بدلتا، یعنی اس کی خارجی یا معاشرتی دُنیا میں انقلاب نہیں آتا۔ آرزوئے حسنِ انقلاب دراصل آرزوئے حُسن و زندگی ہے، لہٰذا انقلاب اس وقت تک لایا نہیں جاسکتا جب تک قوم میں حسن و زندگی کی آرزو زندہ و حرکی نہ ہو۔ اس سے مستنبط ہوا کہ تحریکِ انقلاب کا پہلا مرحلہ آرزوئے حُسن و حیات کے اِحیاء اور نشو و ارتقاء کا ہے۔ یہ مرحلہ بظاہر زیادہ دشوار دکھائی نہیں دیتا، لیکن حقیقت میں ازبس دشوار، صبر آزما اور ہمّت طلب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی فرد یا قوم کے عقائد و نظریات، افکار و خیالات اور جذبات و میلانات میں تبدیلی لانا، چاہے وہ قبیح و باطل ہی کیوں نہ ہوں، ازبس دشوار ہے۔ انسان اپنی ان چیزوں کو متاعِ زندگی سمجھتا اور محبوب رکھتا ہے۔ دوسرے یہ سب چیزیں اس کے اندر نشو و نما پاکر اس کی ذات کے اجزائے لاینفک بن جاتی ہیں، اس لیے ان سے دستبردار ہونا ایسا ہی صبر آزما و شکیب رُبا ہوتا ہے جیسے اپنے کسی عضو یا جارحہ کو بدن سے کاٹ کر علیحدہ کر دینا۔

علاوہ بریں، عقائدِ جلیلہ و متحرکہ انسان کو ورثے میں ملتے ہیں، اس لیے اُسے جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، اور وہ ان کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ جان و مال تو دے سکتا ہے، اور گھر بار بھی چھوڑ سکتا ہے، لیکن اپنا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں چھوڑ سکتا۔ ایران و پاکستان میں افغان مہاجرین کا قیام ہمارے اس مؤقف کا زندہ ثبوت ہے۔ ہم اپنے اس مؤقف پر قرآن مجید اور تاریخ سے بھی استشہاد کر سکتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ معاشرتی سرطانوں کے عہدِ حکومت میں مذہبی پیشوائیت تسمیہ بالباطل[۸] اور تاویل بالباطل[۹] کے ذریعے دین کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو جامد و منفی عقائد و نظریات کو ایک جیسی اہمیت دینے لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض فروعات کو اصل سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے، اور فروعات کو اصول پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کا کوئی گوشہ ہو اس میں ہمیشہ غلط ترجیحات سے فساد پھیلا ہے۔ دین و مذہب میں ترجیحاتِ باطلہ کی ذمے دار آزریت ہوتی ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں! ایک تو وہ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کرنے اور دوسرے دُنیوی مفادات حاصل کرنے کی خاطر ایسا کرتی ہے۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ آزریت نے بعض عقائدِ جلیلہ و متحرکہ کو تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ذریعے اس قدر غیر اہم بنا دیا ہے کہ قوم ان کی وہ قدر نہیں کرتی جس کے وہ حقدار ہیں، اس کے نتیجے میں ان کا رشتہ حیاتِ قومی سے قریب قریب منقطع ہو چکا ہے اور برائے نام رہ گیا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ عقائد کے ساتھ قوم بھی مُردہ ہو گئی ہے۔ یہ موت دراصل قوم کے جمال و جلال، قوت و توانائی اور آرزوئے حسن و حیات کی موت ہے۔ فلسفۂ آرزو یا قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے جب بھی کسی قوم میں آرزوئے حسن و زندگی فعال و حرکی یا زندہ و توانا نہیں رہتی تو اس میں معاشرتی سرطان پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح جسم سرطان زدہ ہو جائے تو اس کا نشو و نما پا نا رُک جا، اس کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے، اسی طرح جس قوم میں معاشرتی سرطان معرضِ وجود میں آ جائیں اس کا حسن و زندگی سے محروم ہو جانا شدنی ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ کسی سرطان زدہ قوم میں جیسی کہ ہماری ہے، سب سے پہلے اس میں اس حقیقت کا شعور بیدار کرنا ہو گا کہ وہ سرطان زدہ ہے، جس کا علاج جرّاحی ہے؛ نیز اگر وہ زندہ رہنی چاہتی ہے تو ان سرطانوں کا استیصال ناگزیر ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہوا کہ سرطان زدہ قوم میں حسن و

زندگی کی آرزو کے ساتھ معاشرتی سرطانوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر ان کے استیصال کی آرزو کو پیدا کرنا بھی ناگزیر ہے۔ ایجابی آرزو کے ساتھ سلبی آرزو مل جائے تو شراب آرزو دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ آرزو زندہ و حرکی ہو جائے تو اس کا مطلب اِتمامِ آرزو ہوتا ہے، کیونکہ یہ قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو ہے۔

یہ نکتہ تحریکِ انقلاب کے علمبرداروں کے ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ معاشرتی سرطانوں میں نفسیاتی انقلاب پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خون آشام ہیں، خون آشامی کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتے، لہٰذا ان کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے اس کا استیصالِ کُلّی، تاکہ ان کی نشاۃ الثانیہ کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔ یہ کام صرف اور صرف مظلوم و جفاکش عوام اور مفلوک الحال و محروم محنت کش ہی کر سکتے ہیں، لہٰذا پہلے اِن میں آرزوئے حسنِ حیات و انقلاب پیدا کر کے انھیں اپنا ہم خیال اور تحریکِ انقلاب کا رضاکار بنانا ہوگا۔ انقلاب پسند مجاہدین کو اس حقیقت کا یقینِ محکم ہونا چاہیے کہ ملک میں اسلام کی حسین و مثالی ریاست قائم کرنے کے لیے نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی اور ثقافتی انقلاب ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "لَا" کے بغیر "اِلَّا" معتبر نہیں ہوتا؛ اور باطل کی نفی و اِستیصال کے بغیر حق کا اِثبات و قیام ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرعونی۔ ہامانی نظامِ حکومت، سرطانی۔ سرمایہ داری معاشی نظام اور آزری۔ سرطانی مذہبی نظام کے استیصال کے بغیر اسلام کا خلافتی۔ شورائی نظامِ حکومت، عدل و احسان، زکوٰۃ و انفاق بالعفو اور کفالتِ قومی پر مبنی بے سود معاشی نظام اور قرآن کا اخلاقی ثقافتی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔

حُسنِ انقلاب کی تحریک کے علمبرداروں کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تعمیرِ نو سے پہلے تخریب ناگزیر ہوتی ہے، اور حسنِ انقلاب کی تحریک تخریبی۔ تعمیری ہوتی ہے، لہٰذا انھیں اس بات کی احتیاط بدرجۂ اتم کرنا ہوگی کہ وہ جوشِ انقلاب میں اشتمالی انقلاب پرستوں کی طرح تیغِ "لَا" سے "اِلَّا" یا دینِ توحید کا قلع قمع نہ کر دیں۔ چنانچہ تاریخ کی اس شہادت کی بنا پر کہ حسین و مثالی نظام کے قیام کی مخالفت و مزاحمت سب سے زیادہ زیرِ نظر چاروں سرطانی طبقے کرتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ خطرناک و طاقت ور دشمنِ انقلاب آزری طبقہ ہوتا ہے، جو دین و مذہب کو اپنی پناہ گاہ بنا لیتا ہے، تحریکِ انقلاب کے علمبرداروں

پر لازم ہے کہ وہ اشتمالی انقلاب پرستوں کی طرح آزری طبقے کے استیصال کی خاطر دین کی پناہ گاہ پر حملہ نہ کریں اور نہ اس سے تعرض ہی کریں، بلکہ اس کے محافظ و نقیب بن کر پوری قوت سے اس کی حفاظت کریں، اس لیے کہ حسین و مثالی معاشرے کی تعمیر فقط دینِ توحید کی اساسِ محکم ہی پر ہو سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ قانونِ بقائے انفع و احسن، قرآن مجید کا یہ فلسفہ بصیرت افروز و فکر انگیز اور فکر و نظر کے اعتبار سے انقلاب آفرین ہے۔ اس کا مأخذ ہے: الرّعد ۱۳: ۱۷۔

۲۔ اہلِ جنّت کا موضوعی معیار، دیکھیے الفجر ۸۹: ۲۷۔

۳۔ ایمان بالباطل، دیکھیے العنکبوت ۲۹: ۵۲، ۶۷۔

۴۔ نورِ حسن، نور اصل میں حسن کا ذاتی۔صفاتی عنصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ارضی و سماوی ہر تخلیق حسین بنائی ہے اور اس میں آب و تاب اس کے اپنے حُسن کی مرہونِ منّت ہے۔ قرآن و مشاہدہ گواہ ہیں کہ اہلِ حسن ہی کا قلب و چہرہ نورانی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے نور کو حسن کا نور کہہ سکتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل آیاتِ قرآنی پر خاص طور سے ایک دوسری کے حوالے سے تدبّر کرنے کے نتیجے میں حسن و نور کے رشتے کی حقیقت منکشف اور ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے: السّجدہ ۳۲: ۷؛ اور النّور ۲۴: ۳۵۔ (حسن و نور کے باہمی تعلّق پر مزید بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتب: (۱) فلسفۂ حسن، مجلس ترقیِ ادب لاہور؛ (۲) اسلامی ثقافت و آرزوئے حسن، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور)۔

۵۔ لذّتِ زندگی، زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک انتہائی عظیم و حسین نعمتِ غیر مترقبہ ہے، لہٰذا یہ حسنِ زندگی ہے جس کی بدولت وہ اس قدر جمیل و جلیل، دل کش و نظر افروز، لذّت انگیز و مسرّت آفرین، کیف پرور و سرور انگیز، عزیز و محبوب اور ناظورہ و قرّۃُ العین ہے، اگر زندگی اپنے حسن سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی ان صفاتِ حسنہ یا لذّتِ حقیقی سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں رہینِ خوف و حزن ہو جاتی ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ لذّتِ زندگی سے وہی اہلِ ایمان محظوظ و مستفیض ہوتے ہیں جو محسن ہوتے ہیں اور ان

کے حسنِ فکر و عمل کے باعث ان کی زندگی حسین ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جن لوگوں کی زندگی حسین نہیں ہوتی، وہ لذتِ زندگی سے ناآشنا و محروم ہوتے ہیں، چاہے وہ فرعون و ہامان ہوں یا قارون و آزر۔

۶۔ طمانیتِ نفس: قرآنِ مجید کے فلسفۂ حیاتِ انسانی کی رُو سے طمانیت مقصود و حاصلِ نفسِ انسانی ہے اور مندرجۂ ذیل حقائقِ خمسہ پر دلالت کرتی ہے:

اوّلاً، نفسِ مطمئنہ محسن و صالح اور اللہ تعالیٰ کا بندۂ تسلیم و رضا ہوتا ہے۔

ثانیاً، اس کی زندگی حسین ہوتی ہے، یعنی وہ صاحبِ حسن و سُرور ہوتا ہے۔

ثالثاً، طمانیت اصل میں حسنہ و رحمتِ الٰہی ہے۔

رابعاً، یہ انسان کی حقیقی کامیابی ہے اور وارثِ جنّت ہے۔

خامساً، طمانیت تو رضوانِ الٰہی ہے، جو جنّت کی سب نعمتوں سے افضل و احسن ہے۔

زندگی حسین ہو تو انسان لذّتِ طمانیت سے آشنا ہوتا ہے۔ ایسے مطمئن شخص کو قرآنِ حکیم نفسِ مطمئنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ طمانیتِ نفس سکینت و قناعت کی ٹھنڈک اور آتشِ خوف و حزن کی اذیت کے فقدان پر دلالت کرتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اولیآء اللہ کی نشانی یہ ہے کہ انھیں خوف ہوتا ہے نہ غم۔ بالفاظِ دیگر، وہ مطمئن ہوتے ہیں۔ انسان کا اپنے نفس کا مشاہدہ کرنا، اس میں غور کرنا اور معلوم کرنا کہ وہ مطمئن ہے یا رہینِ خوف و حزن ہے؟ بالفاظِ دیگر، وہ صاحبِ جنّت ہے یا اہلِ نار؟ معرفتِ نفس ہے۔ اگرچہ معرفتِ نفس کے معانی میں نفس کے دیگر احوال و ظروف کی آگاہی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ عموماً اللہ تعالیٰ کی ہستی کے یقین اور اس کی صفاتِ اُلوہیّت و ربوبیّت کے ادراک کی صورت میں نکلتا ہے۔

الغرض، طمانیتِ نفس ایسا حقیقی و موضوعی اور عالمگیر معیار ہے، جس کے ذریعے ہر انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کامیاب و اہلِ جنّت ہے یا ناکام و اہلِ نار؟ اس کی حقیقت کی آگاہی انسان کو اپنی اصلاح یا تزکیہ کرنے اور اپنی زندگی کو حسین و مطمئن بنانے میں ازبس داہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

۷۔ لذّتِ موت: زندگی احساس و شعور پر اور موت جو اس کی ضد و نقیض ہے، فقدانِ احساس و شعور پر دلالت کرتی ہے۔ قرآنِ مجید نے اہلِ دوزخ کی ایک کیفیت یہ بتائی ہے کہ وہ زندوں میں ہوں گے نہ

مُردوں میں؛ یعنی وہ لذتِ حیات و ممات سے ناآشنا ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زندگی کی لذتوں سے تو ناآشنا ہوں گے، لیکن انھیں اس کی اذیتوں کا احساس و شعور ضرور ہو گا۔ چنانچہ لذتِ موت یہ ہے کہ زندگی کی کیفیاتِ حقیقی و مثبت مثلاً حظ و لذت، طمانیت و مسرت، کیف و سرور، سرخوشی و مستی وغیرہ وغیرہ، اور عارضی و منفی کیفیات، مثلاً خوف و حزن، کرب و درد، تنگیِ زیست و رنج و محن وغیرہ وغیرہ کا احساس و شعور نہ ہو۔

۸۔ تسمیہ بالباطل: قرآنِ حکیم کے فلسفۂ تسمیہ بالباطل سے مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی تصنیف آرزوئے حسن۔ یہاں اس کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے۔ تسمیہ بالباطل مشرک و بُت پرست آزروں کی ایجاد ہے۔ یہ ایسا فن ہے جس کے ذریعے وہ مظاہرِ فطرت، خیالی دیوتاؤں، دیویوں، زندہ و مُردہ اکابر اور دیگر خیالی و مادّی چیزوں کو ایسی صفات سے منسوب اور ایسے ناموں سے موسوم کرتے ہیں جن کی مسمیات ان میں نہیں ہوتیں۔ الغرض۔ اسم بے مسمّٰی رکھنے اور اس سے کسی ہستی کو موسوم کر کے اسے اپنا معبود بنا لینے کے لیے ہم نے تسمیہ بالباطل کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۹۔ تاویل بالباطل: اصل میں تحریفِ معنوی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کلامِ الٰہی کے مفردات و مرکبات، آیات و تعلیمات اور اصول و احکام کی مقاصدِ باطلہ کی خاطر غلط اور جھوٹی تفاسیر و تعبیر کرنا یا غلط مطالب و نتائج اخذ کرنا۔ یہ فن بھی آزروں اور علمائے سوء کی ایجاد ہے۔ اس کے متعلق علّامہ اقبال ربِّ جلیل سے اس طرح شکوہ باندازِ فریاد کرتے ہیں:

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

باب (۲)

احکامِ الٰہی یا آئینِ قرآن

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے اور ہمارا ایمان بھی ہے کہ قرآنِ حکیم نور و فرقان، رشد و ہدایت اور علم و حکمت کا خزینہ، نیز ربِّ علیم و حکیم کے احکام کا محفوظ و مصئون گنجینہ ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے میں انسان کے لیے رہنما اصول ہیں؛ علاوہ بریں وہ متنازع امور پر قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم اقوام خصوصاً پاکستانی قوم نے کیوں اب تک احکامِ قرآن کو آئین و قوانین کی شکل میں مرتب کیا ہے نہ ملک میں نافذ ہی کیا ہے؟ یہ سوال ہمارے لیے نہایت اہم بھی ہے اور چیلنج بھی؛ لیکن یہ ہمارا ظُلم و جہل ہے کہ ہم نے آج تک نہ تو یہ چیلنج قبول کیا ہے اور نہ اس سوال کو حل کرنے کی سنجیدگی سے کوشش ہی کی ہے. تحقیق کی نظروں سے دیکھیں اور حکیمانہ انداز میں غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآنِ مجید سے ہماری دُوری و مہجوری اور ظُلم و جہل کے ذمے دار فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری سرطان ہیں. وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید معاشرتی سرطانوں کے لیے مرگِ مفاجات کا پیام ہے، لہٰذا جس معاشرے میں قرآن ہو وہاں سرطان نہیں ہو سکتے اور جہاں معاشرتی سرطان ہوں وہاں قرآن نہیں ہوتا. اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآن اور سرطان ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں اور اجتماعِ ضدین محال ہے. بہر حال، چونکہ قرآنِ مجید ظالم و خون آشام سرطانوں کے لیے پروانۂ موت ہے، اس لیے وہ کسی قیمت پر اپنے ملک میں احکامِ قرآن نافذ نہیں ہونے دیتے، اگرچہ وہ نظامِ اسلام کا نعرہ بلند کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں. تاریخ شاہد ہے کہ دین کا خرقۂ سالوس پہن کر اس کا محافظ و اجارہ دار بن بیٹھنا، سرطانوں کا شیوہ ہے جو ہر زمان و مکان اور قوم و ملّت میں رہا ہے. اس بنا پر ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جب تک ہمارے یا کسی اور مسلم ملک میں دشمنِ قرآن و انسان سرطان

ہیں، وہاں حسین و مثالی معاشرے کے قیام اور اس میں احکام قرآن کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اگر ہمارے دل میں حُسن و زندگی کی سچّی آرزو ہے اور ہم اسے پورا کرنے کے لیے احکامِ قرآن کے مطابق اسلامی معاشرے کی تاسیس و تعمیر کرنے کی سچی طلب و جستجو رکھتے ہیں تو ہمارے لیے حسنِ انقلاب کے ذریعے ان قرآن و انسان دُشمن سرطانوں کا اِستیصال کرنا ناگزیر ہے۔

اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ ہماری پس ماندگی و درماندگی، حسن و زندگی سے محرومی، ذلّت و مسکنت، ظلم و شرک، خوف و حزن اور مرگِ آرزو کی وجہِ حقیقی قرآن حکیم سے مہجوری و دُوری ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مہجوری و دُوری کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہیں؛ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ان قرآن و انسان دشمن سرطان کے پنجۂ استبداد سے رہائی کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے انقلاب بالقرآن کے ذریعے ان کا اِستیصالِ کُلّی. ظاہر ہے اِنقلاب بالقرآن کے لیے قرآنِ مجید کے رہنما اصولوں اور بنیادی احکام سے آگاہی لابدی ہے؛ لہٰذا ان کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔

۱. توحید: عقیدہ توحید قرآنِ مجید کا اصل الاُصول ہے اور اس کے دیگر احکام اس کے فروع ہیں، جن کی دین میں ایسی ہی اہمیّت ہے جیسی وجودِ انسانی میں اس کے اعضائے رئیسہ کی ہے. چونکہ توحید دین کی روح ہے، لہٰذا اس کے بغیر دین و ایمان اور اعمال و زندگی بے جان و مردہ ہوتے ہیں. عمل صیرفی توحید ہے اور توحید عمل سے معتبر بنتی ہے، اور توحید و عمل سے انسان موحّد بنتا ہے، چنانچہ موحِد ہی حقیقت میں زندہ، صاحبِ آرزو اور لذّتِ حسن و حیات سے آشنا ہوتا ہے۔ انسان زبان سے لاکھ توحید پرستی کا دعویٰ کرے، اگر اُس کی زندگی رنگِ توحید سے مزیّن نہیں تو وہ موحّد نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو معاشرہ توحید کا مظہر نہیں وہ اسلامی بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی پہچان اس کا رنگِ توحید ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید کیا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید کے مفصلۂ ذیل کلماتِ طیّبہ میں مضمر ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ [2] اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [3]

یہ دونوں کلمات عقیدۂ توحید کے اجزائے لاینفک ہیں، اور ان کی بدولت ہی معاشرہ حسن و زندگی، عدل و احسان، آزادی و مساوات، اخوت و محبت اور امن و سلامتی کی جنّت بنتا اور خوف و حزن کی آتش بداماں ظلمتوں سے محفوظ رہتا ہے. جس معاشرے کا دستور توحید پرستی ہو، وہاں قرآن و انسان کے دشمن

سرطان نشو ونما نہیں پاسکتے، اور نہ شرک ہی اپنی نمود دکھا سکتا ہے۔ اب ان انقلاب انگیز کلماتِ طیبہ کی فرداً فرداً صراحت کردی جاتی ہے:

ا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ: اس کلمۂ طیبہ کے معنی ہیں، نہیں کوئی معبود و محبوب، مطلوب و مقصود اور حاکم و خدا مگر اللہ۔ اس کی معنویت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن و انسان کے دشمن فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے خلاف انقلاب انگیز و قیامت خیز نعرۂ بغاوت ہے، بلکہ ان کے لیے پیغامِ مرگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نعرے کے حریف کبھی خون آشام سرطانی طبقے ہوئے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید شاہد ہے کہ یہی انقلاب انگیز نعرۂ توحید تمام انبیاؑ و رسل علیہم السلام کی تحریکِ دین کا نعرہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ معاشرتی سرطانوں (مثلاً فرعون و نمرود، ہامان و قارون، قیصری و کسریٰ اور آزر و وزارتے اس کی پرزور مخالفت کی اور اس تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ توحید کی خاصیت دوگونہ ہے، اہلِ ایمان کے لیے آبحیات ہے تو معاشرتی سرطانوں کے لیے زہرِ ہلاہل۔ سحابِ توحید میں اگر ظالموں، مشرکوں، سود خوروں اور کام چور خود ساختہ کا ذب خداؤں کے خرمنِ ہستی کے لیے برقِ فنا پنہاں ہوتی ہے تو مظلوم و محروم انسانوں کی تشنہ و مردہ کشتِ حیات کے لیے اس میں بارانِ رحمت و حیات مضمر ہوتی ہے۔

یہ کلمۂ توحید جو باطل کے لیے صورِ اسرافیل و پیغامِ ہلاکت ہے، لَآ و اِلَّا کے دو اجزائے لاینفک سے مرکب ہے، جن میں سے ہر ایک اپنی منفرد حیثیت اور غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا ان سے فرداً فرداً گفتگو کی جاتی ہے:

"لَآ" کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا دیگر کل خود ساختہ و باطل معبودان و ارباب کی نفی و بطلان اور ان کے استیصال کا نعرہ ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جنھیں مشرک لوگ اپنے ظلم و جہل کے سبب اپنا رازق و پروردگار، معبود و حاکم، حاجت روا و کارساز، غوث و دستگیر اور مشکل کشا و مستجیب الدعوات بنا لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حکومت و اقتدار، قوت و سطوت، جاہ و جلال، مال و دولت اور عزت و شہرت یا پیشوائیت و آزریت کے نشے میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ علاوہ بریں شیطان بھی اپنی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے انھیں ان کے اس زعمِ باطل

میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور ان کے لوگوں کے ساتھ متکبّرانہ و ظالمانہ رویّے کو بھی حسین بنا کر دکھاتا ہے تاکہ وہ اس "روشِ خدائی" سے باز نہ آئیں۔ ان جھوٹے خداؤں کے لیے ہم نے فرعون و آزر اور قارون و ہامان کی تلمیحات قرآنی اختیار کی ہیں؛ علاوہ بریں، چونکہ یہ سفّاک و خون آشام، سنگدل و بے رحم، ظالم و حرام خور، رہزنِ حسن و حیات اور غارت گرِ ایمان و آگہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اُنھیں معاشرتی سرطانوں سے بھی تعبیر کیا ہے۔

اسلام آرزوئے حسن و حیات ہے، اس لیے ربِّ کریم کے جمیل و جلیل اور صاحبِ ارادہ و اختیار تخلیقی شاہکار انسان کی زندگی کو حسین اور اُسے صاحبِ جمال و جلال اور زندہ و آزاد دیکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کی خاطر معاشرتی سرطانوں کے خلاف جہاد اور استیصال کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ اسلام میں جہاد کی غیر معمولی اہمیت و فرضیت کا سرِ نہاں بھی یہی ہے۔ اس اعتبار سے "لَا" معاشرتی سرطانوں کے بطلان و استیصال اور ان کے خلاف جہاد و اعلانِ جنگ کی علامت ہے۔

"اِلَّا": اگر "لَا" اربابِ کاذب اور معبودانِ باطلہ کے خلاف اعلانِ جہاد و جنگ، نیز ان کی نفی و بطلان اور استیصالِ کُلّی کی علامت ہے تو اِلَّا الحُسن والحق کے، جو اِلٰہ و ربّ العالمین ہے، اثبات و اعتراف اور اس پر ایمان لانے کی علامت ہے۔ لَا قبیح و باطل کی علامتِ نفی ہے تو اِلَّا حسن و حق کی علامتِ اثبات ہے۔ بہرحال، اِلَّا توحید کا بنیادی عنصر یا اصل الاصول ہے اور اس کا مطلب ہے کُل افرادِ نسلِ انسانی کا اِلٰہ و ربّ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کے سوا اور کوئی نہیں؛ لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو یا کسی اور کو ایسا سمجھتا یا کہتا ہے تو وہ کاذب و مشرک ہے؛ نیز اللہ تعالیٰ حیاتِ انسانی کا حُسن و معنیٰ ہے، لہٰذا اس عقیدے کو روح کی طرح اپنے پیکرِ زندگی میں جذب کر لینا اور اس کے مطابق زندگی کرنا اصلِ دین و ایمان، مقصودِ زندگی اور مشیّتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ حسین و مطہر اور مطمئن و مسرور زندگی بسر کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

جمالیات کی زبان میں اِلٰہ کو معروضِ حسن و پرستش ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور پرستش انسان کی عبودیّت و عقیدت، عجز و انکسار، اِخلاص و حُسنِ نیّت اور آرزو و محبّت کی مظہر ہوتی ہے؛ اور آرزو سے مراد محبوبِ حقیقی

کے قرب وحضوری اور دید ورضوان کی طلب وجستجو ہے؛ نیز اس میں جذب وشوق کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔
بہر حال، اِلاَّ جہاں اس حقیقت کے ایمان واعتراف کی علامت ہے کہ فقط ایک اللہ تعالیٰ ہی کُل مخلوقات کا خالق ورازق، پروردگار وکارساز، غوث ودستگیر، مُشکل کُشا ومستجیب الدّعوات، آقا ومولیٰ، مالک وحاکم اور معبود وممدوح ہے، وہاں لَا پر ایمان رکھنے کی علامت بھی ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ وہ لوگ جو قول، فعل یا رویّے سے اپنی خدائی وکبریائی کا اظہار کریں، فرعون وقارون یا ہامان وآزر ہوتے ہیں اور رب اللہ تعالیٰ کے باغی وسرکش اور اس کے بندوں کے دشمن ہیں، لہٰذا ان کا بطلان ہی کافی نہیں بلکہ استیصال بھی ناگزیر ہے۔ الغرض اِلاَّ اللہ تعالیٰ کی بلاشرکتِ غیرے اُلوہیّت وربوبیّت، کبریائی وصمدیّت، حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ، نیز ملکیتِ کائنات کے اِثبات واعتراف اور ایقان واذعان کی علامت ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اثباتِ حق میں بطلانِ باطل کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔

یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان و مؤمن کہنے اور سمجھنے کے باوجود "لَا" کو قولاً یا فعلاً تسلیم نہیں کرتے اور اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ مشرک ہیں اور شرک گناہ وظلمِ عظیم[۱] اور ناقابلِ عفو گناہ[۲] ہے؛ نیز مشرک پر جنّت حرام ہے۔ اسی طرح جو لوگ "اِلاَّ" کو تسلیم نہیں کرتے اور اس پر ایمان نہیں رکھتے، یعنی اس کے مطابق زندگی نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ مشرک و کافر تمنّد رسرشت اور اہلِ نار ہوتے ہیں۔ تاریخ وقرآن کے مطالعہ بالحق سے اس اصل کا پتا چلتا ہے کہ مُشرک لوگ مظلوم ومقہور اور محروم ومفلوک الحال، نیز سرطان گرفتہ ہونے کے باوصف عام طور سے نہ تو حُسنِ حیات وانقلاب کی آرزو، نہ خون آشام سرطانوں کے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا پانے کی طلب وجستجو رکھتے ہیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہ میں سے ایک ایمان بالتوحید کا ضعف واضمحلال اور شرک وبُت پرستی ہے۔ ایمان میں ضعف واضمحلال کا سبب اس کا فکری وعملی زندگی سے انقطاع ہے؛ یعنی انسان کا اپنے معتقداتِ جلیلہ ومحرکہ کے مطابق عمل نہ کرنا اور اس پر قائم ودائم نہ رہنا۔ دوسری وجہ شیطان کی جایاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی ہے، جس کے ذریعے وہ ان کے باطل ومشرکانہ اعتقادات واعمال کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اُنھوں نے حُسنِ انقلاب کی تحریک کے علمبرداروں اور رضا کاروں کے مقابلے میں

ہمیشہ اپنے دُشمن معاشرتی سرطانوں کا ساتھ دیا ہے اور تحریکِ انقلاب کی سخت مخالفت کی ہے۔ یہ ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جب تک دُنیا میں ظالم و جاہل لوگ موجود ہیں، معاشرتی سرطان ان کا استحصال کرتے، ان کا خون چوستے اور ان کی تذلیل و تحقیر کرتے، نیز ان پر اپنا حُکم چلاتے رہیں گے۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ جب تک دُنیا میں حسن و زندگی کے رہزن و خون آشام موجود ہیں، بنی نوعِ انسان شرک و بُت پرستی اور ظُلم و جہل کے خوفناک اندھیروں میں بھٹکتے اور حُسن و زندگی کو ترستے رہیں گے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں حکمتِ الٰہی نے کلمۂ طیبہ میں لَا کو اِلَّا سے مقدم رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دُنیا میں معاشرتی سرطان ہیں، حیاتِ انسانی ظُلم و جہل، جرم و گناہ، فحشآء و مُنکر، شرک و بُت پرستی، ذلّت و مسکنت، فتنہ و فساد، محرومی و نامرادی اور خوف و حزن کی اذیتوں کا شکار رہے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے ان کا استیصال ناگزیر ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ سرطانوں اور ان کے اِستحصالی نظاموں کی بیخ کنی کے بغیر حسین و مثالی معاشرے کی تاسیس و تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ حُسنِ اِنقلاب کی غایت معاشرتی سرطانوں اور ان کے نظاموں کا قلع قمع اور غایتِ الغایات حسین و مثالی (: اسلامی) معاشرے کی تاسیس و تعمیر ہے۔

ب۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: حُکم بلا اِستثناء صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس انقلاب انگیز کلمۂ توحید میں حُکم اور اِلَّا کے الفاظ بڑے اہم اور فکر انگیز ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت و معنویت اس سے بہت زیادہ ہے جو معاشرتی سرطانوں کی تشہیر بالباطل کے سبب عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم "حُکم" کو ایک جامع و مانع اصطلاح کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ہو (مثلاً سیاسی، معاشی، عمرانی، ثقافتی وغیرہ وغیرہ) اس میں صرف حُکم اللہ تعالیٰ کا چلے گا اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا اور نظامِ زندگی قائم کرنا اولادِ آدم پر لازم ہے۔ "اِلَّا" کے حصر سے کلمۂ طیبہ کی معنویت میں یہ تخصیص و تاکید پیدا ہو گئی کہ بنی نوعِ انسان کا حاکمِ حقیقی صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے اور وہی اپنے حُکم چلانے اور اپنے احکام نافذ کرنے کا سزاوار ہے۔ بالفاظِ دیگر، حاکمیتِ اعلیٰ فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جسے کوئی شخص، چاہے فرد ہو یا جماعت، چیلنج نہیں کر سکتا اور نہ اس میں دخل ہی دے سکتا ہے اور نہ اس کا انکار ہی کر سکتا ہے۔ ایسا کرنا شیوۂ فرعون و شیطان ہے اور یہ دونوں انسان کے صاف دُشمن ہیں۔ فرعون ضلالت و طغیان میں شیطان سے بڑھ کر ہوتا ہے، کیونکہ وہ سرکش و متکبر ہونے کے ساتھ اپنی ربوبیت و اُلوہیت کا مدّعی

بھی ہوتا ہے۔

بہر حال، اس کلمے کی رُو سے کوئی شخص حکومت و حاکمیت، قوت و اقتدار اور مال و دولت کے بل پر رب العالمین کے بندوں پر اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر اپنا حکم چلانے کا مجاز نہیں؛ لہٰذا کوئی حکمران احکام الٰہی کے سوا کوئی قانون یا حکم کسی نام کے ساتھ بھی نافذ نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ذریعے حکومت ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص، سردار، خان، جاگیردار، زمیندار یا سرمایہ دار ہو، اپنے مزارعوں، محنت کشوں اور اجیروں پر اپنا حکم چلانے کا مجاز نہیں۔ ایسا کرنا فرعونی اور دعوائے خدائی کے مترادف ہے۔ اس کی مثالیں پاکستان میں عام ہیں۔ چنانچہ یہ سامنے کی بات ہے کہ ہم نے پاکستان کلمۂ طیبہ کے نام پر حاصل کیا تھا اور یہی ہماری تحریکِ آزادی کا نعرہ تھا اور یہی ہمارے ایمان کا اصل اصول ہے۔ چنانچہ ہم بہ بانگِ دہل کہتے تھے:

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

لیکن ہمارے ظلم و جہل کا حال یہ ہے کہ ہم نے آج تک اس پر عمل نہیں کیا اور نہ ایسا کرنے کی کوئی سنجیدہ اجتماعی کوشش ہی کی ہے۔ ہماری اس عہد شکنی اور کفرانِ نعمت کی سزا ہے کہ ہم پر سفاک و خون آشام معاشرتی سرطان۔ فرعون و ہامان اور قارون و آزر مسلط ہیں اور ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ علاوہ بریں ہمارے ملک میں احکام الٰہی کے بجائے غیر قرآنی قوانین، مثلاً عسکری قوانین و احکام اور برطانوی استعماریت کے قوانین نافذ ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری قومی وسائل پیداوار پر جاگیردار، سردار، زمیندار اور سرمایہ دار قابض ہیں، جو اپنی جاگیر اور اراضی میں رہنے والوں کو اپنی رعایا سمجھتے اور ان سے غلاموں اور کنیزوں ایسا سلوک روا رکھتے ہیں۔ وہ ان پر اس طرح حکم چلاتے ہیں جیسے ان کے "خدا" ہوں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ یہ معاشرتی سرطان اپنے آپ کو ان کا رب و الٰہ یعنی رازق و پروردگار، حاجت روا و مشکل کشا، حافظ و ناصر، کارساز و دستگیر، آقا و مولیٰ، حاکم و ممدوح اور مخدوم و مطاع سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بڑا اور انھیں رذیل و حقیر خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ محنت کشوں، مثلاً ہنروروں یا پیشہ وروں (مثلاً بڑھئی، لوہار، حجام، دھوبی، معمار، درزی، موچی وغیرہ وغیرہ) کو حقارت سے "کمی" کہتے ہیں، یعنی کمینے اور نیچ محنت کش۔ یہ تکبر و غرور اگر دعوائے خدائی

نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ صریحاً قرآنِ حکیم کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ حسنہ کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن مجید محنت کو تقدیرِ انسانی اور وجہِ فضیلتِ انسانی سمجھتا اور رزقِ حلال و کامیابی اور کسبِ کمال کی پیش شرط قرار دیتا ہے اور یہ مسلّمہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن بخلاف اس کے سرطان سرشت سردار اور وڈیرے محنت کی تذلیل و تحقیر کرتے اور اُسے اپنے وقار و عظمت کے منافی خیال کرتے، نیز محنت کشوں کو نیچ اور اپنا خادم و محکوم اور مطاع و مدح سرا سمجھتے ہیں یہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کا شیوہ ہے۔

یہ خوانین، وڈیرے، سردار اور بڑے بڑے زمیندار و آزر جو محنت کشوں کی عرق ریزی و خون فشانی کے حاصل پر عیش و عشرت کرتے اور وندناتے ہیں، ان سے ایسا انسانیت سلوک کرتے ہیں جو شاید مصر کے فرعون و قارون اور ہامان نے بھی نہ کیا ہو۔ بہر کیف، تحریکِ پاکستان کے نعرے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہ تھا کہ آزادی ملتے ہی ہم اپنی آزاد مملکت میں اسلامی معاشرہ قائم کرنے اور اس میں احکامِ قرآن نافذ کرنے کی خاطر سب سے پہلے خون آشام و سفاک معاشرتی سرطانوں اور اُن کے انسانیت سوز نظامِ جاگیرداری و زمینداری کا استیصال کریں گے اور اس قارونی نظام کے بجائے قرآن کا معاشی نظام قائم کریں گے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا؛ ہم نے اللہ تعالیٰ اور اپنی قوم سے وعدے کو وفا نہیں کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہیں کی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان زرعی ملک ہے اور اس میں آزادی سے پہلے بھی انگریز حکمرانوں کے غلام ابنِ غلام جاگیرداروں، زمینداروں، سرداروں اور خوانین کی حکومت تھی اور جاگیرداری و زمینداری کا استحصالی و سودی نظام قائم تھا۔ آزادی ملی تو حکومت پھر بھی ان کے پاس رہی اور ان کا استحصالی معاشی نظام قائم رہا، چنانچہ انھوں نے لَآ پر عمل درآمد ہونے دیا نہ "اِلَّا" پر۔ ظاہر ہے ایسا کرنا ان کے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔ اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔ قارون کسی صورت ایسا نہیں ہونے دیں گے، بجز ایک صورت کے اور وہ ہے حسنِ انقلاب۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ پر عمل درآمد کرانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے:

حسنِ انقلاب کے ذریعے قارونوں، آزروں، نیز فرعونوں اور ہامانوں اور ان کے استحصالی و سودی

معاشی و سیاسی اور ثقافتی و عمرانی نظاموں کا استیصال۔

ہمارا سیاسی، معاشی، عمرانی اور ثقافتی، الغرض ہر نظامِ زندگی ہمارے دورِ غلامی کی یادگار ہے اور ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ننگِ انسانیت و اسلام اور پاکستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہے، لہٰذا اس کی بیخ کنی ناگزیر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا کیے بغیر اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ان خون آشام معاشرتی سرطانوں کی موجودگی میں اصلاحِ معاشرہ کی باتیں ایسی ہیں، جیسی خونخوار بھیڑیوں کے منہ میں دبوچی ہوئی بھیڑوں کے علاج معالجے کی باتیں۔ قصہ مختصر یہ کہ جب تک ہم لاؔ کی تیغِ برّاں سے ان معاشرتی سرطانوں کا قلع قمع نہیں کریں گے اور ان کے ناپاک وجود سے پاکستان کی سرزمین کو پاک و صاف نہیں کریں گے، یہاں حسین و مثالی معاشرے کے قیام اور احکامِ قرآنی کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جس کا ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے وعدہ کیا تھا۔ ہم نے عہد شکنی کی ہے اور اس کا صلہ ہے کہ ہم سرطان گزیدہ ہیں اور ذلّت و مسکنت کے تحت الثریٰ میں گرے ہوئے خوف و حزن کی آگ میں جل رہے ہیں۔

ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم کلمۂ توحید یعنی لاؔ اور اِلّاؔ پر عمل نہ کر کے آزادی اور پاکستان ایسی نعمتِ عظمیٰ کی تکفیر کر رہے ہیں اور کفرانِ نعمت کی جزا زوالِ نعمت ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے جو اٹل ہے اور یہ سنّتِ الٰہی ہے جو ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہے۔ اس سے پیشتر کہ قدرت کا قانونِ جزائے تکفیرِ نعمت حرکت میں آجائے اور ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہو جائیں، ہمیں لاؔ اور اِلّاؔ کے احکامِ الٰہی پر عمل کر کے معاشرتی سرطانوں سے پاک و منزّہ حسین و مثالی معاشرے اور نظامِ قرآن کا قیام عمل میں لانا ہوگا اور اس کا حسین و مثالی طریقہ، طریقۂ پیغمبریؐ حسنِ انقلاب ہے۔

۲۔ حسنِ آزادی توحید کی مثال شجرِ طیّبہ کی سی ہے، جس کی متعدد شاخوں میں سے ایک کو آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، جو اپنی اصل کی طرح حسین یعنی جمیل و جلیل اور مرغوب و نظر افروز ہے۔ آزادی توحید کا خاصّہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو شخص (فرد ہو یا قوم) موحّد ہو اور فقط ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ یعنی حاکم و مالک مانتا

ہو، اُسے غیر اللہ کی بندگی یا محکومی و غلامی قطعاً گوارا نہیں ہوتی. علاوہ بریں، عباد الرحمٰن کو چونکہ اس حقیقت کا حق الیقین ہوتا ہے کہ اُن کے ربِ ذوالجلال والاکرام نے انھیں ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کی ہے اور یہ ان کا انسانی حق ہے، لہٰذا وہ آزادی کو جان سے عزیز تر رکھتے ہیں؛ نیز وہ نہ صرف خود آزاد رہنا چاہتے بلکہ دوسروں کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور انھیں دوسروں کی آزادی کا پاس و احترام ہوتا ہے. توحید انسان کے دل و دماغ میں وحدتِ نسلِ انسانی اور وحدتِ ربوبیت کا ایقان و شعور پیدا کرتی ہے. اس اعتبار سے توحیدِ کُل اقوامِ عالم اور افرادِ نسلِ انسانی کی آزادی و اتحاد اور امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کر سکتی ہے. موحّد کو اس حقیقت کا بھی اذعان و ایقان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کُل بنی نوع انسان کا خالق و ربّ ہے، عدل و احسان سے محبت اور ظُلم سے سخت نفرت کرتا ہے. چنانچہ ایسی آزادی کے لیے جو اس کی اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی آرزوئے حُسن و زندگی، نیز مشیتِ الٰہی کے مطابق ہو، ہم نے حسنِ آزادی کی تعبیر اختیار کی ہے.

حُسنِ آزادی فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے اور ایسی آزادی اپنی مطلق اور اضافی دونوں حیثیتوں میں موزوں و احسن ہوتی ہے. یہ اجمال تفصیل چاہتا ہے. قرآن مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے اور اُس نے اپنی ہر تخلیق کی طرح فطرتِ انسانی کو بھی حسین بنایا ہے. یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرتِ انسانی کسے کہتے ہیں؟

اس کا جواب اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی، تنزیہی، تخلیقی فعلیت اور انسان کے ظاہر و باطن پر غور کرنے سے ملتا ہے. اس تفکّر بالحق سے ہمیں اس حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کہ ربِّ کریم کی تخلیقی فعلیت کی دو اہم خصوصیات یہ ہیں، اوّلاً، اس کی ہر تخلیق حسین ہوتی ہے؛ ثانیاً، ہر تخلیق کا زوج یا جوڑا ہوتا ہے. چنانچہ احسن الخالقین نے انسان کے ظاہری پیکرِ حسین کے ساتھ اس کا زوج یعنی باطنی پیکرِ حسین بھی بنایا. اس ظاہری پیکر کو خلق (بفتحِ اوّل) اور باطنی پیکر کو خُلق (بضمِ اوّل) کہتے ہیں اور خُلق کو فطرتِ انسانی سے تعبیر کرتے ہیں.

قرآنِ حکیم کی رُو سے ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے خلق اور خُلق دونوں حسین لے کر دنیا میں آتا ہے؛ لیکن جس طرح بیماری، حادثے یا جرم و گناہ کے حُسن ربا و قبیح اثرات کے سبب اس کی شکل و صورت یا خلق مسخ ہو جاتا

ہے، اسی طرح امراضِ قلب کی وجہ سے اس کا خُلق یا فطرت بگڑ جاتی ہے۔ اس امر کے باوجود انسان کے فطری تقاضے (مثلاً حُسن، زندگی اور آزادی کی آرزوئیں) فنا و معدوم نہیں ہو جاتے، بلکہ زندہ رہتے ہیں، گو برائے نام ہی سہی؛ نیز آرزوئے حُسن و آزادی کے ضعف و اضمحلال اور ناتوانی و مردنی کے باوجود اس کے اندر از سرِ نو زندہ و توانا اور فعّال ہو جانے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب تک انسان مرتا نہیں اس کی فطرت بہر حال زندہ رہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے تقاضے یا آرزوئیں بھی زندہ رہتی ہیں اور اس کے نتیجے میں اس کے اندر جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے[۸] کے وقوع پذیر ہونے کا امکان رہتا ہے، اور اس کا نتیجہ انسان کے نفسیاتی حسنِ انقلاب کی صورت میں نکلتا ہے۔

حسنِ آزادی اپنی تقدیری موزونی یا حسن کی بدولت "معروف" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی جمالیاتی حِسّ جو جمالیاتی و اخلاقی اقدار[۹] کا زندہ معیار ہے، حسن کو جانتی، پہچانتی اور محسوس کرتی ہے۔ حُسنِ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اس سے مراد ایسی آزادی ہے جو فطرتِ انسانی اور ہیئتِ اجتماعیہ کے تقاضوں کے عین مطابق ہو اور فرد و قوم دونوں کے لیے پسندیدہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، ایسی آزادی جسے اسلام اور ضمیرِ انسانی بنی آدم کے لیے روا رکھتا اور جائز سمجھتا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے کُل افرادِ نسلِ انسانی اللہ تعالیٰ کی، جو احسن الخالقین اور ربّ العالمین ہے، جمالیاتی۔ تخلیقی فعلیت[۱۰] کے حسین شاہکار اور بنی آدم ہیں، لہٰذا وہ اصلاً و نسلاً ایک ہیں۔ انسانیت کا لفظ اسی حقیقت پر دلالت کرتا ہے؛ نیز انسانی ہمدردی و غمگساری، اخوّت و محبّت، عدل و احسان، کرم گستری و رحمت اور ایثار و قربانی مظاہرِ انسانیت ہی تو ہیں۔ علاوہ ازیں، جملہ افرادِ نسلِ انسانی فقط ایک اللہ تعالیٰ ہی کے تو مربوب، بندے اور محکوم ہیں، لہٰذا اس کے سوا کوئی شخص (فرد ہو یا جماعت) انسان کو اپنا محکوم و غلام نہیں بنا سکتا اور نہ اپنے آپ کو اُس کا آقا و مالک، رازق و پروردگار یا حاکم و بادشاہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر انسان اپنی آزادی کے غلط و ناجائز استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ اور حکومتِ وقت کے سامنے جوابدہ ہے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے انسان کسی اور کا بندہ یا غلام نہیں اور نہ ہو ہی سکتا ہے، اور یہ حیثیت ہی انسان کے لیے وجۂ شرف و تکریم اور اس کی آزادی کی بنیادِ مرصوص ہے۔ اب یہ معاشرے اور بالخصوص حکومت کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے کی

حیثیت سے انسان کی آزادی و عزت کا احترام کرے، اور اُسے نہ تو خود اپنا غلام بنائے اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت ہی دے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے اور اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں کہ حسنِ آزادی انسان کا فطری حق ہے تو پھر حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کا حق نہ تو خود سلب کرے اور نہ کسی کے ہاتھوں سلب ہونے دے۔ اب حسنِ آزادی کے اس مفہوم کی پھر صراحت کر دی جاتی ہے کہ اس کا مطلب حسّی، بدنی اور قلبی آزادی ہے، جو انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے تقدیری موزونی رکھتی ہو اور انسان اُسے فطرۃً چاہتا اور پسند کرتا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، انسان کو اپنی حسّی، بدنی اور قلبی قوتوں سے احسن طریق سے کام لینے کی آزادی ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطق و سمع ودیعت کیے ہیں، لٰہذا اُسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے اور دوسرے کا مافی الضمیر سُننے کی آزادی ہونی چاہیے۔ پاکستان سمیت اکثر غیر جمہوری ممالک میں لوگوں کو بولنے، سُننے اور دیکھنے کی آزادی نہیں۔ یہ سلبِ آزادی ظلم ہے، لیکن فرعونی حکومت میں ہمیشہ ایسا ظلم ہوتا ہی رہا ہے۔ جہاں ظُلم کی حکومت ہو وہاں ظُلم کے خلاف کسی کو بولنے اور حق بات سُننے کی آزادی نہیں ہوا کرتی۔ وہاں تو ظالموں کے مظالم دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ اسلام کی رُو سے انسان حسنِ نیت کے ساتھ اپنا مافی الضمیر زبان و قلم سے بیان کرنے کا مجاز ہے، لیکن اس کا حسین ہونا ضروری ہے۔ تقریر و تحریر کی آزادی کے ساتھ انسان کو حسنِ آواز و معنیٰ کے سُننے، حسنِ مناظر کو دیکھنے اور حسنِ تحریر کو پڑھنے کی بھی آزادی ہونی چاہیے۔

آزادیِ کسب بھی انسان کا فطری حق ہے، لٰہذا اُسے علم و ہنر سیکھنے اور اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے میں کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے، بشرطیکہ وہ پیشہ قومی مفاد کے خلاف نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، انسان کو حُسنِ کسب کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ہر وہ کام کرنے کی آزادی ہونی چاہیے جو جمالیاتی حس اور عقلِ سلیم کے لحاظ سے حسین و معروف اور اخلاقی و شرعی اعتبار سے خیر و حسنہ اور جائز و حلال ہو۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو کسبِ حرام و فعلِ شنیعہ کی اجازت و آزادی نہیں ہونی چاہیے۔ الغرض، انسان حسنِ آزادی کا سزاوار ہے، اس لیے کہ وہ فطرۃً حسین ہے اور اس کا فطری مقتضیٰ ہے، لٰہذا اُسے حسین باتیں سُننے، کہنے اور حسین کام کرنے، نیز جمات و کائنات اور علم و ہنر کے حسین مناظر اور نظارے دیکھنے کی آزادی ہونی چاہیے؛

بلکہ لوگوں کو ایسے مواقع فراہم کرنا حکومت و معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ آزادی ربِّ کریم کی نعمتِ عظمیٰ ہے جو اس نے انسان کو ودیعت کی ہے، اس لیے یہ اس کا انسانی حق ہے؛ نیز یہ انسان و حیوان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ لہٰذا جو جماعت، قوم، حکومت یا فرد دوسروں کی آزادی سلب کرتا ہے، ظالم و غاصب اور مجرم و گناہگار ہے، نیز اس کا اور اس کے بندوں کا کھلا دشمن ہے۔ اس اعتبار سے حکمران، حکّام، خوانین، شیوخ، سردار، جاگیردار، بڑے بڑے زمیندار و پیشوا، نیز سرمایہ کار اور کارخانے دار وغیرہ وغیرہ، جو اپنے مزارعوں، محنت کشوں، مریدوں، خدّام و ملازمین اور مقروض و محتاج انسانوں کو اپنا محکوم و غلام بنا کر ان کی آزادی سلب کر لیتے ہیں، ظالم و غاصب، مجرم و گناہگار اور دشمنِ انسان و خدا ہوئے؛ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ہم نے ان کے لیے فرعون و ہامان اور قارون و آزر، نیز معاشرتی سرطانوں کی تعبیریں اختیار کی ہیں، اور ان کے استیصالِ کُلّی کو اور اس کے لیے حسنِ انقلاب کو ناگزیر سمجھا ہے۔

چونکہ آزادی سے عام طور سے سیاسی آزادی مراد لی جاتی ہے، لہٰذا اس کے معنی و مفہوم کی مزید صراحت کر دی جاتی ہے، لیکن "حسن" کے حوالے سے، اس لیے کہ انسان فقط حسنِ آزادی کا سزاوار ہے۔ حسنِ آزادی کا مطلب ہے حُسنِ ارادہ و اختیار کی آزادی، مثلاً حُسنِ فکر و عمل کی آزادی اور اس کے معانی ہیں:

۱۔ عقلِ سلیم کے ساتھ سوچنے، سمجھنے اور اس کے فیصلے کے مطابق افکار و خیالات اور نظریات و عقائد رکھنے، نیز نطق و قلم اور عمل کے ذریعے ان کے حسنِ بیان و ابلاغ کی آزادی۔

۲۔ اکتسابِ علم و ہنر اور اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی آزادی، بشرطیکہ پیشہ حسین یعنی جائز ہو قبیح یا حرام نہ ہو۔

۳۔ اپنی مرضی کا دین و مذہب اختیار کرنے اور عبادت کرنے کی آزادی۔

۴۔ فقط رزقِ حلال حاصل کرنے کی آزادی۔

۵۔ مناکحت بالرضا اور طلاق و خلع کی آزادی۔

۶۔ سیر و سیاحت کی آزادی۔

۷۔ حکمران و حکّام کے سامنے کلمۂ حق کہنے، نیز حق گوئی و شہادت بالحق دینے کی آزادی۔

۸۔ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں حصّہ لینے کی آزادی۔ اس تحریک کو چلانے کی ذمے داری حکومت، معاشرہ اور فرد سب پر عائد ہوتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ رحمۃ للعالمینی قرآنِ مجید کی جامع و مانع اور فکر انگیز بصیرت افروز اصطلاح ہے اور اس میں جماداتی و نباتاتی اور حیوانی و بشری جملہ عوالم کی مخلوقات کے نشو و ارتقاء، آرام و راحت اور فلاح و بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

الغرض، حسنِ آزادی کے معانی و مفہوم کو ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے: "اپنی دُنیا کو حُسن المآب بنانے کی آزادی"۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ فرد ہو یا قوم کوئی بھی اپنی دُنیا کو شرّ المآب بنانے کا مجاز نہیں۔ مختصر یہ کہ انسان صرف حسنِ فکر و عمل کی آزادی کا سزاوار ہے اور ایسی آزادی ہی کے لیے ہم نے حسن آزادی کی تعبیر اختیار کی ہے۔ بہر حال، حسن آزادی کی ضمانت فراہم کرنا حکومت کی بنیادی ذمے داری ہے اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ، قوم اور اقوامِ عالم کے سامنے جوابدہ ہے۔

اصولِ تحدیدِ آزادی: چونکہ آزادی ہر انسان کا حق ہے، لہٰذا ہر شخص کو دوسروں کی آزادی کا پاس و احترام کرنا لابدی ہے، ورنہ دوسرے بھی اس کی آزادی کا پاس و احترام نہیں کریں گے؛ اس سے "تحدیدِ آزادی" کا اصول مستخرج ہوتا ہے۔ اس اصول کی رُو سے ہر شخص اپنی حدودِ آزادی کے اندر رہ کر زندگی کرنے کی مجاز ہے، لیکن اُسے دوسروں کی حدودِ آزادی کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں۔ دوسروں کی آزادی کا احترام اپنی حدودِ آزادی کے تحفّظ کے لیے ناگزیر ہے۔

اسلامی حکومت کے سربراہ یا خلیفہ اور حکومت پر تنقید کی آزادی: اسلامی حکومت کا سربراہ یا خلیفہ اپنے قول و فعل کے لیے اللہ تعالیٰ اور رعایا دونوں کے سامنے جوابدہ ہے، لہٰذا رعایا کو اس پر زبان و قلم سے تنقید کرنے بلکہ اس کا محاسبہ کرنے کا حق ہے، اور اسے اس کی آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن تنقید

کا بالحق اور احسن طریق سے ہونا ضروری ہے۔ تنقید بالحق کا مطلب یہ ہے کہ وہ بامقصد، مثبت اور تعمیری ہونی چاہیے۔ حکمران اگر اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں ناکام ہو جائے اور معاشرے میں فساد برپا ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے، یا وہ ظالم بن جائے اور باوجود تنقید اور وصیت کے اپنی اصلاح پر آمادہ نہ ہو تو اس کے خلاف حسنِ انقلاب کا نعرہ لگانا اور اس کا محاسبہ کرنا رعایا پر واجب ہو جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اسلامی معاشرے میں کوئی فرد چاہے وہ حکمران ہی کیوں نہ ہو، متوجبِ مسئولیت ہے، مسئولیت سے ماوراء نہیں۔

اصلاحِ معاشرہ کا اُصول

اصلاحِ معاشرہ کا اُصول یہ ہے کہ "معاشرے کی ابتداء حکمران کی ذات اور ایوانِ حکومت سے ہونی چاہیے"؛ وجہ یہ ہے کہ معاشرتی مفاسد کا منبع عموماً حکمران کی ذات اور اس کا ایوانِ حکومت ہوتا ہے؛ نیز رعایا میں اپنے امراء یا حکام کا تتبع کرنے کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد کہ "ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہادِ اکبر ہے" اسی اصولِ اصلاحِ معاشرہ پر دلالت کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ حکمران قرآنی صلاحیت رکھتا ہو تو نظامِ حکومت بھی صالح ہوگا اور اس کے نتیجے میں معاشرہ بھی صالح ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر حکمران صالح نہ رہے اور بگڑ جائے تو نظامِ حکومت بھی بگڑ جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی ہمارے اُصولِ اصلاحِ معاشرہ کی تائید ہوتی ہے کہ اصلاح کی ابتداء حکمران کی ذات اور ایوانِ حکومت سے ہونی چاہیے۔ ایوانِ حکومت کا مطلب ہے بیوروکریسی (Bureaucracy) یعنی حکومت کے عُمّال یا افسر شاہی۔

غلامی حرام ہے!

سیّد المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے بانی، نقیب اور علمبردار تھے۔ یہ تحریک عالمگیر و دوامی ہے اور اس کا مقصد انسانی معاشرے میں جھوٹے اور خودساختہ خداؤں، مثلاً فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کا استیصال کر کے بنی نوعِ انسان کو ان کے طوقِ غلامی اور سلاسلِ محکومی سے نجات دلانا ہے۔ زمانہ شاہد ہے کہ یہ چار سرطانی طبقے ہی انسان کو آزادی سے

محروم کرنے اور اپنا غلام بنانے کے ذمے دار ہیں، پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی اولین جولانگاہ جزیرۃ العرب میں ان سرطانی طبقوں کو شکست دے کر ان کا قلع قمع کر دیا اور لوگوں کو ان کی محکومی و غلامی سے نجات دلائی اور اس طرح ان کے لیے رحمت بنے تو ربِ رحمٰن نے آپؐ کے اس عظیم و فقید المثال کارنامے کی ان الفاظ میں تعریف کی: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء ۲۱: ۱۰۷)؛ ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر۔

آزادی اگر رحمت کی ایک ازبس حسین صورت، شرفِ انسانیت اور انسان کے نورِ ذات کے ارتقاء و اتمام کے لیے لازمی ہے تو غلامی معاشرتی سرطانوں کے ظلم و استحصال اور انسان کی ذلت و مسکنت، نیز رجعتِ قہقری کی بھیانک صورت ہے؛ لہٰذا کوئی قوم، فرد، حکومت یا جماعت کسی فرد، جماعت یا قوم کو اپنا غلام بنانے کی مجاز نہیں۔ غلام سازی ظلم و عدوان اور معاشرتی سرطانوں کا خاصہ، نیز اسلام کے عقیدۂ توحید کی نفی و تکذیب ہے۔ جس طرح اسلام میں کسی مرد کو غلام بنانا ظلم و حرام ہے، اسی طرح کسی عورت کو کنیز بنانا ظلم و حرام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آزادی یا غلامی کا مسئلہ "انسانی" ہے، یعنی مرد و زن دونوں کا ہے۔ لہٰذا توحیدِ الوہیت و ربوبیت کے مفہوم سے ناآشنا بعض نام نہاد علماء کا یہ نظریہ کہ مرد کو تو نہیں عورت کو کنیز بنانا جائز ہے، "انسانی آزادی" کے اسلامی عقیدے کا صریحاً انکار اور انسان سے ظلم و جہل کی عبرت ناک مثال ہے۔

تکمیلِ دین سے پہلے قرونِ اولیٰ میں جنگوں میں مردوں اور عورتوں کو غلام بنانے کا رواج تھا؛ لیکن اسلام، تکمیلِ دین کا دوسرا نام اور آزادیِ انسان کا سب سے بڑا نقیب و علمبردار اور غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس نے غلامی کے استیصال کے لیے حکیمانہ اقدامات کیے اور صدیوں کی غلامی کے رواج کا بتدریج خاتمہ کر دیا۔ عقیدۂ توحید نہ صرف انسان کی آزادی کے تحفظ کی، بلکہ اسے غلامی سے تحفظ دینے کی ضمانت فراہم کرتا ہے؛ لہٰذا کسی انسان کو غلام یا کنیز بنانا عقیدۂ توحید سے انکار کے مترادف ہوا۔ جہاں تک ایران جنگ کا تعلق ہے، بے سہارا اور بیوہ عورتوں کی کفالت اور ان کی ازدواجی زندگی کی بحالی کی خاطر اسلام نے مجاہدوں کو ان سے نکاح کرنے کی رخصت دی ہے، لیکن انھیں عورت کی عزت و آبرو اور عصمت و عفت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی، کیونکہ یہ اسلام

کی روح کے منافی ہے۔ اسلام عورت کے تقدس و شرف، اس کی عزت و آبرو اور آزادی و سلامتی کا محافظ ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آزادیِ نطق و قلم ہو یا آزادیِ اکتساب و عمل، اس کو ہمیشہ سرطانی طبقوں نے سلب کیا ہے، اور ہر زمان و مکان میں دینی، قومی اور قبائلی مفادات، اخلاقیات، معاشرتی امن و سلامتی اور ملکی دفاع و ترقی کے نام پر کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی آزادی سلب کر لینے کی بنیادی وجہ ان کو اپنا محکوم و غلام بنانا ہوتا ہے۔ سلبِ آزادی اور غلامی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، لہٰذا جس معاشرے میں لوگوں کے قول و فعل اور فکر و عمل پر قدغن لگی ہو، وہ اسلامی تو کجا انسانی معاشرہ بھی نہیں کہلا سکتا۔ اس کو تو سرطانی معاشرہ کہنا انسب ہوگا۔ سرطانی معاشرے کی ایک واضح پہچان "فقدانِ آزادی" ہے۔ اس اعتبار سے حُسنِ انقلاب کا مقصد انسان کو اس کا حقِ آزادی دلانا اور سرطانی طبقوں سے اُسے آزاد کرانا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کی ذلت و مسکنت اور پسماندگی و واماندگی کے عوامل و محرکات پر "تفکر بالحق" کرنے سے اہلِ فکر و نظر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کا ایک از بس واہم محرک و عامل فقدانِ آزادی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قوم کو فکر و نظر اور اظہار و بیان کی کامل آزادی نہ ہو تو وہ بالآخر بہری اور گونگی بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے، جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں، کماحقہٗ کام نہیں لے سکتی، لہٰذا اپنا نشو و ارتقاء کرنے سے معذور ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ملتِ اسلامیہ پاکستانی قوم سمیت فقدانِ آزادی کے سبب بہری اور گونگی ہے اور اس لیے پسماندہ و کمزور ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ یہ صورتِ حال درمانِ بے تاخیر کی متقاضی ہے اور یہ درمانِ بے تاخیر حُسنِ انقلاب ہے۔

ربّ ذوالجلال والاکرام کے فضل سے ہم انگریز کی غلامی سے آزاد ہوئے تو ہم نے قوم اور اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کیا کہ ہم پاکستان کی آزاد مملکت میں آئینِ قرآن اور اُسوۂ حسنہ کے مطابق معاشرتی نظام قائم کریں گے؛ لیکن ہم اپنے عہد و میثاق پر قائم رہے نہ آزادی کی قدر ہی کی، اس کے نتیجے میں ہم انگریزوں سے بھی زیادہ ظالم و سفاک سرطانی طبقوں کی غلامی میں گرفتار ہو گئے۔ وقت کے ساتھ غلامی کی زنجیریں محکم تر ہوتی جا رہی ہیں اور ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے کی قریب قریب ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، بلغیر ایک راہ کے، اور وہ ہے سرطانی طبقوں کا استیصالِ کلّی بذریعہ حُسنِ انقلاب۔

صاحب دل و دردمند انسان یہ سوچتے اور پوچھتے ہیں کہ علم و حکمت، ادب و فن اور سائنس و ٹیکنالوجی میں اُمّتِ مُسلمہ کی پسماندگی کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے متعدّد اسباب میں سے ایک اہم سبب فقدانِ آزادی یا غلامی و محکومی ہے۔ یہ یاد رہے کہ غلامی و محکومی اغیار ہی کی نہیں ہوتی، اپنوں کی بھی ہوتی ہے۔ ہر فرعون کی حکومت میں ہامان و قارون اور آزر ہوتے ہیں اور جہاں یہ ہوں وہاں غلامی و محکومی ہے۔ فرعون صرف غلاموں پر حکومت کر سکتا ہے۔ آزاد انسان فرعون کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے؛ لہٰذا فرعون بننے سے پہلے حکمران کو سب سے پہلے رعایا کو آزادی سے محروم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، اُسے آمرانہ طور سے حکومت کرنے کی خاطر آزروں، قارونوں اور ہامانوں کی معاونت کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ یہ مؤخرالذکر سرطانی طبقے فرعون کی پشت پناہی کے سبب اپنے اپنے حلقۂ اثر و نفوذ میں لوگوں کو اپنا محکوم و غلام بنا لیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی علامت ہوتی ہے کہ معاشرہ سرطان زدہ ہے۔

زندگی کا آزادی سے محروم ہو جانے کا مطلب اس کا اپنے جلال سے محروم ہو جانا ہے۔ حیات قومی میں جلال نہ رہے تو اس میں قوّت و توانائی اور صلاحیتِ نشوونما و ارتقا نہیں رہتی اور اس کے نتیجے میں اس میں آرزوئے حسن و زندگی مردہ ہو جاتی ہے۔ آرزوئے حسن و حیات مردہ ہو جائے تو اس قوم کے زندہ رہنے کا جواز باقی نہیں رہتا اور قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو اُسے حسن کے ساتھ زندگی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ قدرت کا قانونِ احترامِ آرزو حرکت میں آ جائے اور ہم ہلاکت و بربادی کے غار میں گر جائیں، ہمیں اپنے اندر حسنِ انقلاب و آزادی کی آرزو کو زندہ و فعّال کرنا اور حسنِ انقلاب کے لیے جہاد کرنا ہوگا۔ یہ جہاد بلاشبہ از بس ہمت طلب و صبر آزما اور بعض حالات میں شکیب رُبا بھی ہوگا، لیکن اگر ہم حسنِ آزادی و زندگی چاہتے ہیں تو ہمیں ہر امتحان سے گزرنا، صبر و استقلال اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا، اور اپنی سعی و جہد کو اس وقت تک پورے عزم و یقین کے ساتھ جاری رکھنا ہوگا، جب تک ہم معاشرے میں حسن و انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ چونکہ اسلام ہمہ گیر و عالمگیر تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہے، لہٰذا عالمگیر و ہمہ گیر حسنِ انقلاب لانا

ہمارا نصب العین ہونا چاہیے، لیکن ہمیں پہلے اپنی تحریکِ حُسنِ انقلاب کا آغاز اپنے وطن میں کرنا، اس میں حسنِ انقلاب لانا اور اس کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا استیصال کرکے اسے اخوت و مساوات، محبت و رحمت، عدل و احسان اور امن و سلامتی کی جنت بنانا ہوگا۔

عدل واحسان

قرآنِ مجید کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا ایجازِ بلاغت ہے چنانچہ اس میں زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے جو احکام واصول بیان ہوئے ہیں، ان کے لیے ایسی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، جو اپنے اندر معانی کا طومار رکھتی ہیں۔ عدل و احسان کی اصطلاحات بھی اسی قبیل کی ہیں۔ اسے بھی قرآنِ حکیم کی ایک امتیازی خوبی سمجھنا چاہیے کہ وہ عدل کے ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ عدل بلاشبہ ایک جمالیاتی قدر ہے۔ یہ مقتضائے فطرتِ انسانی اور مشیتِ ایزدی ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اور انسان کی نظر میں احسان کی قدر واہمیت عدل سے زیادہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عدل سے انسان کو وہ کچھ ملتا ہے جس کا وہ حقدار ہوتا ہے اور اسے وہ کچھ دینا پڑتا ہے جو اُس پر واجب ہوتا ہے؛ لیکن احسان ایک سے زائد جمالیاتی اقدار کا حامل ہے، لہٰذا اس سے انسان کو عدل سے زیادہ خیر و حسنہ ملتی ہے۔ یہاں اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم محض سماجی عدل (Social justice) کا نہیں، عدلِ مطلق (Absolute justice) کا حکم دیتا ہے، اور اس پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ عدلِ مطلق یعنی کُل زندگی پر حاوی عدل کے علاوہ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کی پہلو دار اصطلاحِ قرآنی میں حُسنِ سلوک، رحمت وحسنہ اور ایثار و قربانی کا بھی مفہوم پایا جاتا ہے۔ بہرحال، احسان کے اثرات مُحسِن (س بالکسر) اور مُحسَن (س بالفتح) دونوں کے دلوں پر اثراتِ عدل کی بہ نسبت کہیں زیادہ حسین وحیات بخش اور مثبت ومحبت انگیز ہوتے ہیں۔ ان اثرات میں حسن کی بدولت حسد و بغض، رنجش و عداوت اور غصہ و انتقام کی آگ کو سرد کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ احسان اصل میں دشمن کو دوست بنانے، فریقین میں خیر سگالی ومفاہمت اور دوستی و

محبت کے جذبات پیدا کرنے کا ایک حسین ذریعہ ہے۔

بہرحال، عدل و احسان قرآنِ حکیم کا ایک ازبس اہم قانون ہے جو کُل زندگی پر حاوی ہے، اور اس کی روشنی میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح نظامِ کائنات میں قانونِ عدل کے سبب توازن ہے اور وہ قائم و دائم ہے، اسی طرح حیاتِ انسانی کے توازن اور قیام و دوام کا انحصار عدل و احسان پر ہے۔ یہاں اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ کائنات تو بے ارادہ و اختیار اشیاء کے مجموعے سے عبارت ہے، اس لیے اُسے فقط عدل یا میزان کی حاجت ہے، بخلاف اس کے انسان ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ عواطف و امیال، جذبات و احساسات اور ضروریات و احتیاجات بھی رکھتا ہے، لہٰذا اس کی بقا و سلامتی، نیز بے خوف و غم اور حسین و مطمئن زندگی گزارنے کے لیے عدل کے ساتھ احسان بھی ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔[۱۳]

حیاتِ انسانی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے متعدد شعبے اور گوشے ہیں اور سب میں اُسے عدل و احسان کی حاجت رہتی ہے۔ چونکہ زندگی ایک اکائی یا وحدت ہے، لہٰذا اس کا ہر گوشہ و شعبہ اس امر کا جزوِ لاینفک ہے، اور سب شعبے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک شعبہ یا گوشہ متأثر ہوتا ہے تو اس کے اثرات دوسرے گوشوں اور شعبوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں، اس لیے قرآنِ حکیم کا قانونِ عدل و احسان کُل زندگی کو محیط ہے اور اس سے کوئی شعبہ یا گوشہ مستثنیٰ نہیں۔

عدلیہ، چونکہ عدل کی محافظ و امین عدلیہ ہوتی ہے، اس لیے اُسے خود مختار و آزاد ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے حکمران و حکّام اور اربابِ قوّت و اقتدار کے بلا واسطہ یا بالواسطہ دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں، اُسے نہ تو کسی مجرم کی عالی نسبی و مرتبت اور منصب و اقتدار سے اور نہ اس کی مفلوک الحالی و معذوری سے متأثر ہو کر رو رعایت یا ناانصافی کرنی چاہیے؛ نیز عدالت کی نظر میں اعزّہ و اقارب اور اغیار و اعداء سب ایک جیسے ہونے چاہئیں اور سب کے ساتھ انصاف کرنا اس پر لازم ہے۔

نظامِ عدلیہ کے قیام کا مقصد معاشرے میں توازن اور امن و سلامتی قائم رکھنے کی خاطر ان مجرموں کو قرارِ واقعی سزا دینا ہے جو معاشرے میں فساد برپا کرتے اور اس کا توازن بگاڑتے ہیں؛ چاہے فساد و

عدمِ توازن کی نوعیت سیاسی ہو یا اقتصادی، عمرانی ہو یا ثقافتی، اعتقادی ہو یا نظریاتی۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ عدل کو قائم کرنے کی ذمے داری صرف نظامِ عدلیہ کی ہے اور عدالتیں قائم کر کے معاشرہ اپنی اس اہم ذمے داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس ذمے داری کی نوعیت انفرادی۔ اجتماعی ہے اور کُل افرادِ معاشرہ بلکہ بعض حالات میں کُل اقوامِ عالم اور جملہ افرادِ نسلِ انسانی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فرد کو صاحبِ ارادہ و اختیار اور باشعور و ذمے دار معاشرتی بشر ہونے کی حیثیت سے نہ صرف خود عادل ہونا چاہیے بلکہ اُسے عدل کو قائم اور ناانصافی و عدمِ توازن کو دُور کرنے میں سرگرمِ عمل رہنا چاہیے، اس لیے کہ یہ اس کی انفرادی۔ اجتماعی ذمے داری ہے، جس سے عہدہ برآ ہونے کا وہ مکلّف ہے۔ چونکہ اہلِ علم و حکمت معاشرے کے چشم و زبان ہوتے ہیں، لہٰذا ان میں سے جن کو ربِّ کریم نے نطق یا قلم کی نعمت سے نوازا ہو، ان پر قیامِ عدل کی ذمے داری نسبتاً زیادہ عائد ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نطق و قلم میں قلوب کو متأثر و متحرّک کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔

عدل کی تین ناگزیر پیش شرائط[1] ہیں: عدل فوری ہو، مفت ہو اور مطلق ہو، یعنی بلا امتیاز اور سب کے ساتھ ہو۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے، جس کی روشنی میں ہم اپنے ملک میں عدل کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں تو اُسے قریب قریب مفقود پاتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ یہاں عدل نہ تو فوری و مفت ہے نہ مطلق۔ دوسرے عدلیہ برائے نام آزاد و خود مختار ہے۔ علاوہ بریں عدل کا ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اگر یہ کبھی ملتا بھی ہے تو شکیب رُبا تاخیر و انتظار اور حد سے زیادہ اخراجات برداشت کرنے کے بعد ملتا ہے، لہٰذا عامۃ الناس اس سے عموماً محروم رہتے ہیں۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ قانون کی زد عموماً غریبوں اور یتیموں پر پڑتی ہے، لیکن اہلِ ثروت، اربابِ اثر و رسوخ، حکّام، سردار، جاگیر دار، خوانین، بڑے بڑے زمیندار و سرمایہ دار اور مشاہیر آز زقانون کی گرفت سے عموماً محفوظ رہتے یا بچ نکلتے ہیں۔

اگرچہ فوجداری مقدّمات کے فیصلے بھی صبر آزما تاخیر و انتظار کے بعد ہوتے ہیں، لیکن دیوانی مقدمات میں تاخیرِ بے جا تو واقعی آدمی کو دیوانہ اور کنگال بنا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں جرائم د

رشوت کی گرم بازاری اور لاقانونیت کا دَور دَورہ ہے۔ علاوہ بریں رشوت کا اس قدر زور ہے کہ عدل جنسِ خرید بن گیا ہے اور رشوت کو بجا طور سے قاضی الحاجات اور کلیدِ مشکل کشا سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ انصاف بکنے لگے تو آدمی بھی بکنے لگتا ہے۔ اس کی عزتِ نفس، عفت و عصمت، جسم و جاں، ضمیر و قلب اور زبان و قلم سب کچھ بکنے لگتا ہے۔ انجام کار اس قوم کی آزادی کے ساتھ اس کا وطن بھی بک جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فحشاء و منکر اور رشوت سمیت بھیانک جرائم کی تشویش ناک حد تک زیادتی کی علت اگر عدل کا فقدان یا اس کی کم یابی و دیر یابی ہے تو فقدانِ عدل کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے: "معاشرتی سرطان"۔ اس حقیقت سے ہمیں صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ جس معاشرے میں قرآن حکیم کا قانونِ عدل و احسان نافذ ہو اور اس کی حکمرانی و بالادستی ہو، وہاں معاشرتی سرطان پیدا ہو سکتے نہ پنپ ہی سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عدل و سرطانیت ایک دوسرے کی ضدِ نقیض ہیں اور اجتماعِ نقیضین محال ہے۔ اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ مستخرج کر سکتے ہیں کہ معاشرتی سرطان ہی فقدانِ عدل و احسان، ظلم و عدوان، فحشاء و منکر اور جرم و فساد کے ذمے دار ہیں۔ یہ نہ صرف خود ظالم و مفسد اور مجرم و سیاہ کار ہوتے ہیں بلکہ جرائم پیشہ لوگوں کی معاونت و سرپرستی بھی کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فرعون و ہامان اور قارون و آزر، جو غاصب و ظالم، سفاک و سنگدل، مجرم و سیاہ کار، سود خور و خون آشام ہوتے ہیں، عادل و محسن کیسے ہو سکتے ہیں اور عدلیہ کو آزاد و خود مختار کیسے رہنے دے سکتے ہیں؛ نیز وہ قانونِ عدل کی حکمرانی و بالادستی کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ اس لیے کہ عدل اُن سے اُن کے ظلم و استحصال اور جرائم کا محاسبہ کرتا اور ان کی مکافات چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قانونِ عدل کو اپنے لیے پروانۂ اجل اور عدل کو بجا طور سے اپنی موت سمجھتے ہیں، اور اس سے بچنے کی خاطر قانونِ عدل کو مفلوج و معطل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

زندگی ایک کُل ہے اور کُل کی طرح اس کے ہر جزو کی بقا و سلامتی اور حسن و طمانیت کا دارومدار عدل پر ہے، لہٰذا اس کے چند بڑے شعبوں کے حوالے سے عدل سے مجملاً گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۔ **معاشرتی عدل** (Social justice) : حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے معاشرتی عدل کا یہ اصل الاصول بتایا ہے کہ "دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے سلوک کریں"۔ ظاہر ہے انسان طبعاً چاہتا ہے کہ لوگ اس سے احسان یا حُسنِ سلوک کریں اور بالفرض اگر ایسا نہیں کرتے تو عدل تو بہر حال کریں۔ اگر ہر انسان دوسروں سے فطرۃً عدل واحسان کا طلب گار وامیدوار ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ دوسرے بھی اس سے یہی کچھ چاہتے ہیں، لہٰذا اُسے ہر حال میں دوسروں کے ساتھ عدل واحسان کرنا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر، اُسے ایک محتاط و ذمے دار انسان کی طرح معاشرے میں اس طرح رہنا چاہیے کہ اُس کے قول، فعل، رویّے یا کردار سے دوسروں کو تکلیف، مضرت یا اس کے جذبات واحساسات کو ٹھیس نہ پہنچے اور نہ اس کی خلوت و آزادی میں خلل ہی واقع ہو، نیز اس سے معاشرے میں فساد وعدم توازن پیدا نہ ہو۔

اسلام کے نزدیک معاشرتی احسان کی ایک حسین صورت حُسنِ خُلق ہے، جس کی غیر معمولی اہمیت وفضیلت کا اندازہ آپؐ کے اس ارشاد سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ "حسنات یا نیکیوں میں سب سے زیادہ وزنی نیکی حُسنِ خُلق ہے"۔ احسان کی اصطلاح میں تکریمِ انسانی، حُسنِ تکلّم وتخاطب، خندہ پیشانی، تبسّمِ لب وتطر، حُسنِ معاملہ، حُسنِ ظن، اسلام ودُعا، مصافحہ ومعانقہ، عیادت وتعزیت، ہمدردی وغمگساری، حُسنِ معاونت ونصرت، ایثار وقربانی وغیرہ وغیرہ کا معنیٰ ومفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے احسان نہ کرنا تکذیبِ دین ہے اور اس موقف کی تائید میں سورۂ ماعون پیش کی جا سکتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا تم نے اس شخص کے احوال پر غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم یعنی بے یار ومددگار کو دھتکارتا ہے، اور لوگوں کو اہلِ فقر واحتیاج کے نان نفقہ کا بندوبست کرنے کی ترغیب نہیں دیتا، لہٰذا بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی صلوٰۃ کی غرض وغایت سے بے خبر ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی قسم کے احسان سے روکتے ہیں" (الماعون ۱۰۷)۔

ربِّ جلیل کے ہر ارشاد میں حکمت اور غرض وغایت ہوتی ہے؛ نیز وہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم اس پر تدبّر کریں اور اس کی روشنی میں اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کا جائزہ لیں اور اصلاح کریں۔ چنانچہ

محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ کے آئینے میں ہم بحیثیت قوم و ملت اپنی حالت کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تکذیبِ دین کرنا ہمارا شعار بن چکا ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ ربِّ کریم نے انسان کو مکرم بنایا ہے، لیکن اس کی تکریم کرنے کے بجائے ہم اس کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرتی سرطان چاہے فرعون و ہامان ہوں یا آزر و قارون اپنے آپ کو بڑا، سردار اور مخدوم اور دوسروں کو چھوٹا، کمینہ، خادم، کمی بلکہ ہنود کی طرح ''شودر'' سمجھتے ہیں۔ سرطان تو سرطان، متوسط درجے کے لوگ بھی اپنے گھریلو ملازموں کو ''شودر'' سمجھتے ہیں، چنانچہ ملازموں کے برتن علیحدہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے ''آقاؤں'' کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کا تصور تک نہیں کرسکتے۔ سب انھیں کمینہ اور ''کمی'' (یعنی ذلیل محنت کش) سمجھتے ہیں، جس طرح ہنود شودروں کو سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے سارے معاشرے کا دستور ہے، جس میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو اپنے آپ کو مشائخ و علمائے دین اور متشرع و متقی خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ قرآن و سُنّہ کی خلاف ورزی اور تکذیبِ دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اُس نے اپنی نعمتیں جُملہ بنی نوع انسان کے تمتّع کے لیے پیدا کی ہیں[۱۵] اور وہی ان کا مالک ہے، لہٰذا انسان محض ان کا امین ہے۔ چنانچہ انسان محنت و مشقت اور سعی و جہد سے جو کچھ جائز طریق سے کماتا ہے، اُسے اپنی جائز ضروریات پر خرچ تو کرسکتا ہے، لیکن ضروریات سے زائد مال (یا العفو) اپنے قبضے میں رکھنے کا مجاز نہیں؛ بلکہ ''العفو'' کو فی السبیل اللہ خرچ کرنے کا شرعاً مکلف ہے[۱۶]۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے ہر مالدار شخص کے مال و دولت میں اہلِ احتیاج اور محروم افراد کا حصّہ (حقِ معلوم) ہوتا ہے[۱۷]، جسے دینا فرض ہے اور نہ دینا امانت میں خیانت اور ناانصافی ہے، جسے ظُلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، محروم و مسکین (یعنی عُمر رسیدہ و بے روزگار، معذور و بیمار اور مفلوک الحال و بے سہارا لوگوں، بیواؤں، یتیموں اور اہلِ احتیاج وغیرہ وغیرہ) کی کفالت کا باقاعدہ و معقول انتظام کرنا معاشرے یا حکومت کی ذمے داری ہے؛ لہٰذا حکومت یا افرادِ معاشرہ پر کفالتِ قومی کا انتظام کرنا اور دوسروں کو کفالت کا نظام قائم کرنے کی تبلیغ کرنا اور ایک دوسرے کو اس کی ترغیب دینا لازم ہے[۱۸]۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ دو ایک ملکوں کے سوا مسلم ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص کفالتِ قومی کا کوئی انتظام نہیں، حالانکہ ایسا کرنا ان پر

واجب ہے۔ بخلاف اس کے اشتراکی اور مغرب کی سرمایہ دارانہ حکومتوں میں کفالتِ قومی کا معقول انتظام ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشتراکی اور مغربی اقوام پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس سُنّتِ حسنہ پر عمل پیرا ہیں لیکن مسلمان نہ صرف یہ کہ اس سُنّتِ حسنہ کا اتباع نہیں کرتے بلکہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور سُنّتِ رحمۃ للعالمین ہے۔ ظاہر ہے جس قوم کے ظلم و جہل کا یہ حال ہو، اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کفالتِ قومی کا کوئی نظام قائم کرے گی یا اس کے افراد اس کی ضرورت پر زور دیں گے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے ہمارا نظامِ کفالت قائم نہ کرنا اور اس کے قیام پر زور نہ دینا صریحاً احکامِ الٰہی اور سنّتِ حسنہ کی خلاف ورزی اور تکذیبِ دین ہے؛ لیکن سرطانی نظامِ حیات کا کرشمہ اور ہمارے ظلم و جہل کی انتہا ہے کہ بہت کم اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے دانشوروں اور علما و مفکرین کو زعمِ باطل ہے کہ وہ حقیقت آشنا ہیں۔ کیا یہ جہلِ مرکب نہیں ؟ یقیناً یہ جہلِ مرکب ہے، جس کے باعث ہم میں آرزوئے حسنِ حیات و انقلاب پیدا نہیں ہوتی اور کبھی ہوتی بھی ہے تو اشتہائے کاذب کی طرح پیدا ہوتی ہے اور جلد ناپید ہو جاتی ہے۔

لوگوں کے ساتھ احسان کرنا، حکمِ الٰہی ہے جس کی بجا آوری ہم فرض ہے، لیکن بہت کم اس فرض سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اہلِ احتیاج کو ان کی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں انھیں مستعار یا فی السبیل نہیں دیتے، وہ تکذیبِ دین کرتے ہیں[۱۹]۔ اس اعتبار سے بھی تکذیبِ دین ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ زیرِ نظر آیاتِ جلیلہ کی رو سے صلوٰۃ کے تقاضوں سے تغافل اور انھیں پورا نہ کرنا، تکذیبِ دین کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں بہت کم صلوٰۃ کے تقاضوں سے آشنا ہیں اور ان میں سے بہت کم انھیں پورا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صلوٰۃ کا ایک ازبس اہم معاشی تقاضا یہ ہے کہ افرادِ نسلِ انسانی ربِّ جلیل کے احکام ہی کے مطابق اپنا مال و دولت اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور خرچ کر سکتے ہیں[۲۰]۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ صلوٰۃ کا تقاضا پورا نہیں کرتے اور اس طرح دین کی تکذیب کرنا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے معاشی احکام یا صلوٰۃ کے معاشی تقاضے دو طرح کے ہیں : اوامر اور نواہی۔ اوامر یہ ہیں : (۱) ایتائے

زکوٰۃ اور (۲) انفاق بالعفو؛ یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

نواہی یہ ہیں: ربوٰ یا سود (مثلاً مزارعت، مضاربت، بینکاری، کرایہ کاری، دستارگیری وغیرہ وغیرہ)، کسبِ حرام (مثلاً خیانت، نوسربازی، قماربازی، سمگلنگ، چوربازاری، ٹیکس چوری، کاروباری بددیانتی، جیسے کم تولنا، کم ماپنا، اشیاء میں آمیزش کرنا وغیرہ وغیرہ)؛ اکتناز و احتکار، اسراف و تبذیر اور بخل و تکاثر۔

عدل و احسان اور حُسنِ زندگی سے ہماری محرومی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کو زینتِ طاقِ نسیاں بنا رکھا ہے اور ہم جانتے ہیں پر مانتے نہیں۔ علاوہ بریں، ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور ناجی سمجھتے ہیں، لیکن بحیثیتِ قوم ہم قرآنِ حکیم کے معاشی احکام کی بالخصوص خلاف ورزی کرتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اول تو ہمارے ملک بلکہ کسی مسلم ملک میں بھی قرآن کا نظامِ زکوٰۃ قائم نہیں، دوسرے، جو لوگ زکوٰۃ دیتے بھی ہیں تو وہ نہ تو نصاب کے مطابق اور نہ پوری ہی دیتے ہیں۔ پاکستان میں بینکوں کے ذریعے صرف بچت کے سودی کھاتے (سودی سیونگ اکاؤنٹ) میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ وصول کرنے کا طریقہ نہ صرف غلط، غیر قانونی بلکہ مضحکہ خیز بدعت ہے۔ علاوہ بریں کسی حکومت کا بذریعہ قانون ایتائے زکوٰۃ کو کسی فرقے کی خوشنودی کی خاطر لازمی کے بجائے اختیاری قرار دینا فرمانِ الٰہی کی[۲] خلاف ورزی اور اس کے ساتھ عبرتناک استہزاد ہے۔ اس قسم کے قوانین ہمیں اس اصل کی یاد دلاتے ہیں کہ قارونی۔ فرعونی نظامِ معیشت میں آمریت کے تعاون سے خوب کو ناخوب اور قبیح کو حسین بنا کر دکھایا جا سکتا ہے۔ بہرحال، جہاں تک حسنِ ضرورت سے زائد دولت کے خرچ کرنے کا تعلق ہے۔ اس حکمِ الٰہی پر عمل کرنے والا کوئی "مسلمان" کہیں نظر نہیں آتا۔ اس صورتِ حال کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر وہ زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے اوامر پر عمل کریں تو وہ نہ قارون بن سکتے ہیں اور نہ فرعونی ہی بن کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں، معاشرتی سرطان اوامر کی طرح نواہی پر بھی عمل نہیں کرتے بلکہ انھوں نے فرعونی و قارونی کرنے کی خاطر سرمایہ دارانہ معاشی نظام قائم کر رکھا ہے، جو محنت کشوں، مزارعوں، مفلوک الحال اور اہلِ احتیاج کا

استحصال کرنے اور مختلف ناموں سے سودی سرمایہ کاری اور سود خوری کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔
مسلم ممالک میں سود کاری یا سودی سرمایہ کاری کی مختلف شکلوں (مثلاً مزارعت، مضاربت، بینکاری، کرایہ کاری، دستار گیری وغیرہ وغیرہ) کا عام رواج ہے اور انھیں جائز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ سود اور ظلم و استحصال کی واضح اشکال ہیں۔ سود معاشی سرطان ہے، اس لیے اس مہلک بیماری کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے[۱۲]۔ سود کی حرمت کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ یہ نہ صرف خود حرام ہے بلکہ یہ سودی سرمایہ کاری کا بنیادی محرک و عامل ہے، جو ظلم و استحصال اور کسبِ حرام کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔
سرمایہ دارانہ نظام قارونوں کی ایجاد ہے، لہٰذا اس کے لیے ہم نے قارونی نظامِ معیشت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ علاوہ ازیں، اس کی اساس سود پر استوار ہوتی ہے، اس لیے اس کے ہیولے میں فساد کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک دُنیا میں سرمایہ داری، سودی سرمایہ کاری یا سود کاری کا نظام قائم ہے، فساد کی ہر نمود (جیسے ظلم و استحصال، محکومی و غلامی، ذلّت و مسکنت، تذلیلِ انسانیت، تضاد و تخالف، شرک و عدوان، فحشآء و منکر، جرم و گناہ، سیئہ و شر، سیاہ کاری و حرام خوری، خوف و حزن، جنگ و جدال وغیرہ وغیرہ) برقِ فنا بن کر خرمنِ امن و اطمینان کو جلاتی اور برباد کرتی رہے گی؛ نیز معاشرتی سرطانوں کی سیادت و سطوت قائم رہے گی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایک تو بلا سود نظامِ معیشت قائم کرنے کی آرزو رکھتا ہے اور دوسرے وہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں سے پاک و صاف معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے، جس کا دستور عدل و احسان ہو اور جس میں حاکمیتِ اعلیٰ (Supreme sovereignty) صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ کی ہو اور جملہ امورِ زندگی میں قرآنِ حکیم محکم ہو اور اس کا ہر حکم یا فیصلہ قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہو۔
چونکہ معاشرتی سرطانوں کے ہوتے ہوئے قرآنِ مجید کا نظام قائم نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسا حسین و مثالی نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے:

حسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا اِستیصالِ کُلی

عدل کو شہادت مستلزم ہے، لہٰذا ایک تو وہ شہادت کو، دوسرے سچی شہادت کو چاہتا ہے۔

بالفاظِ دیگر، شہادت نہ دینا یا جھوٹی شہادت دینا یا کتمانِ حق کرنا عدل کے منافی ہے، اس لیے اسلام میں ظلم وجرم ہے[۲۲]۔ قرآنِ حکیم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرتی عدل کا جو معیار قائم کیا ہے، اس کی نوعیتِ مطلق وعالمگیر ہے، جیسا کہ اس کے احکامِ شہادت سے ثابت ہے۔ ان احکام کی رُو سے نہ صرف شہادت دینا بلکہ سچی اور بے کم وکاست شہادت دینا فرض ہے، چاہے وہ اپنے والدین اور اعزہ واقارب، حتیٰ کہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی دشمن قوم کے معاملے میں بھی سچی اور بے کم وکاست شہادت دینا فرض ہے[۲۳]۔ الغرض عداوت ومخاصمت ہو یا رشتہ وپیوند، عدل ہر حال میں اور ہر سطح پر سچی شہادت کا متقاضی ہے۔

یہ ہے قرآنِ حکیم کا معیارِ عدل جو آپ اپنی مثال ہے، لیکن سرطانی معاشروں میں صدیوں سے زندگی کرنے کے خوگر ہو جانے کے باعث اس کے احکامِ عدل کی خلاف ورزی کرنا، ہمارا شیوۂ حیات ہے۔ ہمارا معاشرتی نظام سرطانی ہے، اور اس کی تاسیس ظلم پر ہوئی ہے، اور سرطانی معاشرے میں شہادت کا سچا اور عدل کا عام ہونا اور سب کو ملنا، ناممکن نہیں تو ازبس دشوار ضرور ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں عدلیہ نہ تو خود مختار اور نہ معاشرتی سرطانوں کے اثر ونفوذ سے آزاد ہی ہوتی ہے۔

عدل ایک مطلق جمالیاتی قدر ہے، جس کے بغیر انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں توازن وحسن پیدا نہیں ہو سکتا؛ لہٰذا احوال وظروف کیسے کیوں نہ ہوں، عدل کو روا رکھنا، شرعاً لازم ہے۔ اس کی ضد ونقیض ظلم ہے، جو زبان وقلم سے کیا جائے یا قوت وحکومت سے، ناجائز وحرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو ضرر نہ پہنچے"[۲۴]۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جو مسلمان عادل نہیں یا ظلم کرنے والا ہے، وہ حقیقت میں مسلمان نہیں۔ پیغمبرِ اعظم وآخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس معیارِ مسلمانی پر اگر ہم اپنے قول وکردار کو جانچیں تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس پر بھی ہم اپنے آپ کو مؤمن وموحّد اور ناجی ووارثِ جنّت سمجھتے ہیں۔ کیا یہ ظلم وجہل نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے، کیونکہ

یہ حقیقت ہے تو پھر یہ بھی یقینی بات ہے کہ اس کی وجہ ہماری سرطان گرفتگی و سحر زدگی ہے، جس سے چھٹکارا پانے کا اب ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے:

فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری سرطانوں کا استیصال بذریعہ حسنِ انقلاب

ربِّ ذوالجلال والاکرام حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کی طرح عائلی گوشے کو بھی حسین دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ عائلی زندگی کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہیئتِ اجتماعیہ کی اساس ہے۔ خاندان قومی زندگی کی اکائی ہے، جس کے بغیر ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل و تعمیر ممکن نہیں۔ اس کا زندہ ثبوت اشتراکی روس کا تاریخی تجربہ ہے، جو اس نے انقلاب کے فوراً بعد مناکحت کے ادارے کو منسوخ کر کے کیا تھا، اور اس بُری طرح ناکام ہوا تھا کہ اُسے اس کو قانوناً بحال کرنا پڑا۔ قوم کو اگر شجر مانیں تو خاندان یا عائلی زندگی کو اس کی اصل تسلیم کرنا ہوگا۔ چنانچہ اسی بنا پر عائلی زندگی کو اسلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، اور وہ اس کو خاندان و قوم کی طمانیت و مسرّت اور ترقی و کامیابی کی خاطر متوازن و حسین دیکھنا چاہتا ہے؛ لہٰذا اس کے کفیل اور حافظ و قیّم مرد کو خاص طور سے ہر حال میں عدل و احسان کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ مرد کے جمالیاتی ذوق و شوق، شدید جنسی تقاضے یا کسی اور حاجت کی صورت میں اُسے ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت تو دیتا ہے، اگر عائلی عدل کی شرط کے ساتھ[۲۵] اس مشروط رُخصت کے ساتھ ہی فطرتِ ہستی مرد کو اس کی اس کمزوری سے متنبّہ بھی کر دیتا ہے کہ شدّتِ محبّت میں دو یا اس سے زائد ازواج کے مابین عدل قائم کرنا اور قائم بالقسط رہنا ازبس دشوار و شکیب رُبا ہے، لہٰذا ہر مرد کے بس کا روگ نہیں[۲۶]۔ اس ارشادِ ربّانی سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کثرتِ ازواج کے حق میں نہیں، اور وہ چاہتا ہے کہ مرد حتّی الامکان ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے اور اگر بامرِ مجبوری ایک سے زائد نکاح کرے تو اُسے ہر حال میں اپنی بیویوں کے درمیان عدل روا رکھنا ہوگا۔

زمانہ شاہد ہے کہ کثرتِ ازواج کی عدل سے مشروط رخصت کے باوجود مسلم اقوام کے معاشرتی سرطانوں نے اس رُخصت سے اس قدر ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اس کی مٹی پلید کی ہے کہ انسانیت کی گردن ندامت سے جُھک جاتی ہے، اس سے نہ صرف اسلام بدنام ہوا ہے بلکہ اس کی ترویج و اشاعت

کو بھی ازبس نقصان پہنچا ہے۔ عدل تو در کنار، معاشرتی سرطان ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی ازواج کو اپنی کنیزیں سمجھتے اور ان سے انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں، اس لیے کہ ظلم و خدائی کرنا معاشرتی سرطانوں کی سرشت ہے۔

اسلام نے نکاح کو مہر سے مشروط کرکے عورت کی قدر و منزلت اور معاشرتی حیثیت کو جو رفعت بخشی ہے، اس کی مثال کسی غیر مسلم معاشرے میں نہیں ملتی۔ لیکن پاکستان میں بالخصوص جو اسلام کے نام پر حاصل ہوا ہے اور جس میں مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری ہے۔ عورت کو مہر دینے کا رواج ہی نہیں۔ جہاں تک عورت کو مہر دینے کا تعلق ہے، اکثریت ان لوگوں کی ہے جو مہر دینے کو نہ تو نکاح کی لازمی شرط سمجھتے ہیں اور نہ حکمِ قرآنی۔ کیا یہ عورت کے ساتھ ناانصافی اور ارشادِ الٰہی کی خلاف ورزی نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ظلم و گناہِ عام کے ذمے دار کون ہیں؟ اس سوال پر غور و فکر اور تحقیق و تدبر کا حاصل یہی جواب ہے کہ اس کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہیں۔ ہمیں یہ اصل نہیں بھولنی چاہیے کہ معاشرتی سرطان عدل و احسان کے دشمن اور ظالم و ستمگر ہوتے ہیں اور اپنے ظلم و ستم کے خلاف آواز تک سُن نہیں سکتے، لہٰذا وہ اپنی قوت و سطوت اور مال و دولت کے سحر سے لوگوں کی بصیرت و گویائی کو سلب کر لیتے ہیں۔ قوم بہری اور بے بصر ہو جائے تو اس میں آرزوئے حسنِ زندگی آہستہ آہستہ دم توڑنے اور مرگِ آرزو نشو و نما پانے لگتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اس سے پیشتر کہ موت جو ہماری مرگِ آرزو کی منتظر اور ہماری گھات میں لگی ہے، ہمارے خرمنِ زندگی پر برقِ فنا بن گرے، ہمیں سُنتِ پیغمبریؐ کے مطابق حسنِ آزادی کے ذریعے اپنی قوم و ملت کو خون آشام سرطانوں کے چُنگل سے رہائی دلانا ہوگی اور اس کے لیے معاشرتی سرطانوں کا استیصال ناگزیر ہے۔

معاشی عدل: اسلام میں نظامِ صلوٰۃ کی اصل توحیدِ اُلوہیت کے بعد توحیدِ ربوبیت یا معاشی نظام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ توحیدِ اُلوہیت اگر شجرِ حیات کی اصل ہے تو معاشیات اس کا ثمر ہے، جس میں سب افرادِ نسلِ انسانی کا، جو ربّ العالمین کے عیال ہیں، حصّہ ہے، جو انھیں بقدرِ حسنِ

سعی و حاجت ملنا چاہیے اور احسان کے طور پر بھی ملنا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روزی زندگی کے قیام کے لیے ناگزیر ہے اور زندگی ہو تو انسان اس کی آرزو دے الٰہ، نیز دیگر تقاضوں اور فرائض کو پورا کر سکتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآن مجید معاشی عدل کو غیر معمولی اہمیت دیتا اور انسان کو اپنا دستورِ حیات بنانے کی تاکید کرتا ہے اور ساتھ ہی معاشی ناانصافی یا ظلم کے ہلاکت خیز عواقب و نتائج سے متنبہ بھی کرتا ہے لیکن قرآن حکیم سے ہماری مہجوری و دُوری کا یہ حال ہے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا ہمارا شعارِ زندگی بن چکا ہے۔ ہمارے ظُلم وجہل کی انتہا یہ ہے کہ معاشی ناانصافی حتیٰ کہ سود کو بھی جو اسلام میں انتہائی گھناؤنا جرم اور ظُلم ہے، ہم معاشی زندگی کے نشو و ارتقاء کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں اور دلائل و براہینِ ابلیسی سے اپنے اس موقف کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں قطعاً کوئی حجاب و باک محسوس نہیں کرتے؛ اگرچہ ایسا سمجھنا، کہنا اور کرنا تکذیب و تکفیرِ قرآن کے مترادف ہے۔ اس مسئلے پر تفصیل سے بحث آگے اپنے مقام پر آئے گی، اس وقت یہاں چند ایک اشارات ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس ازبس اہم و بصیرت افروز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم معاشی ناانصافی کو فساد سے تعبیر کرتا ہے؛ اس لیے کہ اس سے معاشرتی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ ناآہنگی و خرابی، تضاد و تخالف اور تشتت و افتراق کی صورت میں نکلتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ معاشی ناانصافی یا ظُلم کے ہیولے ہی میں فساد یا خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی معاشی زندگی میں فساد برپا ہے اور اس کے نتیجے میں قوم تضاد و تخالف اور تشتت و افتراق کی شکار ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اِظہارِ حقیقت ہو گا۔ سرمایہ کاری کی مختلف شکلیں، مثلاً مضاربت و مضارعت، بینکاری و تمسکات کاری، حصّص کاری و سٹہ بازی، کرایہ کاری و دستارگیری اور احتکار و ساہوکاری وغیرہ وغیرہ اصل میں سود کاری ہی کی مختلف شکلیں اور ربوٰ کے مختلف نام ہیں؛ لیکن ہم نے انھیں جائز قرار دے رکھا ہے۔ میرے نزدیک اس اجتماعی ظُلم و جہل کے ذمے دار معاشرتی سرطان ہیں، جو معاشی انصافی، حرام خوری، سود خوری اور استحصال کے بغیر زندہ رہ سکتے نہ نشو و ارتقاء ہی کر سکتے ہیں۔

پاکستان سمیت اکثر مسلم اقوام کی پسماندگی و درماندگی، ذلت و مسکنت، تشتت و افتراق اور فتنہ و فساد، نیز ان کے مابین عداوت و مخاصمت اور جنگ و جدال کے عوامل کو محرکات میں سے ایک معاشی ظلم یا ناانصافی ہے، جس کی ذمہ داری بھی معاشرتی سرطانوں پر عائد ہوتی ہے۔

یہ بڑی ہی شرمناک و تلخ حقیقت ہے کہ معاشی عدل کے فقدان کے سبب پاکستان کی بیرونی منڈیوں میں ساکھ ہے نہ اس کی مصنوعات اور خام مال کی اتنی مانگ ہے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشی نظام سرطانی ہے جس نے قوم کو بددیانت و بدکردار اور حرام خور بے بصر بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ کرنا، غیر معیاری مصنوعات تیار کرنا، کم تولنا، کم ماپنا، کم ناپنا، دکھانا کچھ اور دینا کچھ، عہد شکنی کرنا، غلط بیانی و دروغ گوئی سے ناجائز منافع کمانا، رشوت لینا اور دینا، طرح طرح کے حیلوں سے ہر قسم کے ٹیکس اور محصولات نہ دینا، سمگلنگ اور چور بازاری کرنا، نیز امانت میں خیانت کرنا ہمارا قومی معاشی کردار ہے اور اس کے باوجود بھی ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں، ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم ہی فقط عبادالرحمٰن، ناجی اور جنت کے وارث ہیں۔ ہماری اس معاشی بدکرداری، ناانصافی، حرام خوری اور غلط فہمی کے ذمے دار قارون و آزر ہیں، جن کے معاون و سرپرست فرعون و ہامان ہیں۔ اس سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ جب تک دنیا اور خصوصاً پاکستان میں سرمایہ داری و سودکاری اور جاگیرداری و زمینداری نظاموں اور خوانین، سرداروں، وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ کاروں اور ساہوکاروں کا خاتمہ نہیں ہوگا، معاشی عدل کا لفظ بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا اور عامۃ النّاس کا معاشی عدل سے محروم رہنا شدنی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور اسے ایسا نہ سمجھنے کی ہمارے پاس کوئی معقول وجہ بھی نہیں تو پھر اس سودی سرطانی معاشی نظام کی بیخ کنی ناگزیر ہوئی، اور اس کے لیے معاشرتی سرطانوں کا استیصال کُلّی لازمی ہے، جو حسنِ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ اصل ہمیشہ ہمارے ذہن میں تازہ رہنی چاہیے کہ قرآن مجید اور احادیثِ طیبہ کی رُو سے نہ تو سود خور و حرام خور کی عبادت معتبر ہے اور نہ اس کی دُعا ہی مستجاب ہوتی ہے؛ نیز اس پر جنت حرام ہوتی

ہے۔ اس لیے کہ وہ کسبِ حلال پر کسبِ حرام کو ترجیح دیتا اور اس کے نتیجے میں حلال وطیب روزی اور جنت کو اپنے اُوپر حرام کر لیتا ہے۔

معاشی عدلِ اجتماعی کا اوّلین تقاضا کفالتِ اجتماعی کے نظام کا قیام ہے۔ کفالتِ اجتماعی کا نظام اس واقعیت پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے قائم کرنے والے توحیدِ ربوبیت کو عملاً تسلیم کرتے ہیں، چاہے جزوی طور پر ہی سہی۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جس معاشرے میں نظامِ کفالت قائم نہیں، وہ توحیدِ ربوبیت کا عملاً منکر ہے، چاہے اس کے افراد زبان سے اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہ کتنی تلخ حقیقت اور عبرت کا مقام ہے کہ دو ایک مسلم ممالک کو چھوڑ کر پاکستان سمیت کسی ملک میں بھی معاشی کفالتِ اجتماعی کا نظام قائم نہیں۔ بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ ہمارے ظلم وجہل کی انتہا یہ ہے کہ ہم نظامِ کفالت کی ضرورت واہمیت کا شعور بھی نہیں رکھتے اور اس حقیقت سے بھی کم آشنا ہیں کہ نظامِ کفالتِ اجتماعی کا قیام اسلامی حکومت کا اوّلین فریضہ ہے اور پیغمبرِ اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادِ باری تعالیٰ کے مطابق توحیدِ اُلوہیت کا نظام قائم کرتے ہی اپنی شہری مملکت مدینہ منورہ میں یہ نظامِ کفالت قائم کیا اور دُنیا کو اس سے روشناس کرایا تھا۔[۲۷] اس نظامِ کفالت نے تحریکِ اسلام میں دلکشی وجاذبیت پیدا کرنے اور اُسے مقبولِ عام اور عالمگیر بنانے میں از بس اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن معاشرتی سرطانوں کی سازش سے مسلمان اوّل تو اس حقیقت سے کم آشنا ہیں؛ دوسرے جانتے بھی ہیں تو مانتے نہیں، اور تیسرے نظامِ کفالت کے قیام کو خارج از امکان خیال کرتے ہیں۔ اس حوصلہ فرسا صورتِ حال میں نظامِ کفالت کو قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے موجودہ سرطانی معاشی نظام کا استیصالِ کُلی، جو حُسنِ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔

سیاسی عدل کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ وطن کو بلا امتیازِ نسل ورنگ سیاسی آزادی اور دیگر حقوق حاصل ہوں اور وہ ملک کے سیاسی امور میں حصہ لینے کے مجاز ہوں۔ سیاسی آزادی سے مراد حسنِ فکر وعمل، حسنِ اظہار وابلاغ اور حسنِ اکتساب کی آزادی ہے؛ اور اس کا فقدان عدل کے فقدان اور اس امر پر غمازی کرتا ہے کہ حکومت سرطانی ہے؛ یعنی اس پر فرعونی وہامانی اور قارونی وآزری سرطانوں کا تصرف ہے، جو مستبد ومطلق العنان اور ظالم وخون آشام ہوتے ہیں، لیکن خرقۂ سالوس پہن کر

اپنے آپ کو عادل و منصف اور رعایا کے دوست و بہی خواہ اور حامی و محافظ ظاہر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حکومت میں سیاسی عدل بجز رشوت و سفارش کے عوام کو مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ چنانچہ جس طرح ظلمتِ شب میں دھوپ کی توقع عبث ہے، اسی طرح سرطانی حکومت کی ظلمتوں میں عدل و احسان کی روشنی کی امید رکھنا لاحاصل ہے۔ سیاسی آزادی سے مفصل بحث آگے آئے گی۔

قرآن و سنّہ اور تاریخ و آثار اس حقیقت کے شواہد ہیں کہ اسلام سیاسی عدل و آزادی کا بے مثال نقیب و علمبردار ہے، لیکن یہ کتنی شرم ناک و عبرت ناک واقعیت ہے کہ پاکستان سمیت جملہ مسلم ممالک میں سیاسی عدل و آزادی کا قریب قریب فقدان ہے۔ یہ ظلم ہے جس کے نتیجے میں مسلم اقوام بین الاقوامی عدل سے محروم اور اغیار کی محکوم و دست نگر ہیں۔

ثقافتی عدل کی اساسی مقتضیاتِ خمسہ مُفصّلۂ ذیل ہیں: (۱) تکریم انسانی (۲) اخوت (۳) مساوات (۴) سیر و سیاحت اور (۵) حُسنِ اظہار و ابلاغ کی آزادی۔ ان کی فرداً فرداً مجمل طور سے صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ تکریم انسانی:[۲۸] عدل کا تقاضا ہے کہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی کو مکرم سمجھا جائے اور تکریم انسانی کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے؛ اس لیے کہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی۔تدریجی تخلیقی فعلیت[۲۹] کے شاہکار، عیال اور مربوب ہیں؛ نیز وہ نسلاً و اصلاً ایک اور ہم جنس ہیں۔ اس اعتبار سے سب بنی آدم ایک ہی ہیں تو عدل کی رو سے سبھی تکریم کے مستحق ہوئے؛ لہٰذا تکریمِ انسانی کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا لازمی ہوا۔ یہ ہے ربّ العالمین کا حکم، لیکن پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہنود تو مذہبًا شودروں کو ذلیل و حقیر، پلید اور اچھوت سمجھتے ہیں، لیکن پاکستان میں بالخصوص اور اکثر مسلم ممالک میں بالعموم احکامِ الٰہی کے برعکس محنت کشوں، مزارعوں، اجیروں، ملازموں، معذوروں، بیواؤں، یتیموں اور دست نگر و مفلس لوگوں کو ذلیل و حقیر سمجھا جاتا ہے اور مرفہ الحال لوگ ان کی تکریم کرنے کو اپنی کسرِ شان بلکہ توہین خیال کرتے ہیں اور ان سے شودروں ایسا سلوک کرتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ہم کیوں بنی نوعِ انسان کی تذلیل و تحقیر کر کے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ایسا گناہِ کبیرہ کرتے ہیں؟ اس سوال

کا یہ تھا سادا، سچا اور مختصر جواب یہ ہے کہ ہم معاشرتی سرطانوں کی "خدائی" میں رہتے ہیں۔ وڈیرے ہوں یا سردار، خوانین ہوں یا جاگیردار و زمیندار، سرمایہ دار ہوں یا سرمایہ کار، آجر ہوں یا حکام، مشائخ ہوں یا پیشوا، فرعونی حکومت میں اللہ تعالیٰ کے بندوں پر "خدائی" کرتے ہیں، انھیں ذلیل و حقیر، خادم و فرماں بردار اور اپنے آپ کو معزز و محترم اور مخدوم و مطاع سمجھتے ہیں۔ یہ فرعونی و خدائی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا نتیجہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ جو عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور تکریمِ انسانی کے لیے مشہورِ زمانہ اور اقوامِ عالم کے لیے قابلِ رشک تھی، آج ان جمالیاتی۔ اخلاقی اقدار کو ترک کر کے رسوائے زمانہ ہے؛ نیز اس ترکِ اقدار کے نتیجے میں مختلف طبقات میں منقسم ہو چکی ہے اور طبقاتی تضاد و منافقشت نے قومی و ملّی اتحاد و تشخص اور یکجہتی و ہم آہنگی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ چونکہ معاشرتی سرطانیت و ناانصافی لازم و ملزوم ہیں؛ لہٰذا سرطانی معاشرے میں ثقافتی عدل کا فقدان ایک "عمرانی عمل" ہے، جو انسانیت اور اس کے سب سے بڑے نقیب و علمبردار اسلام کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے اور اس کا مداوا حسنِ انقلاب ہے۔

۲-۳، اخوت و مساوات: اسلام کی رُو سے ثقافتی عدل اخوت و مساوات کو چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں اخوت و مساوات ایمان کا تقاضا بھی ہے اور حاصل بھی، لہٰذا یہ اقدار اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایمان کی قوتِ جذب و انجذاب کے سبب اہلِ ایمان اپنے آپ کو ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرتے اور اپنا جیسا سمجھتے ہیں؛ بالفاظِ دیگر، وہ اپنے آپ کو بڑا، نہ دوسروں کو چھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید کی رُو سے ایسا سمجھنا تکبر ہے جو عزازیل کی طرح انسان کو بھی ذلیل و خوار اور راندۂ درگاہ کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس معاشرے میں انسان کی تکریم نہیں کی جاتی، بلکہ اس کی تذلیل و تحقیر کی جاتی ہے، وہ اسلامی ہوتا ہے نہ انسانی، بلکہ شیطانی۔ سرطانی ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارا پاکستانی معاشرہ سرطان زدہ ہے، اس لیے اس میں انسان کی جس قدر تذلیل و تحقیر کی جاتی ہے، ہندوستان کے سوا شاید ہی کہیں ہوتی ہو؛ نیز سرطان زدگی کے باعث یہ مختلف طبقوں اور فرقوں میں منقسم ہے، لہٰذا اس میں اخوت و مساوات کا فقدان ہے اور ہونا بھی

چاہیے کہ یہ معاشرتی سرطانیت کا خاصّہ ہے، جس کے استیصال کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہے۔

۴۔ سیر و سیاحت کی آزادی: عدلِ انسانی کی رُو سے کُل افرادِ نسلِ انسانی کو اُن کے الٰہ و ربّ کی دُنیا میں سیر و سیاحت بالحق ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو حکومت سیر و سیاحت کرنے پر قدغن لگاتی ہے، وہ لوگوں پر ظلم کرتی ہے۔ سیر و سیاحت کی سہولتیں فراہم کرنا ایک صالح و عادل حکومت کا فریضہ ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں لوگوں کی سیر و سیاحت کرنے کی تلقین کرتا ہے' اور اس سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں' ان میں سے چند ایک یہ ہیں؛

سیاحت بالحق سے قوموں کے ثقافتی مزاج، تہذیب و تمدّن، معاشرتی، سیاسی، جغرافیائی اور معاشی احوال و ظروف، نیز تاریخی عمل کے حقائق سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس سے عبرت حاصل کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ علاوہ بریں سیر و سیاحت سے مُلک مُلک، شہر شہر، قریہ قریہ اور صحرا صحرا کے جمیل و جلیل مناظر اور حسین نظّاروں سے جمالیاتی ذوق میں وسعت و بوقلمونی بھی پیدا ہوتی اور اس کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ یہ حسد و عصبیت اور مغائرت و بیگانگی کو دُور کرنے اور یکجہتی و ہم آہنگی، نیز خیرسگالی و مفاہمت اور فکر و نظر میں وسعت و پہنائی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

پاکستان میں سیر و سیاحت پر بے جا قدغن تو نہیں ہے، البتہ سہولتیں ایسی نہیں ہیں جیسی ہونی چاہئیں؛ سب سے بڑھ کر یہ کہ آبادی کے بیشتر حصّے کو مالی وسائل کے فقدان کے سبب سیر و سیاحت کرنے کے مواقع ہی میسر نہیں۔ جہاں تک سرمایہ دار لوگوں کا تعلق ہے، وہ سیر و سیاحت کرتے بھی ہیں تو محض عیش و عشرت کی خاطر، لہٰذا ان کی سیاحت بالحق نہیں ہوتی۔ مقصود لہو و لعب ہو تو "جمالیاتی ثروت" کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سرطانیت اور جمالیاتی ثروت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اجتماعِ ضدین محال ہے۔ ہماری قوم سیر و سیاحت کے فیوض و برکات سے بہت حد تک محروم ہے اور اس کا سبب ہمارا معاشی نظام ہے جو سرطانی ہے۔ اس سرطانی نظام کی وجہ سے عوام کو اوّل تو کشمکشِ حیات سے فراغت ہی نہیں ملتی، دوسرے فراغت ملتی بھی ہے تو زادِ راہ میسر نہیں آتا۔ الغرض، مفلوک الحالی، جو سرطانی نظام کی پیداوار ہے، اس نے قوم کی آرزوئے سیر و سیاحت کو ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی

خواہشِ شدید کے تلے اس طرح دبا دیا ہے، جیسے کوئی دانہ رُوئیدہ کو سنگِ گراں کے نیچے دبا دے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ اسے جھٹلانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تو پھر ہماری اس محرومی کا ایک ہی مداوا ہے اور وہ ہے سرطانی نظام کا استیصال، جس کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہے۔

۵۔ **حُسنِ بیان و ابلاغ کی آزادی** بھی مقتضیاتِ عدل میں سے ہے۔ انسان کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ ربِّ کریم نے اسے نطق و قلم کے ذریعے بیان سکھایا ہے۔[۳۵] بیان ایسی نعمتِ عُظمیٰ ہے جو وجہِ شرفِ انسانی اور انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز ہے؛ لٰہذا تہدید و تخویف اور جبر و اکراہ سے اس نعمت کو سلب کرنا، انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کرنے اور اُسے بے زبان حیوان بنانے کے مترادف ہے، اور یہ ظلم و جرم ہے۔ اس ظلم کی نمود پاکستان سمیت قریب قریب سب مسلم ممالک میں صاف دکھائی دیتی ہے، حالانکہ مسلم اقوام قرآنِ مجید پر ایمان رکھنے کی مدّعی ہیں۔

اسلام آزادیِ بیان کو انسان کا فطری حق تسلیم کرتا ہے اور اس کا سب سے بڑا نقیب و علمبردار ہے۔ چنانچہ انسان کو نطق و قلم کے ذریعے اپنے عقائد و نظریات، افکار و تخیلات اور جذبات و احساسات کے حسنِ بیان و ابلاغ کی آزادی ہونی چاہیے۔ حُسنِ بیان کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قلم و نطق جو بیان کریں وہ صورت و معنیٰ اور اسلوب کے اعتبار سے حسین ہونا چاہیے۔ آزادیِ بیان ہر حال میں حسن سے مشروط ہونی چاہیے تاکہ کسی بات سے کسی کی دل آزاری ہو نہ جمالیاتی ذوق پر گراں گزرے۔ علاوہ ازیں وہ غارتگرِ ایمان و آگہی ہو نہ رہزنِ تمکین و ہوش؛ نیز وہ مخربِ الاخلاق ہو نہ سارقِ اقدارِ حسن۔ بہر حال، حُسنِ آزادیِ بیان ہر فردِ بشر کا انسانی حق ہے، جو اسے ملنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ آزادیِ حُسنِ بیان اسلام کے ثقافتی عدل کا مقتضا اور اسلامی معاشرے کی پہچان اور خصوصیّت ہے۔

یہ حقیقت ہے جسے فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آزادیِ حُسنِ بیان کے بغیر قوم پہلے گونگی، پھر بہری اور اندھی ہو جاتی ہے، اور ایسی قوم کی حیثیت دُنیا کی "آزاد" اقوام میں ایسی ہوتی ہے جیسی ناطق و بینا اور ترقی یافتہ انسانوں میں گونگے، بہرے اور اندھے لوگوں کی حیثیت ہوتی ہے جو عموماً محتاج و دست نگر اور پسماندہ و لاچار ہوتے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ قوم کو آزادیِ حسنِ بیان سے محروم کرنا، دراصل اُسے

محکوم وغلام، پس ماندہ و واماندہ، لاچار و بے بس اور محتاج و دست نگر بنانا ہے، اور یہ ظلم عظیم ہے جو عموماً سرطانی معاشروں میں روا رکھا جاتا ہے۔ معاشرتی سرطان اگر اپنی قوت و سطوت اور جبر و اکراہ سے لوگوں کو آزادیٔ حسن و بیان سے محروم کرتے ہیں تو اپنی سحرکاری سرطانیت سے ان کی آرزوئے آزادیٔ بیان کو بے جان بنا دیتے ہیں۔ یہ انسانیت کا عبرت انگیز المیہ ہے۔

یہاں یہ خیال انگیز سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام انسان کی آزادیٔ حسنِ بیان کو تسلیم کرتا اور اسے ربِّ کریم کی نعمتِ حسنیٰ قرار دیتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے مسلم حکومتوں نے رعایا کو آزادیٔ حُسنِ بیان سے محروم کر رکھا ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے کہ اس کی علّت معاشرتی سرطانیت ہے۔ پاکستان میں جہاں جہاں وڈیروں، سرداروں، جاگیرداروں، خوانین، بڑے بڑے زمینداروں، سرمایہ داروں اور آزروں کی عملداری ہے، وہاں کسی فرد کو تابِ سخن ہے نہ مجالِ گویائی۔ یوں بھی اسلام کے اس "قلعے" میں محبوس لوگوں کے نطق و قلم پر پہرے بیٹھے ہیں۔ حق و حق کی بات ہو تو معاشرتی سرطان تڑپ اُٹھتے ہیں، اس لیے کہ ان کے دل اس کے حریف نہیں ہو سکتے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ معاشرتی سرطانیت کا علاج کیا ہے؟ اس از بس اہم سوال کا جواب جو میرے عمر بھر کے "تدبّر فی القرآن، مطالعۂ تاریخ اور مشاہدۂ عصر کا ماحصل ہے، یہ ہے کہ معاشرتی سرطانیت لادوا مرض ہے۔ لہٰذا اس کا علاج "اصلاح" نہیں، استیصال بالجراحتِ میحائی ہے، اور اس کا ذریعہ موضوعی یعنی حُسنِ انقلاب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے محروم و مظلوم لوگوں کے دلوں میں آزادیٔ حُسنِ بیان و انقلاب کی آرزو پیدا کی جائے، پھر معاشرے میں حُسنِ انقلاب لانے کے لیے جہاد کیا جائے اور اس وقت تک کیا جائے جب تک سرطانیت کی بیخ کنی نہ ہو جائے اور معاشرہ حُکمِ الٰہی کی عملداری سے اخوّت و مساوات، محبّت و رحمت اور امن و سلامتی کی جنّت نہ بن جائے۔

اصل یہ ہے کہ جہاں تک حقوق العباد کا تعلّق ہے، آئینِ قرآن کی یہ شِق عدل و احسان قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایسی کسوٹی ہے، جس پر فرد و جماعت اور قوم کے نظریات و اعمال کے حُسن و قبح کی جانچ کی جا سکتی ہے، چاہے وہ کسی بھی شعبۂ حیات سے تعلّق رکھتے ہوں۔ بالفاظِ دِگر

اصولِ عدل و احسان ہر قسم کی اقدار (مثلاً جمالیاتی، اخلاقی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی وغیرہ وغیرہ) کی تشخیص و تعیین کا عالمگیر معیار ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ جس معاشرے میں قرآن حکیم کا آئینِ عدل و احسان نافذ نہ ہو یا ہو تو مؤثر انداز میں نہ ہو، وہ اسلامی کیا؟ انسانی معاشرہ کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ یہ اصل الاصول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس معاشرے کا نظام سودی۔ سرطانی ہو، اس میں عدلِ قرآنی نہیں ہو سکتا؛ اسے اسلامی سمجھنا یا کہنا، ظلم و جہل ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اجتماعی عدل و احسان حکومت کی ذمے داری ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جس معاشرے میں سود کاری ہوتی ہو اور لوگ عدل و احسان سے محروم ہوں یا حصولِ عدل دشوار و دیر طلب ہو تو اس ظلم و ناانصافی کی ذمے دار حکومت ہو گی اور وہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہ یاد رہے کہ کوئی حکمران یا حاکم مسئولیت سے مبرا نہیں اور سب اپنے اعمال کے لیے قابلِ مواخذہ ہیں۔ بہر حال سود ہر صورت اور ہر حال میں ظلم و حرام ہے، اس لیے کہ

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی تاسیس سودی سرمایہ کاری پر ہوتی ہے، اس لیے اس میں ظلم کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں مزارع اور محنت کش (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اپنے حقِ محنت سے بہت حد تک محروم اور مظلوم ہوتے ہیں، نیز اُن کی معیشت تنگ اور دُنیا تاریک و زنداں ہوتی ہے۔ ظُلم کے اثرات ان کی زندگی میں زہر گھولتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کا نفس سقیم و مردہ اور اس کے ساتھ ان کی شمعِ امید خاموش اور آرزوئے حُسن و زندگی مفلوج و مردہ ہو جاتی ہے۔

غور سے دیکھیں تو سرمایہ داری و سرمایہ کاری بُخل و سود ہی کی شکلیں ہیں، لہٰذا اس نظام میں سرمایہ داروں کے دلوں میں تکاثر کی شدت کے باعث قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ قساوت کے سبب دل میں محبت کے سوتے پھوٹنے نہیں پاتے، لہٰذا اس میں غمِ انسانیت و رحمت، ہمدردی و غم گساری، عدل و احسان اور ایثار و قربانی کے جذبات کی نشو و نما نہیں ہو پاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عصرِ حاضر کا انسان یاس و تنہائی کے کرب میں مبتلا ہے۔ انسان کی یاس و تنہائی، مظلومی و بیکسی اور حُسن و زندگی سے محرومی کا علاج

نظامِ سرمایہ داری و سود کاری کا استیصال ہے۔ لیکن جب تک معاشرے میں سرطانی طبقات موجود ہیں، نظامِ سرمایہ داری و سود کاری کو ختم نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اس نظام کی بیخ کنی و خاتمے کے لیے سرطانی طبقات کا استیصال بذریعہ حُسنِ انقلاب ناگزیر ہے۔

سرمایہ داری نظام کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی اساس عدل پر استوار ہے، جب کہ اس کے مخالف اسلام اور کمیونزم (یا اشتمالیت) کے نزدیک نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ظُلم پر رکھی گئی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس نظام کی اساس سود پر قائم ہے اور جس نظام کی اساس سود پر قائم ہو، اس پر عدل و احسان ہو ہی نہیں سکتا۔ سود تو بخل و شقاوت اور قساوتِ قلب کی علامت ہے۔ بہرحال، اِتمامِ حجّت کی خاطر ہم اس مسئلے کو ایک زندہ مثال کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے چار سرمایہ کار مشترکہ طور سے ایک کارخانہ لگاتے ہیں، جس میں ایک ہزار محنت کش کام کرتے ہیں۔ ان محنت کشوں کی اُجرتیں طلب و رسد کے غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ اصول کے مطابق مقرر کی گئی ہیں۔ دلیل کے طور پر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کارخانے سے دس کروڑ روپے سالانہ منافع ہوتا ہے، جس میں نصف کے قریب یا اس سے قدرے زائد ایک ہزار محنت کشوں میں تقسیم ہوتا ہے اور بقیہ چار پانچ کروڑ روپے چار سرمایہ کار یا معاشرتی سرطان لے جاتے ہیں۔ کیا کوئی عادل یا اہلِ عقلِ سلیم شخص اس تقسیمِ دولت کو منصفانہ کہہ سکتا ہے؟ کیا یہ تقسیمِ دولت ناجائز و ناروا اور غیر منصفانہ و ظالمانہ نہیں؟ ان کے ضمیر و عقلِ سلیم اور اسلام کے دینِ حنیف کا فتویٰ ہے کہ یہ تقسیمِ دولت مجرمانہ و ظالمانہ ہے۔ معاشرتی سرطانوں کی نسبت سے اس کیلئے ہم نے ”سرطانی تقسیمِ دولت“ کی تعبیر اختیار کی ہے۔

یہ درست ہے کہ محنت کشوں اور سرمایہ کاروں کے مابین تقسیمِ دولت کی شرح میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے، لیکن تفاوت ہمیشہ زمین و آسمان کا رہتا ہے اور اس کا ثبوت محنت کشوں اور سرمایہ کاروں کا معیارِ زندگی ہے؛ یعنی محنت کشوں کی بے سروسامانیاں اور سرمایہ داروں کے عشرت کدے ہیں؛ نیز سر بفلک عمارتوں کے شہروں میں پیدل چلنے والوں کی رہگزریں ہیں، جو رات کو مفلوک الحال محنت کشوں کے بے در و دیوار شبستان بن جاتے ہیں۔ خلیفۃُ الارض انسان کی اس زبوں حالی و محرومی پر ملائکہ ترس کھاتے

اور ان کے لیے دُعا مانگتے ہیں تو شیطان اپنی کامیابی پر قہقہے لگاتا ہے، جن کی گونج اُونچی عمارتوں تفریح گاہوں، عالی شان ہوٹلوں، بنگلوں اور ایوانوں میں سُنائی دیتی اور سود خوروں کے کانوں میں زہر گھولتی ہے۔

طیور آشیانوں میں، وحوش کچھاروں اور غاروں میں، حشرات الارض بلوں میں اور پالتو جانور اصطبلوں اور طویلوں میں زندگی کرتے اور رات کے مزے لیتے ہیں۔ بخلاف اس کے دولت آفرین و پیداکار محنت کشوں کو یہ سنگدل و سود خور سرطانی طبقے شب بسری کے لیے کہیں جھونپڑی بھی بنانے نہیں دیتے۔ گویا یہ زمین ربُ العالمین نے محنت کشوں کے لیے نہیں، سود خور بشری سرطانوں کے لیے بنائی ہے۔ وہ ان ضعیف و بیکس مظلوموں کو اس طرح زندگی کرنے پر مجبور کرتے ہیں، جیسے ان کا خدا ہی نہ ہو۔ بے در و دیوار شبستانوں میں سرما میں سردی، گرما میں گرمی اور برسات میں بارش اُنھیں لذتِ نیند سے آشنا نہیں ہونے دیتی۔ العرض لذتِ حیات دممات سے ناآشنا مفلوک الحال و مظلوم محنت کشوں کے دن محنتِ پیہم و کربِ مسلسل اور راتیں خوف و حزن اور یاس والم میں گزرتی ہیں، اور سورج نکلتے ہی اُنھیں اپنے نیم خوابی کے مارے تھکے ماندے جسموں، اداس دلوں اور ماؤف دماغوں کے ساتھ اپنا خون پسینہ ایک کرنے کی خاطر کولہو میں جُتنا پڑتا ہے تاکہ جسم و روح کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ زندگی واقعی ربِ ذوالجلال والاکرام کی نعمتِ عظمیٰ ہے، لیکن بہت کم اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔ حُسن سے محروم ہو کر بھی زندگی اس قدر دلکش و محبوب ہوتی ہے کہ انسان کو کرب و یاس میں رہنا تو گوارا ہوتا ہے، لیکن زندگی سے رشتہ منقطع کرنا منظور نہیں ہوتا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زندگی اپنے حُسن کے ساتھ کس قدر روح پرور و دلکش اور لذّت انگیز و سرور آفرین ہوگی۔ یہ اہلِ حُسن و سرور ہیں جو خود بھی لذتِ حُسنِ زندگی سے آشنا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے آشنا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ فرعون و ہامان اور آزر و قارون ہیں، جو خود بھی لذتِ حُسنِ زندگی سے محروم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے محروم کرتے اور رکھتے ہیں۔ یہی تو ان بشری سرطانوں کی علامت ہے۔

اس مسئلے کو واضح طور سے سمجھنے کی خاطر ہم پاکستان میں محنت و سرمایہ کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ یہ

سامنے کی بات ہے کہ اس "اسلامی" ملک میں مزارع اور محنت کش عمر بھر لذتِ حُسنِ زندگی سے آشنا نہیں ہوتے۔ ان میں بیشتر لباس، روٹی اور مکان کی حسرت لیے مر جاتے ہیں جنھیں کوئی کچا مکان میسر بھی آتا ہے تو وہ مغربی ممالک کی زنداں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ان کی معیشت اس قدر تنگ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ تو انھیں پیٹ بھر کر روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور رہنے کو جھونپڑی تک مہیا نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ وہ ان کو مہلک بیماریوں سے بچانے اور علاج معالجہ کرانے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتے۔ جو خود حُسنِ زندگی سے محروم ہوں وہ اپنی اولاد کو یہ نعمتیں کیسے دے سکتے ہیں؟ ان میں تو خود آرزوئے حُسن و زندگی مردہ ہو چکی ہوتی ہے، وہ اپنے بچوں میں اس آرزو کا اِحیاء کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ خود علم و ہنر کی روشنی و توانائی سے محروم ہوتے ہیں، اپنے بچوں کو یہ روشنی و توانائی کیسے دے سکتے ہیں؟ وہ تو خود بصورتِ بشر لدّو جانور ہوتے ہیں؛ بہرے، گونگے اور بے بصر بار کش حیوان؛ وہ اپنے بچوں کو "انسان" کیسے بنا سکتے ہیں؟ جو شخص تن کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو اور موت کے سائے میں زندگی کرنے پر مجبور ہو، اس کے دل میں علم و ہُنر اور حُسن و زندگی کی آرزو کا حال کچھ ایسا ہوتا ہے، جیسا زمین میں دانۂ روئیدہ کا حال، جو تہِ سنگِ گراں ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کا ذمے دار کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں انسان پیدا کیا ہے، لیکن اُنھیں حیوان بنانے والا کون ہے؟ ربِّ کریم نے اپنی نعمتیں جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے پیدا کی ہیں، لیکن محنت کشوں، غریبوں، اور مزارعوں کو ان سے محروم رکھنے والا کون ہے؟ پیداوار تو محنت کی مرہونِ منت ہوتی ہے، لیکن محنت کشوں کو پیداوار سے محروم رکھنے والا کون ہے؟

ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے:

سرمایہ کار: سود خور و بخیل اور معاشرتی سرطان

اس گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا اور انتہائی سنگدل و سفاک دشمن زمیندار و سرمایہ کار ہے، اور وہ ایسا مہلک معاشرتی سرطان ہے، جس کا استیصالِ کُلّی وقت کا تقاضا، انسانیت کا مقتضیٰ، ربِّ جلیل کی مشیّت اور افضل ترین جہاد ہے۔

۴۔ قانونِ سعی و اکتساب

قانونِ سعی و اکتساب آئینِ قرآن کی از بس اہم شق ہے اور قومی پیداوار یا دولت کی تقسیم کا یہ فطری اور اکمل و احسن اصول و معیار ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے ایجازِ بلاغت سے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، مثلاً

۱۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم ۵۳ : ۳۹)؛ اور انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر جیسی اور جتنی اس نے سعی و جہد کی۔

۲۔ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (المدثر ۷۴ : ۳۸)؛ ہر نفس اپنے اکتساب کے عوض رہن ہے۔

۳۔ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ (الطور ۵۲ : ۲۱)؛ ہر شخص اپنے اکتساب کے بدلے مرہون ہے۔

۴۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ (النسآء ۴ : ۳۲)؛ عورتوں کا اتنا حصّہ ہے جتنا وہ کمائیں اور مردوں کا اتنا حصّہ ہے جتنا وہ کمائیں۔

محوّلۂ بالا آیاتِ جلیلہ میں قومی پیداوار اور دولت کی تقسیم کا یہ اصل الاُصول بیان ہُوا ہے کہ "پیداواری عناصر یا محنت کشوں (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) میں سے ہر ایک کا حصّہ اس کی کوشش کے مطابق ہے۔"

یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ کوشش کا معیار ایک تو اس کی کمیت اور حاصل ہے اور دوسرا اس کی کیفیت ہے، جس کا تعلق زیادہ تر ذہنی صلاحیت و کاوش اور علم و تجربہ سے ہوتا ہے۔

محنت کشوں کی دو بڑی اصناف ہیں: بے ہنر (Unskilled) اور ہنرمند (Skilled)

بے ہنر محنت کشوں کی محنت و سعی جسمانی ہوتی ہے، جب کہ ہُنرمند محنت کشوں کی محنت و کوشش ذہنی۔ جسمانی ہوتی ہے، لہٰذا کیفیت و کمیت اور حاصل کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور اسی نسبت سے قومی پیداوار میں اس کا حصّہ ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ کوشش بھی شامل ہوتی ہے جو اس نے اکتسابِ ہنر میں کی تھی۔ جسمانی کوشش میں کاوشِ ذہنی کا عنصر شامل ہو جانے میں ایک تو پیداوار

زیادہ ہو جاتی ہے، دوسرے مصنوعات کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان سے منافع زیادہ حاصل ہوگا، لہٰذا اس نسبت سے ہنر مند محنت کشوں کا حصّہ بے ہنر مند محنت کشوں سے زیادہ ہوگا اور عدل کی رُو سے ہونا بھی چاہیے۔ چنانچہ تقسیم پیداوار میں سعی و اکتساب کی کیفیت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا اور اس کیفیت کی تشخیص و تعیین علم و تجربہ اور ہنروری و کمال کی نوعیت کی رعایت سے کرنا ہوگی۔ علاوہ ازیں، اس اصول کے ساتھ حسنِ ضرورت و احسان کے اصولوں کو اپنانا بھی لازمی ہے۔

طلب و رسد کا ظالمانہ اُصول

نظامِ سرمایہ کاری کی بنیاد ظُلم پر استوار ہے اور اس کا ثبوت اس کا طلب و رسد کا ظالمانہ اُصول ہے جس کے مطابق محنت کشوں اور مزارعوں کو محنتانہ دیا جاتا ہے۔ سرمایہ کاروں اور زمینداروں نے یہ اصول محنت کشوں کا استحصال کرنے کی خاطر وضع کیا ہے، جو غیر منصفانہ، ظالمانہ اور اسلام کے قانونِ عدل و احسان کے منافی ہے؛ نیز یہ کہ اس کے قانونِ سعی و اکتساب کا نقیض ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرمایہ کار، جو حقیقت میں سود خور اور معاشرتی سرطان ہیں، اُنھوں نے اپنے نظامِ سرمایہ کاری کا ہیولیٰ اس طرح تیار کیا ہے کہ اس میں ظُلم کی صورت مضمر ہو گئی ہے، جس طرح بجلی کے تاروں میں برقی رو جاری و ساری ہوتی ہے، مگر دکھائی نہیں دیتی۔ اس مماثلت کے باوصف ان میں ایک بنیادی فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بجلی گھر میں بجلی اس لیے پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے لوگوں کو روشنی و توانائی مہیا کی جائے۔ بخلاف اس کے کارخانوں میں دولت پیدا تو محنت کشوں کے خون اور پسینے سے کی جاتی ہے، مگر اس کا بیشتر حصّہ سرمایہ کار اپنے سرمائے کے عوض لے جاتے ہیں، جو سود ہے، اور بقیہ محنت کشوں میں اس طرح تقسیم ہوتا ہے، جیسے صدقہ و خیرات تقسیم کی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت معاشرتی سرطانوں کے چند گھرانوں میں سمٹتی چلی جاتی ہے اور وہیں گردش کرتی رہتی ہے اور دولت آفرین گھرانے مفلوک الحال اور زندگی کے حُسن و نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ظُلم نہیں؟ اگر یہ معاشرتی ناانصافی اور فساد" نہیں تو پھر کیا ہے؟ چنانچہ قدرت کے قانونِ مجازات

کی رُو سے اس معاشرتی فساد و معاشی ظلم کا بدلہ سرمایہ کاروں کو بھی ملتا ہے۔ ایک تو خود ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے؛ دوسرے ان کا قلب اپنے نور سے محروم ہو کر اندھا ہو جاتا ہے اور تیسرے ان کے اندر خوف و حزن کی آگ لگ جاتی ہے، جو اُنھیں لذّتِ حسنِ حیات سے محروم کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں، ان کے ظُلم کا بدلہ اُنھیں مرنے کے بعد روزِ حساب ملے گا۔

چونکہ نظامِ سرمایہ داری میں دولت کا بہاؤ سرمایہ کاروں کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا مفلوک الحال و حاجت مند محنت کش روزگار کے لیے سرمایہ کاروں کے محتاج و دست نگر ہو جاتے ہیں اور سرمایہ کار ان کی احتیاج و دست نگری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور قرآنِ حکیم کے فطری اُصولوں کو پسِ پُشت ڈال کر طلب و رسد کے غیر منصفانہ و استحصالی اُصول کے مطابق ان کی اُجرت مقرر کرتے ہیں محنت کشوں کی تعداد زیادہ اور روزگار کے مواقع نسبتاً کم ہونے کے سبب، نیز قوتِ لایموت حاصل کرنے اور دیگر فوری نوعیت کی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر ان میں مسابقت زیادہ ہو جاتی ہے؛ اس کے نتیجے میں ان کی رسد بہ نسبت ان کی مانگ کے زیادہ ہو جاتی ہے اور اصولِ طلب و رسد کی رُو سے وہ اپنے حقوق سے محروم اور کم سے کم محنتانہ قبول کرنے پر بادلِ نخواستہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس "مجبوری" سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا نام اصولِ طلب و رسد ہے، جو حقیقت میں قارونی اُصول ہے۔

سود یا سود کاری کیا ہے؟ یہ مال و جاہ دولت کے ذریعے دوسروں کی "معاشی مجبوری" سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہی تو ہے۔ اسی طرح سرمایہ کاری کا موجودہ نظام بھی محنت کشوں اور مزارعوں کی معاشی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہی تو ہے، جس کا دوسرا نام استحصال ہے اور جو ناانصافی اور ظُلم ہے۔ ظاہر ہے ایسا نظام کسی عنوان اسلامی نہیں ہو سکتا" اور نہ ہے؛ لہٰذا اس استحصالی معاشی نظام کا استیصال وقت کا اہم ترین تقاضا اور اُمّتِ مُسلمہ کا اوّلین فریضہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسا کیے بغیر معاشرے میں اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے نہ اس کی اصلاح ہی ہو سکتی ہے؛ نیز اس میں اتفاق و اتحاد، اخوّت و یگانگت، آزادی و مساوات اور امن و سلامتی کی فضا بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ

ہے، اس لیے کہ اس کے جھٹلانے کی ہمارے پاس کوئی وجہ جواز نہیں تو پھر محسنِ انقلاب کی فوری ضرورت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے سعی و اکتساب کو قومی پیداوار یا دولت کی تقسیم کا اصول یا معیار قرار دیا ہے، جو اس کے اصولِ عدل کے عین مطابق ہے، لہٰذا اس واضح اور قطعی اصول کی رُو سے "سرمایۂ العفو" یا ضرورت سے زائد سرمائے کا پیداوار میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسا سرمایہ "العفو" ہونے کے باعث قوم کا حق یا حصہ ہوتا ہے اور اس کا انفاق بالحق فرض ہوتا ہے، جس کی ایک صورت اسے بیت المال یا خزانۂ عامرہ میں جمع کرانا ہے اور دوسری صورت ملک کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے مزید کاروبار کرنا، کارخانے لگانا یا صنعت کاری کرنا ہے۔ علاوہ بریں اس کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بہرحال، اس کی کوئی صورت کیوں نہ ہو، اس پر منافع لینا سود خوری ہے، جو حرام ہے۔

یہاں اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ سرمایہ کاری اگر آئینِ قرآن کے مطابق کی جائے تو جائز ہے۔ ظاہر ہے ایسی سرمایہ کاری سے سرمایہ کار اپنی سعی و اکتساب کی نوعیت کے مطابق منافع حاصل کرنے کا مجاز تو ہے مگر اپنے سرمائے کے عوض منافع لینے کا حق دار نہیں، اس لیے کہ سرمائے کے عوض نفع لینا سود یا ربوٰ ہوتا ہے، جو اسلام میں حرام ہے۔

۵۔ ملکیتِ الٰہی و متاعِ انسانی

آئینِ قرآن کی ایک ازبس اہم شق یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور متاعِ انسانی ہے (یونس ۱۰: ۶۶، اور البقرۃ ۲: ۳۶)۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین اور ان میں جملہ اشیاء کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہے کہ ان اشیاء کا مالک کوئی فرد، جماعت یا قوم نہیں ہے۔ دوسرے، یہ سب اشیاء ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتیں ہیں جو اُس نے جملہ افرادِ نسلِ انسانی کی تمتع و استفادے کے لیے پیدا کی ہیں، لہٰذا کوئی فرد، قوم یا قبیلہ ان کا مالک ہے

نہ ہو ہی سکتا ہے۔ جو لوگ جائز طریق سے اُنھیں حاصل کرتے ہیں، وہ ان کے صرف "امین" ہوتے ہیں اور ان سے حسبِ ضرورت تمتع کر سکتے ہیں، لیکن وہ احتکار و اکتناز، نہ اسراف و تبذیر ہی کر سکتے ہیں۔

اگر یہ آئینِ قرآن ہے اور یقیناً ہے جیسا کہ خود قرآنِ حکیم سے ثابت ہے اور اس کی ایک عملی شہادت ہمیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبہ میں ملتی ہے تو پھر اسے اپنے ملک میں نافذ نہ کرنا اور اس پر عمل درآمد نہ کرانا، اسے دل سے تسلیم نہ کرنے اور اس کا عملاً انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ حکمِ الٰہی یا آئینِ قرآن دو ایک ممالک کے سوا کسی مسلم ملک میں نافذ نہیں اور اس وقت تک نافذ بھی نہیں ہو سکتا جب تک ان ممالک میں معاشرتی سرطانوں کی عمل داری ہے۔ اس اعتبار سے ہم ایسے مسلمان ہیں جو کلمہ تو پڑھتے ہیں، لیکن ایمان کو جزوِ زندگی بناتے ہیں نہ اس کے مطابق فکر و عمل ہی کرتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مندرجۂ ذیل ارشادات کے ہم ہی مصداق ہیں:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (النسآء ۴: ۱۳۶): اے لوگو جو ایمان لائے ہو سچ مچ لاؤ۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (البقرہ ۲: ۲۰۸): اے مسلمانو! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقوشِ قدم پر نہ چلو۔ وہ تو تمھارا صاف دشمن ہے۔

محوّلۂ بالا دونوں نصوصِ قرانی اس آئینِ قرآن کی آئینہ دار ہیں کہ اسلام قولاً و فعلاً مکمل اطاعت کا متقاضی ہے، لہٰذا کوئی قوم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتی جب تک اسلام کے آئین اور اس کے جملہ قوانین کو قولاً و فعلاً تسلیم نہیں کرتی اور ان کے مطابق عمل نہیں کرتی۔ ان نصوصِ قرآنی کی رُو سے ثابت ہوا کہ ہم نہ تو پورے طور سے اسلام میں داخل ہیں اور نہ حقیقت میں مومن ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ ایک تو اسلامی نہیں، دوسرے سرطانی ہے اور تیسرے سرطان زدہ ہونے کے باعث تقویٰ و صداقت، امانت و دیانت، عدل و احسان، جمال و جلال، قوت و توانائی، اخوت و محبت، حریت و مساوات، آزادی و عزت اور آرزوئے حسن و حیات سے محروم اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اہلِ نظر یہ صورتِ حال دیکھ کر پوچھتے ہیں:

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں ؟

اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے : علاج اس کا معاشرتی سرطانوں کا اِستیصال بذریعہ حُسنِ انقلاب ہے !

اگر ہم بحیثیتِ مسلمان قرآنِ مجید کے اس معاشی اصل الاصول کو تسلیم کر لیں کہ کائنات میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور ہماری محض متاع ہے تو پھر یہ اصول اُمّتِ مُسلمہ میں متنازع فیہ مسائل کو حل کرنے میں از بس اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ہماری مشکل اور وجہِ محرومی یہ ہے کہ قریب قریب سب مسلم اقوام سرطان زدہ ہیں اور سرطانی طبقے کسی حال میں اس آئینِ قرآن کو دل سے تسلیم نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ایسا کرنے سے "قارونی" باقی نہیں رہ سکتی، اور "قارونی" نہ رہے تو ان کا زندہ رہنا محال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "قارونی" ہی ان استحصالی۔ سرطانی طبقات کا اِلٰہ یعنی مطلوب و مقصود ہے۔

اس جگہ اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اسلام میں اسراف و تبذیر اور اکتناز و بُخل کی ممانعت کی علّتِ غائی ملکیتِ الٰہی و متاعِ انسانی کا قانونِ قرآن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے نفس و بدن اور بیوی بچّوں کو مجروح و ہلاک کرنے کا شرعاً مجاز نہیں، اسی طرح اُسے اپنے مال و دولت کو ضائع کرنے کی اجازت نہیں، اس لیے کہ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک اور مُعطی و وہاب ربِّ حکیم و قدیر ہے۔ انسان جو کچھ کماتا یا حاصل کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ قوتوں اور وسائل کے ذریعے ایسا کرتا ہے، لہٰذا اسلام کی رُو سے وہ اس کا مالک نہیں امین ہے اور اُسے مالکِ حقیقی کے احکام کے مطابق ہی صرف کر سکتا ہے، لیکن حسنِ ضرورت سے زائد مال جمع نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا اصطلاحِ قرآنی میں اکتناز، بُخل اور جمعِ مال کہلاتا ہے، جو حرام ہے۔ اس کا نتیجہ تکاثر کی صورت میں نکلتا ہے، جو "قارونیت" کا خاصّہ ہے۔

حواشی

۱۔ قرآن قولِ فیصل و حرفِ آخر ہے، دیکھیے البقرہ ۲ : ۱۸۵؛ آلِ عمران ۳ : ۴؛ الدّخان ۴۴:

۴؛ اور الطارق ۸۶ : ۱۳ و بمواضع کثیرہ۔

۲۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ : دیکھیے محمد، ۴۷ : ۱۹ و بمواضع کثیرہ۔

۳۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ : دیکھیے الانعام ۶ : ۵۷؛ یوسف ۱۲ : ۴۰، ۶۷۔

۴۔ معروضِ حسن و پرستش : (Object of beauty and worship)

۵۔ شرک گناہ و ظلم عظیم ہے : النسآء ۴ : ۴۸ و لقمٰن ۳۱ : ۱۳۔

۶۔ مشرک پر جنّت حرام ہے : المائدۃ ۵ : ۷۲۔

۷۔ جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ : (Aesthetic–psychological moment) اس سے مراد ایسا لمحہ ہے جو نفسِ انسانی میں حسین انقلاب لائے اور اس کی قبیح نفسیاتی کیفیات و خواہشات کو جمالیاتی نفسیاتی کیفیات اور حسین آرزوؤں میں بدل ڈالے۔ حسین آرزوؤں سے مراد اپنے الٰہِ حقیقی کے قرب و حضور اور دید و رضوان، نیز حسن و زندگی اور حسنہ و خیر کی آرزوئیں ہیں۔ ایسا جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحہ سمعی و بصری مشاہدے سے اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے، جب قلب میں اثر پذیری کی اضطراری طور سے استعداد موجود ہوتی ہے۔

۸۔ جمالیاتی حِس : (Aesthetic sense)

۹۔ جمالیاتی و اخلاقی اقدار : (Aesthetic and ethical values)

۱۰۔ جمالیاتی۔ تخلیقی فعلیّت : (Aesthetic creative activity)

۱۱۔ حُسنُ المآب و حسنِ مآب : یہ اصطلاحِ قرآنی ہے، جو اپنی ترکیب کے لحاظ سے ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز ہے اور جنّت کی دُنیا کے حوالے سے ماہیّتِ مختلفہ پر دلالت کرتا ہے۔ حسن المآب سے مراد جنت ہے اور چونکہ یہ الحیوان یعنی موت سے منزّہ و ناآشنا جہانِ حیات میں ہے، لہٰذا اس کے مادّے کی ماہیّت اس جہانِ موت و حیات، جسے دُنیا کہتے ہیں، مختلف ہونی چاہیے۔ قیاس چاہتا ہے کہ جنّت چونکہ حسنِ محض ہے، لہٰذا اُسے قبح و شر، خرابی و فساد اور اضمحلال و انحطاط سے منزّہ ہونا چاہیے۔ چونکہ اہلِ حسن و سُرور اس عالمِ ارضی میں اپنی حسین باطنی دُنیا

میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں، لہٰذا جنّت کا حسین جہان ان کا حُسن المآب یا حسین گھر ہوگا۔ (دیکھیے آلِ عمران ۳: ۱۴؛ صٓ ۳۸: ۲۵)۔

۱۲۔ شرّ مآب: یہ بھی مصطلحۂ قرآنی ہے جو حُسن المآب کی ضد اور زوجِ قبیح ہے۔ یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق کا زوج بنایا ہے۔ بہرحال، چونکہ اشرار کی باطنی دُنیا قبیح و شر انگیز ہوتی ہے اور وہ سَمندرسرشت ہونے کے باعث اس میں زندگی کرنے کے خوگر ہو جاتے ہیں، لہٰذا جہنم ان کا شرمآب یعنی قبیح و شر انگیز گھر ہوگا (دیکھیے صٓ ۳۸: ۵)۔

۱۳۔ عدل و احسان: دیکھیے النّحل ۱۶: ۹۰؛ الحجرات ۴۹: ۹ و بمواضع کثیرہ۔

۱۴۔ پیش شرائط: (Pre-requisite)

۱۵۔ تمتّع: دیکھیے البقرۃ ۲: ۳۶؛ الاعراف ۷: ۲۴ و بمواضع کثیرہ۔

۱۶۔ العفو: دیکھیے البقرۃ ۲: ۲۱۹۔

۱۷۔ حقِ معلوم: دیکھیے المعارج ۷۰: ۲۴؛ نیز الاسراء ۱۷: ۲۶۔

۱۸۔ کفالتِ قومی: دیکھیے سورۃ الماعون ۱۰۷۔

۱۹۔ تکذیبِ دین: الماعون ۱۰۷: ۱ بعد۔

۲۰۔ دیکھیے ہود ۱۱: ۸۷۔

۲۱۔ الرّبٰو یا سود کی حرمت اور منفی اثرات، دیکھیے البقرہ ۲: ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۸؛ آلِ عمران ۳: ۱۳۰۔

۲۲۔ شہادت: اس کے احکام کے متعلق دیکھیے البقرہ ۲: ۲۴۰، ۲۸۲، ۲۸۳؛ المائدۃ ۵: ۱۰۶ و بمواضع کثیرہ۔

۲۳۔ المائدۃ ۵: ۸۔

۲۴۔ بخاری و مسلم۔

۲۵۔ دیکھیے النسآء ۴: ۳؛ نیز دیکھیے ۱۲۹۔

۲۶　آیاتِ مذکورہ بالا۔

۲۷　دیکھیے مصنف کی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخرؐ، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۲ء۔

۲۸۔ تکریمِ انسانی: الاسراء ۱۷:۷۰۔

۲۹۔ اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی۔ تزویجی تخلیقی فعلیّت: اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ وہ جو چیز پیدا کرتا ہے، ایک تو اُسے حسین اور دوسرے اُس کا جوڑا بناتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ احسن الخالقین کی ہر تخلیق حسین ہونے کے ساتھ اپنا زوج رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ذی روح یا بے جان چیز کی دو اصناف ہوتی ہیں: جمیلہ اور جلیلہ، صنفِ جمیلہ کو مادہ اور صنفِ جلیلہ کو نر کہتے ہیں۔

۳۰۔ سیر و سیاحت: دیکھیے الحج ۲۲:۴۶؛ فاطر ۳۵:۴۴؛ آلِ عمران ۳:۱۳۷؛ النمل ۲۷:۶۹ و بمواضع کثیرہ۔

۳۱۔ بیان: دیکھیے الرحمٰن ۵۵:۴۔

باب (۳)

اسلامی یا مثالی معاشرہ

اگرچہ قرآنِ مجید اور سیّد المرسلین و رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کی رُو سے اس دَور میں کسی بھی مسلم ملک میں اسلامی معاشرہ موجود نہیں، لیکن اس وقت کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں نے تاویل و تشہیر بالباطل کے ذریعے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ان کے معاشرے اسلامی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان جو خلافتِ راشدہ کے بعد تقریباً تیرہ سو سال سے اسلامی معاشرے کی دید و برکات سے محروم ہیں، ان میں بیشتر یہ باور کیے ہوئے ہیں کہ وہ واقعی اسلامی معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن وہ جو اہلِ نظر ہیں، جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ اور ابلیس کی جمالیاتی فریب کاری ہے، اور تشہیر و تاویل بالباطل اور عقلِ طاغوتی کی ایجاد ہے، جو پریس، سینما، ریڈیو، ٹیلی وژن، وی سی آر وغیرہ وغیرہ کی ایجادات سے انتہائی خطرناک اور عالمگیر بن گئی ہے۔ تشہیر بالباطل باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اس کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ "جھوٹ جتنا بڑا ہوگا اور جتنا زور سے اور بار بار بولا جائے گا، اتنا ہی زیادہ مؤثر و مرعوب کُن اور قابلِ قبول ہوگا"۔ اس تشہیر بالباطل کا سحر یہ ہے کہ سرطان زدہ اقوام فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کو معاشرتی سرطان ہی نہیں سمجھتیں؛ اس لیے مسلم اقوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی حکومتیں اور معاشرے اسلامی ہیں۔ الغرض، معاشرتی سرطانوں کی تشہیر بالباطل اور مسلمانوں کی قرآن و سُنّہ سے دوری و کم آگاہی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرطانی و صالح اور اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں رہے۔ بہرحال ایسے سادہ لوح و فریب خوردہ مسلمانوں کی غلط فہمی دُور کرنے اور انھیں قرآنِ مجید اور اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں اسلامی معاشرے کی اصلی شکل و صورت اور خط و خال دکھانے کی

ہم کوشش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسلامی یا مثالی معاشرے کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اس میں چار نظامِ حیات قائم ہی نہیں فعال بھی ہوتے ہیں:

(۱) نظامِ صلوٰۃ (۲) نظامِ زکوٰۃ (۳) نظامِ امر بالمعروف اور (۴) نظامِ نہی عن المنکر۔ اس سے پہلے کہ ان نظاموں سے فرداً فرداً گفتگو کی جائے، ثبوت کے طور پر متعلقہ نصِ قرآنی پیش کی جاتی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج ۲۲ : ۴۱): یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم دُنیا میں حکومت دیں (یا ملک میں اقتدار بخشیں) تو وہ صلوٰۃ کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور سب امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اسلامی معاشرے میں لوگوں کی نظری و علمی زندگی کیسی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی ہمیں آگاہ کر دیا ہے، لہٰذا سورۂ عصر میں اس کی بھی جھلک دیکھتے ہیں، جس طرح خوردبین کے ذریعے بیج میں بالقوہ موجود درخت کی جھلک دیکھ کر ماہرین سب کچھ دیکھ لیتے ہیں: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر ۱۰۳): عصر یعنی تاریخی عمل شاہد ہے کہ انسان بلاشبہ خسارے میں ہے، بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔

محولہ بالا آیات میں تاریخی عمل کے حوالے سے اس عمل کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فقط وہی معاشرہ زندگی کے زیانِ کُلّی (= مادّی و نفسی اور دُنیوی و اُخروی) سے محفوظ رہتا ہے، جس کے افراد مومن و صالح، صادق و صابر اور مُصلِح ہوتے ہیں۔ مُصلحین سے مُراد وہ لوگ ہیں جو صدق و صبر کی وعظ و نصیحت اور فحشا و منکر سے بچنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وہ تشہیرِ بالحق کرتے ہیں۔

سورۂ عصر و حج کی محولہ بالا آیات کا تقابلی مطالعہ کریں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی

ہے کہ اسلامی معاشرے میں لوگ مؤمن و صالح اور صاحبِ کردار و مُصلح ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں، ایمان کا تقاضا اقامتِ صلوٰۃ، عملِ صالح کا تقاضا ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف کا تقاضا حق و صبر کی تلقین باہمی اور اس اعتبار سے نہی عن المنکر کا تقاضا کذب و باطل اور بے صبری و کم ہمتی کے خلاف تشہیرِ حکیمانہ ہے۔ یہ آیاتِ جلیلہ اس اصل الاصول کی حامل ہیں کہ جس طرح ایمان و عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں؛ اسی طرح صلوٰۃ و زکوٰۃ لازم و ملزوم ہیں؛ نیز صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظاموں کی اساس پر اخلاق و تشہیر بالحق کے نظاموں کا قیام ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و صلوٰۃ، عملِ صالح و زکوٰۃ، اخلاق و تشہیر بالحق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام ایک ہی سلسلے کی لاینفک کڑیاں ہیں۔

یہ دیکھنے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی خاطر کہ مسلم ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص محولہ بالا اسلامی معاشرہ قائم ہے یا نہیں، اس کے خصائص کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

۱۔ ایمان و صلوٰۃ: یہ نکتہ ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اعمالِ صالحہ کی بنیاد ایمان ہے۔ اس اعتبار سے حیاتِ انسانی میں ایمان کی اہمیت اس سے بہت ہی زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ ایمان کی روح توحید اور اس کے عناصرِ امتزاجی پانچ ہیں (۱) اللہ تعالیٰ (۲) ملائکہ (۳) وحی و تنزیل یا کتبِ سماوی (۴) انبیاء و رسلؑ اور (۵) آخرت۔

۲۔ ایمان باللہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی کو آسمانوں اور زمین، نیز ان میں جملہ مخلوقات کا بلاشرکتِ غیرے خالق، رب اور الٰہ سمجھنا اور اس کی جملہ صفاتِ حسنہ پر ایقان و اذعان اور اعتقاد و اعتمادِ کامل رکھنا؛ نیز اس عقیدۂ توحید کو اپنی نظری و عملی زندگی میں اس طرح جذب کر لینا جس طرح نظامِ بدن خون کو جذب کر لیتا ہے۔ چنانچہ جس طرح خون اپنی متوازن گردش سے جسم کو صحت و توانائی، حُسن و زندگی اور رنگ و نور بخشتا اور اس کی نشو و نما کرتا ہے، اُسی طرح عقیدۂ توحید اپنی متوازن فعلیت سے نفسِ انسانی کو صحت مند و توانا، زندہ و فعّال اور حسین و منیر رکھتا اور اس کا نشو و ارتقا کرتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں غلو فی الدین حرام ہے۔ جس طرح خون کی گردش متوازن نہ رہے تو بدن فشارِ دم کی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے، اسی طرح غلو سے دین میں بدعات اور مشرکانہ رسوم پیدا

ہو جاتی ہیں، جو اس میں فساد برپا کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں اسلامی ممالک میں بیسیوں مذہبی فرقے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلم اقوام میں فقدانِ اتحاد اور تشتّت و افتراق کا ایک بنیادی محرک و عامل فرقہ پرستی ہے۔

ا۔ خالق ؛ بہر حال اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت پر صدقِ دل سے یقین کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ اسلام کی رُو سے اللہ تعالیٰ ایک فعّال ہستی ہے اور وہ زندہ بالذّات، علیم و حکیم، عزیز و قدیر، احسن الخالقین اور مدبّر الامور ہے۔ وہ حیات و ممات، زمان و مکان، دُنیا و آخرت، الغرض جملہ مخلوقات کا خالق و ربّ اور الٰہ ہے۔ اس کی رحمت کی طرح اس کا علم بھی کل اشیاء کو محیط ہے، لہٰذا وہ کلیات و جزئیات سب کا علم رکھتا اور نظامِ کائنات کو بلاشرکتِ غیرے چلاتا ہے۔ جس طرح وہ خود بے مثال و بے نظیر ہے اسی طرح وہ وحدہٗ لاشریک بھی ہے۔ اسلام کی یہ ایک امتیازی خوبی ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت سے متعلق ایک نہایت فکر انگیز و حسین بات کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی ہے اُسے حسین و زوجین بنایا ہے۔ زوجین کا مطلب ہے جوڑا، یعنی ؛ اور مادہ۔ قرآنِ حکیم کے اس علمی قول کی تصدیق اس دَور کی سائنس نے کی ہے، جو اس کی مصدِّق ہے۔ جمالیاتی زبان میں اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی۔ تزویجی ہوتی ہے، لہٰذا اس کی ہر تخلیق کا زوج ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی تنہا اللہ تعالیٰ ہی الواحد و یکتا ہے۔

ب۔ ربّ : اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہی نہیں، ربّ العالمین بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جملہ مخلوقات کو ان کی موزونی تقدیر کے مطابق رزق دیتا، ان کی نشو و نما کرتا اور انھیں جینے کا چلن سکھاتا ہے؛ نیز وہ سب کا مالک و آقا اور حاکم و بادشاہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیّت پر اعتقاد رکھنا اور اس اعتقاد کو اپنی زندگی میں خون کی طرح جذب کر لینا اور اس کے مطابق عمل کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا، ایمان کا جُزوِ لاینفک ہے۔

زبان سے تو سب اہلِ دین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے اور اس خوش فہمی میں بھی مبتلا بھی ہیں کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کو اپنا ربّ مانتے ہیں، حالانکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ بہت کم لوگ عملاً اللہ تعالیٰ کو اپنا ربّ مانتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رازق و پروردگار اور حاجت روا و مستجیب الدعوات مانتا ہو، وہ غیر اللہ کو ایسا نہیں مان سکتا؛ اس کو پکار سکتا نہ اس سے مرادیں مانگ ہی سکتا ہے؛ وہ اس کے

سامنے سربسجود نہیں ہو سکتا اور اس کے قصیدے نہیں پڑھ سکتا اور نہ اس کے بھجن ہی گا سکتا ہے۔ علاوہ بریں وہ نہ تو کسی مقدس ہستی کو اور نہ کسی فرعون، ہامان، قارون یا آزر کو اپنا رازق، داتا، غوث، دستگیر، حاجت روا اور مشکل کشا ہی سمجھ سکتا ہے۔ وہ خود بھی معاشرتی سرطان، سود خور، حرام کار، ظالم و مفت خور، رشتی د ندرانہ خور، نطق فروش و قلم فروش، جعلساز و قمار باز، عصمت و عزت فروش، بددیانت و خائن اور ضمیر فروش و قوم فروش نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کو اپنا ربّ یعنی مالک و آقا اور حاکم و بادشاہ ماننے والا اپنی رضا و رغبت سے کبھی کسی غیر اللہ کا بندہ و غلام یا معاون و مددگار نہیں بن سکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی غلامی قبول نہیں کر سکتا؛ نیز وہ آئینِ قرآن اور احکامِ الٰہی کے منافی قوانین و آئین کو دل سے تسلیم کر ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح جس شخص کا ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے، وہ اس کے بندوں کو، چاہے وہ محنت کش و مفلوک الحال ہوں یا مرفہ الحال، خواہ کسی رنگ و نسل، قوم و دین اور ملک و علاقے کے ہوں، چھوٹا اور اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھ سکتا، اور انھیں اپنا غلام و محکوم نہیں بنا سکتا۔ وہ نہ تو فرعون، ہامان، قارون یا آزر ہی بن سکتا ہے اور نہ اپنی مرضی کا کوئی قانون یا آئین ہی نافذ کر سکتا ہے، جو آئینِ قرآن کے منافی ہو۔ الغرض، وہ متکبر و ظالم نہیں ہو سکتا اور نہ محنت کشوں کا استحصال ہی کر سکتا ہے؛ نیز وہ کاہل و کام چور اور مفت خور رہ کر وجودِ معاشرہ کا سرطان نہیں بن سکتا۔

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے، کیونکہ اس کو جھٹلانے کی کوئی وجہِ جواز نہیں کہ ہمارے معاشرے میں توحیدِ ربوبیّت پر ایمانِ کامل رکھنے والے بہت کم اور اس کا عملاً انکار کرنے والے بہت زیادہ ہیں، اور اس میں معاشرتی سرطانوں کی علمبرداری و سطوت ہے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے نہ انسانی، بلکہ سرطانی ہے، اور اسے اسلامی بنانے پر ہماری دُنیوی و اُخروی فلاح منحصر ہے، نیز ہمارا معاشرہ سرطان زدہ ہے اور یہ لا دوا مرض ہے، لہٰذا اس کا علاج "جراحتِ مسیحائی" ہے، جس کے لیے ہم نے حسنِ انقلاب کی تعبیر اختیار کی ہے۔

ج۔ اِلٰہ : توحیدِ ربوبیّت کی طرح توحیدِ اُلوہیّت بھی ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ توحیدِ اُلوہیّت کا مطلب

ہے فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) ماننا، بنانا اور اس پر قائم و دائم رہنا۔ اسلامی معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی اس کا ربّ اور اِلٰہ ہوتا ہے؛ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے میں لوگوں نے بیسیوں اِلٰہ بنا رکھے ہیں، مثلاً اصنامِ نفسی و خارجی۔ اصنامِ نفسی سے مراد نفسیاتی خواہشات ہیں، جیسے جنس و خود نمائی، شہرت و قوّت، بُخل و تکاثُر اور حکومت و اقتدار وغیرہ وغیرہ۔ اصنامِ خارجی میں زر، زمین، زن، پیر و مزار اور اسمائے باطلہ اہم ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ ہمارا معاشرہ ان معبودانِ باطلہ کی وجہ سے مُشرکانہ و ملحدانہ ہے تو پھر ہمیں اس الحاد اور شرک و بُت پرستی کے عوامل و محرکات کا سُراغ لگانا ہوگا تاکہ ان کا اِستیصال کر کے اپنے معاشرے کو اسلامی بنایا جائے۔ قرآنِ مجید، تاریخ اور مشاہدہ اس حقیقت کے ناقابلِ تردید شواہد ہیں کہ اصنامِ نفسی و خارجی کے چار عوامل و محرکات ہیں: آذریت، قارونیت اور فرعونیت و ہامانیت۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان عناصرِ اربعہ کے اِستیصالِ کُلّی کے بغیر ہمارا معاشرہ شرک و بُت پرستی اور فحشاء و منکر کے مفاسد سے پاک و صاف ہو سکتا ہے، نہ اس میں امن و سلامتی اور توحیدِ اُلوہیت کا دَور دَورہ ہی ہو سکتا ہے؛ نیز ان معاشرتی سرطانوں کے اِستیصالِ کُلّی کا واحد علاج جراحتِ مسیحائی یا حسنِ انقلاب ہے۔

۲۔ **صلوٰۃ:** دین کی بنیاد ایمان اور رُکن صلوٰۃ ہے۔ چونکہ دین ایک زندہ و حرکی نظامِ زندگی سے عبارت ہے، لہٰذا صلوٰۃ بھی اس کا ایک اہم زندہ و حرکی ذیلی نظام ہے، جس کا مدار ایمان ہے۔ صلوٰۃ انسان کی مندرجۂ ذیل انفرادی و اجتماعی کیفیاتِ نفس اور رویہ جات پر دلالت کرتی ہے:

ا۔ **انفرادی کیفیاتِ نفس اور رویۂ زندگی:** ایمان و تقویٰ، محبتِ الٰہی اور آرزوئے حسن و زندگی۔

ب۔ **اجتماعی کیفیاتِ نفس اور رویہ جات:** (۱) **وحدتِ قبلہ:** اس سے مراد حیاتِ اجتماعیہ کی جہتِ واحدہ یا اُمتِ مسلمہ کی نظری و عملی زندگی کی راہ و منزلِ مقصود کی وحدت۔ (۲) **تنظیم:** اس کا مطلب ہے: اتحاد و اتفاق، اخوّت و مساوات، نظم و ضبط، آئینِ قرآن و سُنّتِ حسنہ کی متابعت۔

قرآنِ مجید اور سُنّتِ حسنہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو صلوٰۃ کا نظام قرآن و حکمت اور علومِ تازہ کی تعلیم بشمول سائنس و ٹیکنالوجی، اور تزکیۂ نفس یعنی اخلاق کی تحسین و تہذیب یا مکارمِ اخلاق کی تکمیل کا حسن و

اکمل ذریعہ اور اعمالِ صالحہ کا بہترین محرک و عامل ہے۔ اس نظام کی قیام گاہ مسجد ہے اور اسے حسنِ نیت کے ساتھ قائم کرنا اور احسن طریق سے چلانا حکومت و معاشرہ دونوں کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ نظامِ صلوٰۃ اسلامی معاشرے کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو اسلامی معاشرے میں مساجد ہوتی ہیں اور وہ متذکرہ بالا اجتماعی کیفیات کی مظہر ہوتی ہیں۔ دوسرے افرادِ معاشرہ صالح ہوتے ہیں، مفسد نہیں ہوتے۔ صالحیت کے مظاہر امن و سلامتی، عدل و احسان، اخوت و مساوات، آزادیِ فکر و عمل، محبت و رحمت، محنت کشی و صبر، ہمدردی و غمگساری، ایثار و قربانی اور تشہیر بالحق ہیں۔ برخلاف اس کے فساد کے مظاہر تشتت و افتراق، بد دیانتی و خیانت، فحشاء و منکر، ظلم و استحصال، نفاق و قوم فروشی، ناخواندگی و جہالت، کذب و کتمانِ حق، فقدانِ عدل و احسان، بخل و سود کاری ہیں۔ اس اعتبار سے سرطانیت کو صالحیت کی ضد و نقیض قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔

حاصلِ کلام یہ کہ اسلامی معاشرہ فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری خداؤں سے جو دراصل معاشرتی سرطان ہوتے ہیں، پاک و صاف ہوتا ہے؛ اور اس میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور تنہا وہی لوگوں کا رب ہوتا ہے اور اس میں زندگی آئینِ قرآن اور اسوۂ حسنہ کے مطابق بسر کی جاتی ہے۔

اب یہ ازبس اہم اور حل طلب سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ پاکستان سمیت دُنیا کے جملہ مسلم ممالک میں کوئی معاشرہ ایسا ہے جہاں متذکرۂ بالا نظامِ صلوٰۃ قائم ہو اور جو معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف ہو اور اس میں آئینِ قرآن نافذ ہو اور وہ صالح ہو؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ معلوم اور تسلیم کر لینے کے بعد کہ ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں سرطانی ہے، کیا بحیثیتِ مسلمان ہم پر فرض نہیں ہو جاتا کہ ہم اسے حسن انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف کرنے کے لیے جہاد کریں؟ یہ صورتِ حال یقیناً انتہائی تشویشناک اور جہاد کی متقاضی اور حسن انقلاب کی آرزومند ہے۔

۳۔ زکوٰۃ: صلوٰۃ کا تقاضا زکوٰۃ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صلوٰۃ انسان میں ایمان کے بیج کی پرورش کرتی اُسے تناور و بار آور درخت بناتی اور اس کے ثمرات سے دوسروں کو بھی فیض و افادہ پہنچانے کی تحریک کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صلوٰۃ ایک تو انسان کے جذبۂ محبتِ الٰہی کی اور دوسرے اس کے اس اعتقاد و ایقان

اور اعتراف و اظہار کی مظہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کُل مخلوقات کا رب ہے اور اس کی نعمتیں جملہ بنی نوع انسان کے تمتع و استفادے کے لیے ہیں، لہٰذا سب کو ان کا حق ملنا چاہیے اور سب کو ان سے مقدور بھر استفادہ کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اہلِ ایمان صاحبِ صلوٰۃ بنتا ہے تو اپنی نماز کے اس تقاضے کو محسوس کرتا ہے کہ اس کے پاس جو نعمتیں ہیں وہ ربّ العالمین کی امانت ہیں اور ان میں معاشرے کے دیگر افراد کا بھی حق ہے، لہٰذا انھیں ان کا حق دینا ناگزیر ہے، جسے قرآنِ حکیم ایتائے زکوٰۃ سے تعبیر کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کے بغیر ایک تو صلوٰۃ کا تقاضا پورا نہیں ہو سکتا، دوسرے اہلِ ایمان کا دعوائے محبّت و اطاعتِ الٰہی اور عقیدۂ توحیدِ ربوبیّت سچّا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صلوٰۃ کو زکوٰۃ متلزم ہے، بلکہ یہ کہنا انسب و اصح ہوگا کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ ایک کی دوسری کے بغیر تکمیل نہیں ہو سکتی؛ اس طرح ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اگر صلوٰۃ اہلِ ایمان میں محبّتِ الٰہی کی شمعِ خاموش کو فروزاں کرتی، جذبۂ عبودیّت کو ابھارتی اور اس کی تسکین کرتی ہے، نیز اس کے اندر اخوّت و محبّت، مساوات و حریّت، عدل و احسان اور ایثار و قربانی کے جذبات کی پرورش کرتی اور ایتائے زکوٰۃ کی ترغیب دیتی ہے تو زکوٰۃ اہلِ ایمان کو صدقات و خیرات اور "انفاق بالعفو" یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ بہرحال قرآنِ حکیم کی رُو سے ایمان کا تقاضا قیامِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ ہے اور اہلِ ایمان اس تقاضے کو پورا کرنے کی خاطر صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید اور سیرتِ طیّبہ کے مطالعہ بالحق سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ نظامِ زکوٰۃ کی غایت معاشی نظام کو عدل و احسان اور زکوٰۃ و انفاق بالعفو کی بنیادوں پر استوار کرنا ہے اس لیے کہ اس سے مندرجۂ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں: ایک تو اس میں کفالتِ قومی کا نظام قائم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشی نظام اساسی طور سے ناقابلِ استیصال اور دوسرے کارکردگی کے لحاظ سے مثالی ہوتا ہے، تیسرے، افرادِ معاشرہ کو معاشی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ چوتھے معاشرہ فتنہ و فساد، تضاد و تخالف اور تشتّت و افتراق سے محفوظ رہتا ہے۔ پانچویں، اس میں گردشِ دولت متوازن رہتی اور معیارِ معیشت

میں موزونی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، جو حسد و بغض، تضاد و تخالف اور عداوت و مخاصمت کا بہت حد تک سدِباب کرتی ہے۔ چھٹے، اس سے معاشرے میں اخوت و مساوات، یگانگت و یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتویں، اس نظام سے قوم میں دفاع و تسخیر کی قوت و توانائی پیدا کرنے میں قابلِ قدر مدد ملتی ہے۔ آٹھویں، ایسا معاشی نظام قوم کی ہمہ گیر ترقی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ نویں، اس سے نظامِ صلوٰۃ کو بے حد تقویت ملتی ہے۔ دسویں، اس سے فرد و قوم میں آرزوئے حُسن و زندگی کا نشو و ارتقاء ہوتا ہے۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں نظام اپنی اصل بنیادوں پر اُستوار ہوں اور احسن طریق سے کام کریں تو اہلِ ایمان کو عباد الرحمٰن یعنی مُتقی و صدّیق، محسن و صالح اور مجاہد و صاحب حُسن و سرور، نیز خوشحال و ترقی یافتہ اور ناقابلِ تسخیر قوم بنا دیتے ہیں؛ نیز اس پر دُنیوی و اُخروی ترقی کی راہیں وا و کشادہ کر دیتے ہیں۔

یہاں اس ازبس اہم و فکر انگیز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّتِ حسنہ کی رُو سے ایتائے زکوٰۃ میں تنظیم و اجتماعیت پائی جاتی ہے، جسے نظامِ زکوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں، نظامِ زکوٰۃ قائم کرنے اور چلانے کی بنیادی ذمے داری حکومت کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت ہی اہلِ نصاب لوگوں سے زکوٰۃ لینے اور اسے بیت المال یا خزانۂ عامرہ میں جمع کرنے اور اس سے افرادِ معاشرہ کی معاشی حالت سدھارنے اور ان کی کفالتِ کُلّی کرنے کی مجاز و ذمے دار ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے بیت المال یا خزانۂ عامرہ کا قیام و انصرام حکومت کی اوّلین ذمے داریوں میں سے ہے۔

چونکہ زکوٰۃ کی غایت، جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، قوم کی معیشت کو کشادہ و حسین اور اس کی گردشِ دولت کو متوازن بنانا، نیز اس کے دائرے کو کُل حیاتِ اجتماعیہ پر محیط کرنا ہے، اس اعتبار سے نظامِ زکوٰۃ کا مطلب معاشی نظام ہوا۔

قرآنِ حکیم اور سُنّتِ حسنہ کی رُو سے اسلام کے معاشی نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں وہ حسین نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر جملہ افرادِ

قوم کی کفالتِ کُلّی کا معقول و پائیدار انتظام و انصرام ہوتا ہے، خصوصاً بے کاری و بیماری، پیری و معذوری اور بے کسی و بے چارگی کی حالت میں۔ کفالتِ کُلّی سے مراد افرادِ قوم کی جملہ ضروریاتِ زندگی (جیسے مناسب روزگار، خوراک، مکان، لباس، علاج معالجہ، تعلیم و تربیت، صحت و تفریح، تحقیق و تجربات اور تحفّظِ کُلّی، مثلاً جان و مال، گھر بار، عزت و آبرو اور آزادی کا تحفّظ) کو قومی وسائل کے مطابق پورا کرنا ہے۔

عصرِ حاضر میں قوم کی کفالت کی ایک فکر انگیز و بصیرت افروز مثال ہمیں اکثر مغربی ممالک میں ملتی ہے، مثلاً امریکہ، کینیڈا اور انگلستان وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان ممالک میں کفالتِ قومی کا انتظام ہمیں آئینہ عبرت و غیرت دکھاتا ہے کہ ہم کس قدر ظالم و جاہل ہیں کہ نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی اہمیت اور غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر بیٹھے ہیں جیسے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

نیز ہم آج کل ایتائے زکوٰۃ کے سلسلے میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ تو اس کے ساتھ تمسخر کرنا اور اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ واقعی یہ تسمیہ بالباطل کا جبالیاتی، ابلیسی فریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج صاحبدل و اہلِ نظر کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے: کیا قرآنِ حکیم کی رُو سے اسلامی نظام کا دوسرا اہم رُکن نظامِ زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ کیا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور آپؐ کے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے زکوٰۃ یا کفالتِ قومی کا نظام قائم کیا تھا یا نہیں؟ اگر کیا تھا اور یقیناً کیا تھا، جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نظامِ زکوٰۃ اپنی اصل شکل میں کسی مسلم ملک میں قائم نہیں؟ تاریخی عمل کی سند و شہادت پر اس کا جواب یہ ہے کہ نظامِ زکوٰۃ کے فقدان کی اصل وجہ یہ ہے کہ جملہ مسلم اقوام سرطان زدہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر، مسلم معاشروں پر فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری سرطان مُسلّط ہیں، جو کسی عنوان اس وقت تک اسلامی نظامِ زکوٰۃ بصورتِ نظامِ کفالتِ قومی قائم نہیں ہونے دیں گے جب تک کہ اُن کا اِستیصالِ کُلّی نہیں ہو جاتا۔ چونکہ معاشرتی سرطانوں کا اِستیصالِ کُلّی ناگزیر ہے، لہٰذا یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیسے ہو؟ اس کا مختصر جواب تو ہے: بذریعہ حُسنِ اِنقلاب، لیکن منہاجِ انقلاب سے بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

(۴) امر بالمعروف

امر بالمعروف قرآن مجید کی بنیادی مصطلحات میں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت پر لازم یہ ہے کہ وہ "معروف" کی تشہیر و ابلاغ کا احسن و اکمل طریق سے انتظام و انصرام کرے۔ معروف سے مراد حسنِ عمل، عملِ صالح، خیر، حسنہ یا ہر نیکی اور بھلائی کا کام ہے، جسے انسان عقلاً، طبعاً اور وجداناً جانتا بوجھتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہے۔ اس کی ضد اور نقیض مُنکر ہے، جس کا مطلب سیئہ و شر، فتنہ و فساد، ظلم و عدوان اور جرم و گناہ یعنی ہر وہ قبیح و شنیع فعل ہے، جسے انسان عقلاً، طبعاً اور وجداناً جانتا بوجھتا اور ایسا سمجھتا ہے اور اس سے انکار کرتا ہے، نیز اس سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتا۔ بہر حال، "خالص معروف" کی تشہیر و ابلاغِ عامہ اسلامی حکومت کی ذمے داری ہے، لہٰذا معروف کے ساتھ مُنکر کی تشہیر و ابلاغ کسی حال میں جائز نہیں۔ "خالص معروف" سے مراد یہ ہے کہ ایک تو ابلاغ و تشہیر میں کتمانِ معروف نہ ہو، دوسرے معروف میں منکر کی آمیزش نہ ہو اور تیسرے معروف کے ساتھ ساتھ مُنکر کی تشہیر نہ ہو۔

اگر یہ صحیح ہے کہ امر بالمعروف کے ابلاغ و تشہیر کا نظام قائم کرنا اسلامی حکومت کی بنیادی ذمے داری ہے، اور یقیناً صحیح ہے، اس لیے کہ یہ فرمانِ الٰہی ہے تو پھر ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ مسلم حکومتیں اپنی اس از بس اہم ذمے داری سے عہدہ برآ ہو رہی ہے یا نہیں؟ ہر مسلم حکومت کا نظامِ ابلاغ و تشہیر خود اس حقیقت کا شاہد ہے کہ وہ اپنی اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہو رہی۔ ستم پر ستم تو یہ ہے کہ کسی مُسلم حکومت میں کسی فرد یا جماعت کو خالص امر بالمعروف کے ابلاغ و تشہیر کی آزادی ہی نہیں اور کوئی ایسا کرنے کا مجاز ہی نہیں۔ کسی مسلم حکومت میں نہ تو اس حقیقت کی تشہیر ہوتی ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے کہ اسلامی معاشرہ معاشرتی سرطانوں یعنی فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں سے پاک و صاف ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ معاشرتی سرطان کسی کو اپنے استیصال کی دعوت نہیں دے سکتے اور "آ بیل مجھے مار" ایسی احمقانہ حرکت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کسی شخص کو اس حقیقت کی تشہیر کی اجازت نہیں کہ ہمارے معاشی نظام کی بنیاد ظلم و استحصال اور سود و حرام پر استوار ہے اور وہ سراسر سرطانی ہے اور سرطانوں کا استیصال لابدی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے

معاشرے میں احکامِ الٰہی یا آئینِ قرآن کا فقدان ہے اور معاشی عدل و احسان کا ملنا محال ہے؟

الغرض جس معاشرے میں امر بالمعروف کی اجازت ہو نہ نہی عن المنکر کی، اس کے غیر اسلامی بلکہ سرطانی ہونے سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ صورتِ حال حسنِ انقلاب کی متقاضی ہے اور حسنِ انقلاب ایک مکمل تحریک چاہتا ہے، جس کا احسن و اکمل نمونہ ہمیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں ملتا ہے[۲۵]۔

(۵) نہی عن المنکر

نہی عن المنکر قرآنِ مجید کی اہم ترین جمالیاتی۔ اخلاقی اصطلاحات میں سے ہے اور امر بالمعروف کی ضد اور نقیض ہے۔ منکر کا مطلب ہے ایسی چیز، فعل یا بات، جس سے انسان طبعاً ابا کرتا ہو اور جو عقل، ضمیر، جمالیاتی حس اور نفسِ لوّامہ، نیز شریعت کی رُو سے مکروہ و ناجائز اور قبیح و شر ہو اور آدمی اس سے منسوب ہونا پسند نہ کرتا ہو۔ یہ بڑی وسیع المعانی اصطلاح ہے اور سیئہ و شر، فحشاء و بخل، شرک و بت پرستی، فتنہ و فساد، کذب و نفاق، ظلم و استحصال، سود خوری و سود کاری، اکتناز و احتکار، اسراف و تبذیر، الغرض سیاہ کاری و حرام خوری کی ہر شکل پر حاوی ہے۔ علاوہ بریں، اس میں سلبِ آزادی، غلامی و کنیز داری اور تذلیلِ انسانی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقیات کا نظام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیادوں پر استوار ہے اور اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ محض اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے اسے قائم کرنا اور اسے احسن طریق سے چلانا اسلامی حکومت کی اوّلین ذمے داری ہے[۱۱] اور یہ اسلامی معاشرے کی ایک امتیازی خصوصیت اور پہچان ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس معاشرے میں اسلام کا یہ جمالیاتی۔ اخلاقی نظام قائم نہیں وہ قرآنِ مجید کی رُو سے اسلامی نہیں، لہٰذا مسلم معاشرے کو اسلامی جاننے کے لیے اس نظام کا قیام ناگزیر ہے۔ اس نظام کے دو بنیادی وظائف ہیں: ایک تشہیر و ابلاغِ عامہ اور دوسرے قانون اور اخلاقی و معاشرتی دباؤ کے ذریعے حکیمانہ طریقے سے لوگوں کو منکرات سے باز

رکھنے کی منظم جدوجہد کرنا۔ اس نظام کی غایتِ حقیقی صالح معاشرے کا قیام ہے جو سود و استحصال، فحشاء و منکرات اور ظلم و ناانصافی نیز ان کے بھیانک اور منفی اثرات سے پاک و صاف ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے مُسلم معاشروں میں یہ نظام قائم ہے یا نہیں؟ اگر قائم ہے تو کیا وہ اپنے وظائف احسن طریقے سے سرانجام دے رہا ہے یا نہیں؟ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کسی مسلم ملک میں یہ نظام قائم نہیں؛ اگر ناقص صورت میں قائم بھی ہے تو وہ اپنے وظائف سرانجام نہیں دے رہا۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت کسی مسلم ملک میں اسلامی معاشرہ قائم نہیں۔ یعنی اس میں آئینِ قرآن نافذ نہیں۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں معاشرتی سرطان برسرِ اقتدار ہوں، اس میں ایسا نظام قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کا مطلب معاشرتی سرطانوں کا استیصالِ کُلّی ہے، لہٰذا وہ اپنی ہلاکت و بربادی کے پروانے پر خود اپنی مرضی سے دستخط نہیں کر سکتے۔

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے اہم اسلامی نظامِ اخلاق کا فقدان، جو اسلامی معاشرے میں اساسی حیثیت رکھتا ہے، حُسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کے استیصالِ کُلّی کا متقاضی ہے۔

قرآنِ حکیم اور سُنّتِ حسنہ کی روشنی میں اسلامی معاشرے کے چار بنیادی خصائص کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ مسلم ممالک میں کہیں بھی اسلامی معاشرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآنِ حکیم کی زبان میں ہم نہ تو صدق و خلوص سے ایمان لائے ہیں اور نہ پورے طور سے دائرۂ اسلام میں داخل ہی ہیں، یعنی حالتِ نفاق میں ہیں۔ علاوہ بریں ہمارا معاشرہ سرطان زدہ ہے اور ہمارے معاشی نظام کی بنیاد ظلم، استیصال اور سود پر استوار ہے اور ہم اپنے فطری یا انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے قلب و جان اطمینان سے اور مسلم معاشرے امن و سلامتی سے محروم ہیں اور ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی خوف و حزن کی آگ میں جل رہی ہے۔ معاشرتی سرطانوں نے کسانوں اور محنت کشوں کا خون چوس چوس کر انھیں نہ صرف حُسن و سرورِ زندگی سے بلکہ آرزوئے حُسن و زندگی سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں آرزوئے انقلاب پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہم اپنے آپ کو جہاد بالقرآن پر آمادہ ہی پاتے ہیں؛ نیز ہم ان سرطانی طبقوں اور ان کے خوشہ چینوں اور کاسہ لیسوں

کی تاویل باباطل اور تسمیہ باباطل کے خوشنما جالوں میں اتنی مدت سے گرفتار ہیں کہ ہمیں اپنی گرفتاری و غلامی کا احساس و شعور بھی نہیں رہا۔ یہ صورتِ حال ہو تو قوم مردہ کہلاتی ہے۔ مُردہ قوم حسن و سرورِ زندگی کی لذت سے تو آشنا نہیں ہوتی، لیکن اُسے آتشِ خوف و حزن کی اذیتوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس حقیقت کی علامت ہوتا ہے کہ قوم میں ابھی تک اس کی نشاۃِ ثانیہ کا امکان ہے اور اسے معاشرتی سرطانوں سے رہائی دلائی جاسکتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ احساس نہ رہے تو قوم کی ہلاکت و بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ قدرت کے قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے آرزوئے حسن و زندگی کا فقدان دلیلِ مرگِ مفاجات ہوتا ہے۔

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا!

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ فرد ہو یا قوم وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وقت صرف اِن کا خیر مقدم کرتا ہے جو اسے اپنا مرکب بنانے کی خاطر اس کے منتظر اور چوکنے رہتے ہیں اور اسے بڑھ کر مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ جس قوم میں وقت کو اپنا مرکب بنانے اور اس کے ذریعے سفرِ زندگی کاٹنے کی آرزو ہوتی ہے، وقت اسے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ رہوارِ وقت کے بغیر سفر کرنے والے لوگ درماندہ و پس ماندہ اور محروم و ناکام رہتے ہیں۔ زیاں کاری اصل میں ضیاعِ وقت ہے، لہٰذا جو لوگ وقت کو ضائع کرتے رہتے ہیں، وہ زیاں کار اور ظالم و جاہل ہوتے ہیں، جیسی کہ پاکستان سمیت مسلم اقوام ہیں۔

وقت ایسا مرکب ہے جو اپنے راکب کے ارادہ و حوصلے اور ہمت و استعداد کے مطابق سُست رو، تیز رو یا برق رفتار بن جاتا ہے۔ راکب رحمۃ للعالمین ﷺ ہو تو وقت برق نمط یا بُراق بن کر اُسے معراجِ کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ قوم حاملِ عصائے کلیمی ہو تو وقت کبھی اُس کے لیے صحرا میں آبِ شیریں کے چشمے بہا دیتا اور کبھی اُسے ناقابلِ عبور دریا پار کراتا ہے، لیکن جو وقت کے پیچھے چلتے ہیں، اُنھیں دریا بُرد کر دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جو قوم رہوارِ وقت کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چلتی وہ ان قوموں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتی اور ان کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، جو تیز رو اور راکبِ وقت ہوتی ہیں۔ پس ماندگی و درماندگی

وقت کے ساتھ نہ چلنے اور اس کو اپنا مرکب نہ بنانے کا فطری نتیجہ ہے، اور یہ تاریخی عمل ہے جو کبھی رکتا نہیں بلکہ سدا جاری و ساری رہتا ہے۔ کائنات عالم زمان و مکان ہے اور مکان کی طرح زمان بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اسے بھی مکان کی طرح بنی نوع انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ جس طرح مکان یا اشیائے کائنات کو مسخر کر کے قومیں قوت و سطوت حاصل کرتی اور اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوتی؛ نیز اپنے جلالِ زندگی کا مظاہرہ کرتی اور ترقی کی دوڑ میں سبقت لے جاتی ہیں؛ اسی طرح زمان یا وقت کو مسخر کرنے والی قومیں ہی ترقی کی دوڑ میں آگے ہیں اور قدرت نے انھیں ہی قوموں کی قیادت تفویض کی ہوئی ہے۔ وقت بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے جس میں دُنیوی و اُخروی فوز و فلاح اور حسنات و برکات پنہاں ہیں، لہٰذا جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے وہ کفرانِ نعمت ایسے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں، جس کی جزا سلبِ نعمت ہے۔ یہ سُنّتِ الٰہیہ ہے، جس کے لیے ہم نے "قدرت کا قانون آرزو" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کی ذلّت و مسکنت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ صدیوں سے کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیے جا رہی ہے اور بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے کفرانِ نعمت کی وجہ حقیقی آرزوئے نعمت کا فقدان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں تسخیرِ زمان و مکان کی آرزو زندہ و حرکی نہیں، اس لیے یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں آرزوئے نعمت کے فقدان کی بنیادی وجہ معاشرتی سرطانوں کی خون آشامی ہے۔ ان کا یہ عمل ایسا خمار انگیز ہے کہ خواہشِ نشہ تو زندہ و فعّال رہتی ہے، لیکن آرزوئے حسن و زندگی خفتہ و مُردہ ہو جاتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ آرزوئے حسن و زندگی ہی تسخیرِ زمان و مکان اور ترقی و کمال کے حصول کی آرزوؤں کا منبع اور حسنِ انقلاب کی پیش شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عامۃ النّاس کے دلوں میں آرزوئے حسن و زندگی کا مُردہ رکھنا اور بیدار نہ ہونے دینا معاشرتی سرطانوں کی حکمتِ عملی کا اصل الاصول ہے۔

جس طرح بادلوں میں برق پنہاں ہوتی اور اُن کے حُسنِ تصادم سے اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے، کچھ اسی طرح مثال کے طور سے وقت میں جمالیاتی۔ نفسیاتی آن مضمر ہوتی ہے، جو فکر و عمل کے حسنِ تصادم سے نفسِ قومی میں اپنا جلوہ پیدا کرتی اور اس کی کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ مسلمان صدیوں سے سرطان زدہ معاشروں میں داخلی اور بیرونی معاشرتی سرطانوں کی محکومی و غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ اس بات کی

دلیل ہے کہ ہم وقت ایسی نعمتِ عظمیٰ کی تکفیر کرنے والے زیاں کار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ہم وقت میں مضمر کتنی زیادہ جمالیاتی۔ نفسیاتی آثات کو اپنے تجاہُلِ عارفانہ وکم کوشی کے سبب ضائع کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اور خمارِ تغافُل میں سرشار ہیں۔ اس سے پیشتر کہ وقت ہماری قومی وملی زندگی کا سلسلہ منقطع کر دے، ہمیں خود اپنی زیاں کاری کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔ زیاں کاری میں برقِ فنا مضمر ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ دراز تو ہو سکتا ہے، مگر لامتناہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ سلسلہ اپنی فطری حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے اندر ایسے زور کا دھماکا ہوتا ہے کہ زیاں کاری برقِ فنا کی صورت خرمنِ قوم کو راکھ بنا دیتی ہے۔

میری نظر میں ہماری زیاں کاری اپنی فطری حد سے تجاوز کرنے ہی والی ہے اور اس میں پوشیدہ برقِ فنا خرمنِ قوم وملّت پر گرنے کے لیے پیچ وتاب کھا رہی ہے۔ اس انتہائی خوف ناک صورتِ حال نے مجھے مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور پاکستان کے مسلمانوں کو بالخصوص حسنِ انقلاب دینے کی تحریک کی ہے۔ کاش میری آواز غیر مسلم اقوامِ عالم کے کانوں تک پہنچ سکتی تو میں انھیں بھی دعوتِ حسنِ انقلاب دیتا۔ وجہ یہ ہے کہ خونِ آشام معاشرتی سرطانوں کا طبعی خاصہ ہے کہ جب وہ اپنے شکار افراد وقوم کا اپنے اندازے کے مطابق خون چوس لیتے ہیں تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہلاکت آفرین جنگوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ معاشرتی سرطان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چلے ہیں اور قیامتِ صغرٰی برپا کرنے والے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ معمورۂ حیات کو ہلاک وبرباد کر دیں، دُنیا بھر کے مظلوم کسانوں، محنت کشوں اور دیگر صالح انسانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر اپنے اپنے ملک کے معاشرتی سرطانوں کا اِستیصالِ کُلّی کر دیں۔

حواشی

۱۔ کُلّیات و جُزئیات کا علم: یونانی حکماء میں سے ارسطو (Aristotle) اس نظریے کا نقیب تھا کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) فقط کُلّیات کا علم رکھتا ہے، جُزئیات کا نہیں۔

قرآنِ مجید نے اس باطل نظریے کی مختلف اسالیب میں پُرزور تردید کی ہے۔

۲۔ حسنِ انقلاب و تحریکِ رحمۃ للعالمینؐ: اس کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخرؐ، طبع ثانی، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۲ء۔

باب (۴)

اسلامی یا مثالی معاشرے کی تعمیرِ ثانیہ

ربِ ذوالجلال والاکرام نے حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو آخری نبی و رسول اور رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیا تھا، اور آپؐ کی بعثت کی غایت بنی نوعِ انسان کے لیے قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایک ایسے اکمل و احسن معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنا تھی، جو ہر زمان و مکان کے لیے موزوں اور ہر اعتبار سے مثالی ہو. چنانچہ جب آپؐ مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ربِ کریم نے حال و مستقبل کے جملہ بنی نوعِ انسان کو ایک ایسی ٹھوس اور عالمگیر و ابدی حقیقت سے آگاہ کیا، جس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے. ارشاد ہوا! لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ٥ (الاحزاب ۳۳ : ۲۱) :(اے بنی نوعِ انسان) یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول (کے خُلقِ عظیم، حسنِ کردار اور مثالی کارناموں) میں (زندگی کرنے کا) حسین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی اُمید رکھتا اور اللہ کا بکثرت ذکر کرتا یا اسے کثرت سے یاد کرتا ہے.

اس آیتِ جلیلہ میں یہ نکتہ ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ بلاشبہ آپؐ کے کارنامے عظیم و مثالی ہیں، لیکن ان سے ہدایت و فیضان وہی لوگ پاتے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل تین صفات پائی جاتی ہیں: اوّل، وہ جنھیں اللہ تعالیٰ کی دید و لقاء، قرب و حضوری اور رحمت و رضوان کی امید ہوتی ہے. دوم، جنھیں قیامت کے دن نجات و فلاح پانے کی اُمید ہوتی ہے؛ سوم، جو یادِ الٰہی کو حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں. اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ بحیثیت اُمتِ مسلمہ ہماری زندگی اُسوہ حسنہ کے مطابق نہیں،

توپھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم میں متذکرۂ بالا صفاتِ ثلاثہ کا قریب قریب فقدان ہے۔ اگر ہم میں یہ صفات ہوتیں تو ہم یقیناً رحمۃ للعالمینؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی گزارتے۔ چونکہ زندگی معاشرے میں بسر کرنا ہوتی ہے، لہٰذا ہمارا معاشرہ اسلامی ہوتا، یعنی ایسا ہوتا جیسا آپؐ نے تشکیل وتعمیر کیا تھا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان ہی میں نہیں دُنیا کے کسی ملک میں بھی اسلامی معاشرہ موجود نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ کسی مُسلم قوم کو اسلامی معاشرے کی سچّی آرزو نہیں، تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ کسی مسلم ملک میں ابھی تک اسلامی معاشرے کی تعمیرِ ثانیہ کا آغاز نہیں ہوا، اگرچہ بعض ممالک میں ایسا کرنے کا غُلغلہ بہت ہے، جو معاشرتی سرطانوں کی تشہیر بالباطل ہے، جن کی ہر مسلم ملک میں عملداری ہے۔ معاشرتی سرطان لوگوں پر اپنی سیادت وسطوت قائم رکھنے کی خاطر تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے تشہیر بالباطل انتہائی زور وشور سے کرنے کے عادی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ جھوٹ اگرچہ باطل ہوتا ہے، لیکن جب بہت زیادہ، بار بار اور زور وشور سے بولا جائے تو اس میں شیطان کے جمالیاتی فریب کا عنصر شامل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں لوگوں کو مسحور ومرعوب کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کے دعوے اس اعتبار سے بھی بے بنیاد ہیں کہ وہ پرانی عمارات پر تعمیرِ نو کرنے سے پہلے بوسیدہ عمارت کو بیخ وبن سے اکھاڑنا ناگزیر ہوتا ہے، لیکن ابھی تک کسی ملک نے نہ صرف یہ کہ سرطانی نظام کی بنیادوں کو منہدم نہیں کیا، بلکہ ایسا کرنے کا منصوبہ تک نہیں بنایا، اس لیے کہ ہر مسلم معاشرہ سرطان زدہ ہے اور وہ مفصلۂ ذیل بنیادوں پر استوار ہے: (۱) فرعونیت (۲) ہامانیت (۳) قارونیت اور (۴) آزریت۔ ان قرآنی تلمیحات کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ فرعونیت ایسی طرزِ حکومت کو کہتے ہیں جس میں آئینِ قرآن نافذ نہ ہو۔

۲۔ ہامانیت سے فرعونی حکومت کی افسرشاہی مراد ہے۔

۳۔ قارونیت علامت ہے نظامِ سرمایہ داری کی، جس کی بنیاد سود وظلم پر استوار ہو۔

۴۔ آزریت علامت ہے باطل وپیشہ وارانہ مذہبی پیشوائیت کی، جو تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے احکامِ الٰہی کو کچھ کا کچھ بنا دیتے اور ان کے نام پر اپنے عقائدِ باطلہ لوگوں پر مسلّط

کرتے ہیں، علاوہ بریں، یہ شرک و بُت پرستی (: قبر و پیر پرستی، اکابر پرستی و اوہام پرستی) کے نقیب اور علمبرداروں کی علامت ہے۔

اگر ہم نے آزاد و معزز اور ترقی یافتہ و ذمے دار قوم و ملّت کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے اور یقیناً رہنا ہے تو ہمیں سب سے پہلے ان معاشرتی سرطانوں سے نجات حاصل کرنا اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیرِ نو کرنا ہوگی، جو نہ صرف یہ کہ فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری طبقوں سے پاک و صاف ہو، بلکہ اس میں ان کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات کو ختم کرنے کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ سرطانی معاشرے میں سرطانوں کے استیصال کا احسن طریقہ حُسنِ انقلاب ہے جو صاحبِ خُلقِ عظیم اور رحمۃ للعالمینؐ لائے تھے۔ یہ انقلاب چونکہ افرادِ نسلِ انسانی کے حق میں رحمت تھا اور دُنیوی و اُخروی حسنہ لے کر آیا تھا، لہٰذا اسے دیگر نوعیت کے انقلابات سے ممیز کرنے کی خاطر ہم نے حُسنِ انقلاب کی تعبیر اختیار کی ہے۔

رحمۃ للعالمینؐ کا حُسنِ انقلاب ہمہ گیر اور ہر گوشۂ حیات میں تھا، جس کے نتیجے میں انفرادی و اجتماعی زندگی میں مکمل ہم آہنگی و موزونی پیدا ہوگئی اور وہ مظہرِ جمال و جلال بن گئی۔ اگر آپؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لیے مثالی نمونہ ہے اور یقیناً ہے تو پھر ہمیں آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق معاشرے کی تعمیرِ ثانیہ کرنا ہوگی۔ مصنف نے اس موضوع پر اپنی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخرؐ میں تفصیل سے بحث کی ہے، جس سے ایسے اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں جو اسلامی معاشرے کی تعمیرِ ثانیہ میں ہماری مدد و رہنمائی کرسکتے ہیں۔

تعمیرِ معاشرہ کا پہلا مرحلہ: سیاسی زندگی

ہر زمان و مکان کی عظیم ترین اور تاریخ ساز و انقلاب آفرین شخصیت حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے منہاجِ انقلاب کے سلسلے میں ہماری بحث و نظر کا موضوع تعمیرِ معاشرہ کا پہلا مرحلہ: سیاسی زندگی ہے۔ آپؐ نے ہجرت کے بعد سب سے پہلے مدینۂ منورہ میں اسلامی معاشرے کی طرح نو ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ دیارِ غیر میں یہود و نصاریٰ اور کفّار و منافقین کی کثرت بھی تھی اور انھیں قریشِ مکہ ایسے طاقتور اور اہلِ اثر و نفوذ قبائل کی حمایت بھی حاصل تھی، جب کہ مسلمان بے سر و سامانی اور

کس مپرسی کی حالت میں تھے، لیکن حکمتِ نبوی ؐ نے یہود ایسی عیّار و زیرک قوم اور بدوی عربوں ایسے اکھڑ جنگجو اور روباہ صفت قبائل کو اس طرح مرعوب و مسحور کر دیا کہ انھوں نے تحریری معاہدے کے ذریعے اسلامی حکومت اور اس کی بالواسطہ بالادستی، اور آپ ؐ کی سربراہی کو تسلیم کر لیا اور اس کے سیاسی و عسکری حلیف بن گئے۔ آپ ؐ کی تحریکِ حُسنِ انقلاب کی پہلی فقید المثال کامیابی تھی، اور اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے، جو سیرت نگاروں اور مورخین نے اُسے دی ہے!

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسلامی معاشرے کی بنیاد توحید پر رکھی۔ توحید دراصل دین کی روح ہے اور مسلمان کی حیاتِ کُلّی کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو تو وہ مؤمن و موحّد بنتا ہے۔ حیاتِ کُلّی سے انسان کی فکری و عملی اور انفرادی و اجتماعی زندگی مراد ہے۔ اس جگہ اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ کسی معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو کے لیے "معاشرتی زندگی" کا ہونا ناگزیر ہے؛ اور معاشرتی زندگی کسی خطۂ سرزمین میں رہنے والے لوگوں کی اجتماعی زندگی سے عبارت ہے جو آرزوئے معاشرت، مشترکہ مفادات، فکری و جذباتی ہم آہنگی اور تنظیم رکھتے ہوں۔ چنانچہ آپ ؐ نے بلاتاخیر سربراہِ مملکت کی حیثیت سے اپنی نوزائیدہ شہری مملکت کے افراد مہاجر و انصار میں اسلام کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کے ذریعے فکری و جذباتی ہم آہنگی، اخوّت و مساوات اور آرزوئے معاشرت و آزادی، نیز وحدت و تنظیم پیدا کر دی۔

یہ ایک ازبس معنی خیز و بصیرت افروز حسنِ اتفاق ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تحریکِ اسلام (جو دراصل تحریکِ حُسنِ انقلاب تھی) کی طرح تحریکِ پاکستان کا نعرہ بھی "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" تھا اور دونوں کا مقصد اسلامی معاشرے کی تعمیر تھا؛ یعنی ایسے معاشرے کی جس کا اِلٰہ و ربّ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہو اور اس میں فرعون و ہامان ہوں نہ قارون و آزر؛ نیز وہاں حکم فقط اللہ تعالیٰ کا چلتا ہو اور وہ خوف و حزن سے محفوظ اخوّت و محبّت، آزادی و مساوات، عدل و احسان اور امن و سلامتی کی جنّت ہو۔ مقصد سچّا اور ارفع و اعلیٰ تھا، ربّ جلیل نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور مسلمانوں کو ایک عظیم مملکت کا وارث بنا دیا، لیکن ہم نے اپنا عہد وفا نہ کیا اور اپنے میثاقِ قومی سے منحرف ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے نہ تو یہاں اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے کی کوشش کی اور نہ آئینِ قرآن نافذ کرنے کی۔ یہ یقیناً ہمارا ظلم و جہل ہے کہ

ہم نے ربِّ کریم کی اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہیں کی بلکہ اس کی تکفیر کی اور کر رہے ہیں۔ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ احترامِ آرزو کی رُو سے ہمیں اس عہد شکنی اور کفرانِ نعمت کی سزا ملنی تھی اور ملی۔ چنانچہ ہمارا معاشرہ سرطان زدہ ہو گیا، اور ہم پر فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری سرطانِ دیرینہ مسلط ہو گئے جو مسلسل ہمارا خون چوس رہے ہیں، اور انھوں نے ہمیں اپنا محکوم و غلام اور محتاج و دست نگر بنایا ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں فساد رونما ہے اور ہم میں آرزوئے حسن و زندگی مُردہ ہو چکی ہے اور ہمارے نفس آتشِ خوف و حزن میں جل رہے ہیں، اور ہلاکت و بربادی ہماری منتظر ہے۔ لیکن ہم خمارِ تغافل میں سرشار ہیں اور ہم میں مرگِ مفاجات سے بچنے کی طلب و جستجو کا فقدان ہے؛ اور یہ صورتِ حال قوم کی مرگِ مفاجات کی دلیل ہوتی ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔

پس چہ باید کرد؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہیے؟ اس ازبس اہم سوال کا سیدھا سادا جواب جو حرفِ آخر ہے، یہ ہے کہ ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ علیہ وسلّم کے منہاجِ انقلاب کے مطابق اپنے اس فرسودہ و سرطان زدہ معاشرے کا استیصالِ کُلّی کر کے آئینِ قرآن کی اساسِ محکم پر اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کرنی چاہیے؛ جس کے مرحلہ وار اقدامات کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؛

قومِ یونسؑ کی توبۃُ النصوح اور ہم

اہلِ نظر دیکھ رہے ہے کہ اُمتِ مسلمہ قرآنِ مجید ایسی نعمتِ عظمیٰ کو چھوڑ کر اس کے نور و ہدایت اور فیوض و برکات سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو وہ گمراہ و شقی القلب، ظالم و جاہل، مجرم و گناہگار اور مشرک و اصنام پرست (اکابر و مزار پرست اور فرعون و نفس پرست) ہو چکی ہے اور دوسرے مسلم ممالک پر عذاب کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ عذاب برس پڑے اور ہم ہلاک و برباد ہو جائیں یا محکومی و غلامی ہماری تقدیر بن جائے، ہمیں حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی طرح ربِّ ذوالجلال

والاکرام کے حضور سچے دل سے اپنے جرم و گناہ اور ظلم و عدوان، نیز عہد شکنی اور کفرانِ نعمت کا اقرار و اعتراف کرنا، بخشش و معافی مانگنی اور توبۃُ النّصوح کرنی چاہیئے۔

ہمیں توبہ اس بات کی کرنا ہو گی کہ ہمیں پاکستان ایسی نعمتِ عظمیٰ کی پھر قدر ناشناسی یا تکفیر نہیں کریں گے، بلکہ اس کی قدر اور اس کا تزکیہ کریں گے۔ قدر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے سچی محبت کریں گے اور اس کی تعمیر و تحسین اور تحفظ و ترقی کے لیے بھرپور محنت و مشقت، سعی و جہد اور اجتہاد و جہاد اور کسی قسم کی جانی و مالی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ علاوہ بریں، ہم ایک تو اس کی پیداوار اور دولت میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے اور دوسرے قومی دولت کی تقسیم آئینِ قرآن، مثلاً عدل و احسان، سعی و اکتساب اور ملکیتِ الٰہی و متاعِ انسانی کے قوانین کے مطابق کریں گے (جن کی تصریحات گزر چکی ہیں) تزکیہ سے مراد معاشرے کو کفر و شرک، جرم و گناہ، ظلم و استیصال، فساد و عدوان، فحشاء و منکر، رشوت و بددیانتی، سیاہ کاری و حرام خوری، کاہلی و کام چوری، ناخواندگی و جہالت، تکاثر و تعیش، بخل و سود، اکتناز و احتکار، مزارعت و مضاربت اور سودی سرمایہ کاری و کرایہ کاری ایسی جملہ سیّئات اور معاشرتی سرطانوں سے بحران کے منابع ہیں، پاک و صاف کرنا ہے تاکہ قوم فطری انداز میں نشو و ارتقاء کر کے ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہو جائے اور ان پر سبقت لے جانے کی طلب و جستجو میں لگ جائے۔

علاوہ بریں، ہمیں اپنے اس عہد کی تجدید بھی کرنا ہو گی کہ ہم بلا تاخیر پاکستان میں وہ حسین و مثالی نظام قائم کریں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا؛ جس کی اساس کلمۂ طیبہ (: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰه) پر استوار تھی اور اس میں آئینِ قرآن نافذ تھا اور اس پر عمل درآمد ہوتا تھا؛ ہمیں یہ اصل ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ آئینِ قرآن یا احکامِ الٰہی پر عملدرآمد کرانا اسلامی حکومت خصوصاً اس کے سربراہ کی اوّلین ذمے داری ہے، اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ اور قوم کے سامنے جوابدہ ہے۔

اسلامی حکومت و حکمران

آئینِ قرآن کی دو ازلی و ابدی بنیادیں یہ ہیں! (۱) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور (۲) اِنِ الْحُكْمُ

اِلَّا لِلّٰہِ۔ ان آئینی کلمات کا مطلب یہ ہے کہ کُل بنی نوع انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور وہی ان کا معبود و مقصود، رازق و پروردگار، آقا و مالک اور حاکم و بادشاہ ہے، اور ان پر صرف اسی کا حکم چلے گا، کسی اور کا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص (فرد ہو یا جماعت) اقتدار، ہامانیت یا عسکری قوت کے بل پر غیر قرآنی احکام یا آئین نافذ کرتا ہے، وہ قرآن، مہبطِ قرآن اور منزلِ قرآن تینوں کا عملاً انکار کرتا ہے۔ انسان کی محرومی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔

بہرحال، اسلامی معاشرے کے جملہ افراد صرف اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے احکام کے متوجب ہوں گے اور کوئی شخص (چاہے حکمران ہو یا حکمران جماعت) اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا، بلکہ ان کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ آئینِ قرآن سب کے لیے ہوگا اور کوئی اس سے بالا نہ ہوگا۔

جہاں تک مملکت کے سربراہ کا تعلق ہے، وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے احکام یا آئینِ قرآن کے مطابق حکومت کا کاروبار چلائے گا اور فیصلے کرے گا، لیکن وہ اپنی مرضی کا کوئی قانون نافذ کرنے یا حکم چلانے کا مجاز نہ ہوگا۔ اس کی حیثیت "حکمران" کی نہیں، نائب حکمران کی ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ ملک النّاس تو فقط اللہ تعالیٰ ہے؛ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یا نائب کی حیثیت سے اس کے بندوں پر اس کے احکام کے مطابق حکومت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندوں کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں حکمران کی مسؤلیت لازمی ہوگی۔ ایسے حکمران کے لیے قرآن مجید نے "خلیفہ" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ بخلاف اس کے جو حکمران رعایا پر اپنا حکم چلاتا یا غیر قرآنی آئین نافذ کرتا ہے، وہ حقیقت میں اپنے آپ کو لوگوں کا حاکم و خدا سمجھتا ہے، لہٰذا اس کے لیے ہم نے فرعون کی قرآنی تلمیح اختیار کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی مملکت کا سربراہ "خلیفہ" ہوگا، فرعون نہ ہوگا، چاہے اسے بادشاہ، شہنشاہ، نواب، سردار، صدر، وزیرِ اعظم، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نام سے موسوم کیا جائے۔

سچّے حکمران یا خلیفے کا حُسنِ انتخاب

معتقداتِ جلیلہ و محرکہ میں قوّتِ جاذبہ ہوتی ہے جو کسی علاقے یا خطّے کے لوگوں میں قومیت پیدا

کرتی ہے۔ قومیت میں احساسات و جذبات، فکر و نظر اور خُلق و کردار کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے؛ نیز یہ قومیت ہے جو قوم میں اتحاد و تنظیم، ہیبت و جبروت، جمال و جلال اور قوت و توانائی پیدا کرتی ہے، جیسے عسکریت سپاہیوں کو فوج بناتی ہے؛ یعنی ان میں نظم و ضبط، ہیبت و جبروت، جلال و قہاری، قوت و توانائی اور رعب و سطوت پیدا کرتی ہے۔ قومیت کو حکومت متلزم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ادارۂ حکومت ہے جو قوم کی آزادی و قومیت، نشو و ارتقاء، امن و سلامتی، انفرادیت و تشخص اور اس کے معتقداتِ جلیلہ و محترکہ کا محافظ و ضامن ہوتا ہے۔ اس سے حکومت کے ادارے کی غیر معمولی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد جب مدینۂ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے انتہائی نامساعد حالات کے باوصف وہاں بلا تاخیر اُس حسنِ تدبّر و حکمت سے اسلامی حکومت کا ادارہ قائم کر لیا اور اسلام کی مخالف اقوام سے تسلیم بھی کروالیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

آپؐ کی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت آئینِ قرآن تھا جو اس میں اس طرح جاری و ساری تھا جس طرح جسم میں خون جاری و ساری ہوتا ہے۔ صالح جسم میں ایک تو خون کی گردش معتدل و متوازن ہوتی ہے، اور دوسرے وہ کُل جسم کے رگ و پے میں جاری و ساری رہتا ہے اور یہی صحتِ جسمانی کا راز ہے۔ چنانچہ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جسم کے جس عضو یا جارحہ میں خون جاری و ساری نہ رہے تو وہ مفلوج و سقیم ہو جاتا ہے؛ اور اگر دورانِ خون میں کسی وجہ سے اعتدال نہ رہے تو جسم کو بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ یہ مثل معاشرے پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ اس میں آئینِ قرآن جاری و ساری نہ ہو جیسا کہ پاکستانی معاشرے میں نہیں ہے تو اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو مسلم معاشروں کا ہو رہا ہے۔ اس وقت اُمّتِ مُسلمہ کا ہر گوشۂ حیات فساد زدہ اور وجود سرطان زدہ ہے؛ لہٰذا حکومت کے ہر ادارے کی اوّلین ذمے داری ہیبتِ اجتماعیہ کو داخلی و خارجی معاشرتی سرطانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کی خاطر ان کا قلع قمع کرنا اور ان کی نشاۃ الثانیہ کے امکانات کو ختم کر دینا ہے۔

ہر ادارہ اپنے نظم و ضبط اور حُسنِ کارکردگی کے لیے مدبّر و مُہتمم یا ناظم چاہتا ہے، لہٰذا حکومت ایسے از بس اہم ادارے کے لیے بھی ایک قابل قیم یا سربراہ کا ہونا ناگزیر ہے، جسے خلیفہ کہتے ہیں۔ خلیفہ سچا حکمران

ہوتا ہے، اور جھوٹے حکمران کو قرآنِ مجید نے فرعون و نمرود سے تعبیر کیا ہے۔ سچے اور جھوٹے حکمران میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سچا حکمران اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام کے مطابق حکومت کرتا ہے، ان پر خود بھی عمل کرتا ہے اور رعایا سے بھی عمل درآمد کراتا ہے۔ بخلاف اس کے جھوٹا حکمران یا فرعون احکامِ الٰہی کے ساتھ اپنا حکم بھی چلاتا ہے اور اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔ بہر حال حکومت کا ادارہ چلانے کے لیے مضبوط ہاتھ، مضبوط دل اور مضبوط دماغ کی حاجت ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے خلافت کی اہلیت چار صفاتِ حسنہ سے مشروط ہے: ایمان و صالحیت اور علم و جسم میں زیادتی و فوقیت۔ اب ان شرائطِ خلافت کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے۔

۱۔ خلافت کو ایمان و طاعتِ الٰہی مستلزم ہیں، اس لیے کہ خلیفہ کا فرضِ منصبی احکامِ الٰہی کو نافذ کرنا، ان پر عمل درآمد کرانا اور خود بھی عمل کرنا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت کیے بغیر خلیفہ کسی عنوان اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ایمان کو صالحیت مستلزم ہے، اس لیے کہ ایمان کا تقاضا اطاعتِ الٰہی ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید عملِ صالح کی تعبیر بھی استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے جس شخص کا ایمان زیادہ ہو گا اس میں صالحیت بھی اسی نسبت سے زیادہ ہو گی۔ چونکہ زندگی کے متعدّد شعبے ہیں اور ان سب میں شخصِ واحد کا کمال حاصل کرنا اور دوسروں پر سبقت لے جانا محال نہیں تو ازبس دشوار ضرور ہے، لہٰذا جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، جو مؤمن سیاسی شعور و حکمت میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو، وہ خلافت کا زیادہ اہل ہو گا۔

۳۔ **علم میں زیادتی:** علم میں زیادتی کا مطلب اس کی قوت و توانائی، نور و ہدایت اور حکمت و دانش میں بہتات ہے، جس کے نتیجے میں صاحبِ علم کی قوتِ فہم و ادراک، سلامتیِ عقل و فکر، فضیلت و حکمت اور نورِ قلب میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم میں زیادتی نورِ قلب کے اِتمام پر دلالت کرتی ہے جسے قرآنِ مجید نے "فرقان" سے تعبیر کیا ہے۔ فرقان خیر و شر، سود و زیاں، حُسن و قُبح اور حسنہ و سیئہ میں تمیز کرنے کی داخلی نورانی قوّت ہے، اور خارجی نورانی قوّت کا نام الفرقان ہے۔ کاروبارِ حکومت کو آئینِ قرآن کے مطابق چلانے کے لیے خلیفہ کے لیے صاحبِ فرقان ہونا ضروری ہے۔ بہر حال، علم سے

انسان میں قوتِ یقین وکردار، خشیتِ الٰہی وخود اعتمادی، نیز خود آگاہی وخدا آگاہی پیدا ہوتی ہے، اور ایسے صاحبِ علم حکمران کے دل ہی میں قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم وتزکیہ قائم کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

۴، جسم کی زیادتی سے قلب وبدن کی قوت وصلاحیت کی زیادتی مراد ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ "صالح جسم ہی میں قلبِ صالح ہوتا ہے"۔ صحت مند وطاقتور جسم میں دل ودماغ بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، صحت مند ومضبوط انسان عموماً شجاع وحوصلہ مند، صابر وثابت قدم، جفاکش وجری، روشن دماغ وحلیم، مدبر ومفکر اور دُور اندیش وزمانہ شناس ہوتا ہے، نیز اس میں ہمت وطلب ودلیرانہ فیصلے کرنے کا عزم وحوصلہ ہوتا ہے۔

الغرض، قرآنِ مجید کی رُو سے جو مسلمان سب سے زیادہ ان صفاتِ اربعہ کا حامل ہوگا، وہ خلافت کا سب سے زیادہ سزاوار واہل ہوگا، لہٰذا اسے خلیفہ بنانا قوم پر واجب ہے اور قوم وملت کے بہترین مفاد میں بھی ہے؛ نیز اس کے انتخاب کے بارے میں قبائلی، لسانی، جغرافیائی، الوانی عصبیت کو روا رکھنا، احکامِ قرآن کی خلاف ورزی بھی ہے اور قومی مفاد کے خلاف بھی۔ ایسی عصبیت حقیقت میں منافقت ہے جو قوم کا سرطانی مرض ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہسپانیہ ہو یا ہندوستان، مشرقِ بعید ہو یا مشرقِ وسطیٰ، افریقہ ہو یا وسطی ایشیا، مسلم سلطنتوں کے زوال وسقوط میں عصبیت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ انتخابِ خلیفہ کا قرآنی اصل الاصول یہ ہے کہ جو شخص ایمان وصالحیت میں برگزیدہ ہو اور علم وجسم کی قوتوں کے لحاظ سے دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو وہ خلافت کا سب سے زیادہ سزاوار وحقدار ہے، لہٰذا قوم کو اسے منتخب کرنا چاہیے؛ نیز خلافت کا معیار امارت ہے نہ وراثت، بلکہ "قابلیت" ہے۔ اس سے ان تمام نظریات کا بطلان ہوجاتا ہے جو خلافت کو موروثی اور اس کا معیار امارت یا مال ودولت سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی رُو سے ہر انسان واجب التکریم ہے، چاہے وہ مؤمن ہو یا کافر، مرفہ الحال ہو یا مفلوک الحال، حاکم ہو یا محکوم، آقا ہو یا ملازم، آجر ہو یا اجیر، سرمایہ کار ہو یا محنت کش۔ بالفاظِ دیگر، تکریمِ انسانی کا مطلق معیار "انسانیت" ہے، لیکن اضافی معیار "تقویٰ" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے، وہ دوسروں سے زیادہ عزت وتکریم کا حقدار ہے۔

اسی طرح خلافت کا مطلق معیار "ایمان و صالحیت" اور اضافی معیار "علم و جسم" ہے، یعنی جو مؤمن و صالح شخص دوسروں سے زیادہ علم و جسم کی قوتیں رکھتا ہے، وہ خلافت کا سب سے زیادہ حق دار ہے، لہٰذا اُسے خلیفہ منتخب کرنا قوم پر واجب ہے۔

انتخابِ خلیفہ کے اس قرآنی اصل الاصول کی رُو سے جمہوری انداز کا مروّج طرزِ انتخاب غلط ٹھہرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موجودہ انتخابات جماعتی اساس یا عصبیت پر ہوتے ہیں، اور معیارِ انتخاب پارلیمان کے ارکان کا ہو یا حکمران کا، "قرآنی قابلیت" نہیں، جماعتی عصبیت ہوتا ہے۔ اس طرح جمہوری ممالک کی اقوام اپنے لیے بہترین ارکان اور حکمران منتخب کرنے میں عموماً ناکام رہتی ہیں۔ ایک طریقۂ انتخاب اور بھی ہے، جو اس "ترقی یافتہ" دور میں بھی بدقسمتی سے مسلم ممالک میں پایا جاتا ہے، اور وہ ہے ملوکیت۔ موروثی طریقۂ انتخاب تحریکِ اسلام کا ایک بنیادی مقصد استیصالِ ملوکیت اور اس کی جگہ ادارۂ خلافت کا قیام تھا اور ہے، لیکن اُمتِ مسلمہ کے ظلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ ملوکیت، جو سرطان و ننگِ انسانیت اور دشمنِ اسلام ہے، مسلم ممالک میں موجود ہے اور اپنے آپ کو محافظِ دین و اُمّت کہلانے پر فخر کرتی ہے۔ علاوہ بریں، ایک طریقۂ حکمرانی اور بھی ہے، جسے "تصرّف بالقوۃ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تصرّف بالقوۃ کا مطلب عسکری قوّت کے بل پر حکومت پر قبضہ جما لینا ہے۔ بدقسمتی سے یہ طریقہ بھی پاکستان سمیت زیادہ تر مسلم ممالک میں رائج ہے۔

ہمارے معاشرے کی سرطان زدگی و زبوں حالی، تشتّت و افتراق اور پس ماندگی و واماندگی کا ایک سبب یہ ہے کہ ہم نے انتخابات میں "قرآنی قابلیت" کا اصول اپنایا ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے معاشرتی سرطانوں کی تشہیر بالباطل کے سبب مسلم اقوام کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خلیفہ یا مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے انتخاب کا قرآنی اصل الاصول کیا ہے؟ چونکہ ہمارا معاشرتی نظام سرطانی ہے، لہٰذا اس کے استیصال کے بغیر اسلامی نظام کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اور اسلامی نظام کے قیام کا واحد ذریعہ آئینِ قرآن کا نفاذ بطریقۂ اُسوۂ حسنہ ہے۔ مختصر یہ کہ جب تک ہم احکامِ الٰہی یا آئینِ قرآن کو اپنا دستورالعمل نہیں بنائیں گے، ہم اپنے سرطانی معاشرے کو کبھی اسلامی نہیں بنا سکیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ

سرطانیت کا علاج جراحتِ مسیحائی یا حسنِ انقلاب کے سوا کچھ اور نہیں۔

طریقۂ انتخاب

قرآنِ مجید نے خلیفہ کی اہلیّت کا جو معیار بتایا ہے، وہی معیار اس کے انتخاب کرنے والوں کا ہونا چاہیے، ورنہ مستحق و موزون خلیفے کا انتخاب نہیں ہو سکے گا۔ وجہ یہ ہے کہ جو شخص حکومت کے فرائض، اس کے اغراض و مقاصد اور فیوض و برکات سے آگاہ ہی نہیں اور جو شخص یہ جانتا ہی نہیں کہ خلیفہ کی اہلیّت کا معیار کیا ہے؛ یعنی قرآنِ حکیم کی رُو سے خلیفہ کن اوصاف سے مُتصف ہونا چاہیے، اس کی رائے کیسے صائب ہو سکتی ہے؟ لہٰذا وہ اپنی رائے دینے کا سزاوار و اہل نہیں ہو سکتا اور اسے خلیفہ کے انتخاب میں رائے دینے کا حق نہیں دینا چاہیے۔ یہ سزا یقیناً ان "اندھے" لوگوں کو ملنی چاہیے جو علم ایسی قوّتِ منیرہ سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں، حالانکہ "علم سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھنے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور کہلانے کے باوجود اس ارشادِ نبویؐ کی سرتابی کرتا اور اپنے اس فرض اور منشائے قرآن کو پورا نہیں کرتا، اسے اس جرمِ نافرمانی اور محرومیِ نور و ہدایت کی کم سے کم یہ سزا ضرور ملنی چاہیے کہ اسے کسی انتخاب میں رائے دینے کا حق نہیں دینا چاہیے۔ یہ سزا ایسے ناخواندہ و نافرمان لوگوں کے علاوہ قوم کے حق میں بھی رحمت ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے افرادِ قوم میں علم کی اہمیت و افادیت کا، نیز اس حقیقت کا شعور بیدار ہو گا کہ علم سیکھنا فرض اور نہ سیکھنا گناہِ کبیرہ اور نور سے محرومی ہے؛ دوسرے قوم میں تحصیلِ علم کی طلب و جستجو پیدا ہو گی؛ اس کے نتیجے میں قوم کی زندگی میں وسعت و کشادگی اور رفعت و عظمت پیدا ہو گی۔

حاصلِ کلام یہ ہوا کہ خلیفے کے انتخاب میں صرف ان لوگوں کو رائے دینے کا حق ملنا چاہیے جو قرآنِ مجید کے اُصول کے مطابق رائے کے اہل ہوں، یعنی وہ مؤمن و صالح، علم سے بہرہ مند اور جسم و قلب کے لحاظ سے صحت مند ہوں۔ بخلاف اس کے جاہل و ناخواندہ، فاترالعقل، ذہنی مریض، منشیات کے عادی، تارکانِ دُنیا، مثلاً گداو فقیر، ملنگ، مجاور، مجذوب، درویش وغیرہ وغیرہ، جو قوم کی سیاسی و معاشرتی

زندگی میں دلچسپی اور نہ اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ ہی لیتے ہیں، رائے دینے کے مجاز نہیں ہوں گے۔

مجلسِ شوریٰ

فرعونیت کو اگر ہامانیت مستلزم ہے تو خلافت کو شورائیت، اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے امورِ مملکت میں مشورہ لینا، خلیفے پر لازم یا شرعی زبان میں فرض ہے۔۴ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشیر کون ہونے چاہییں؟ اس اہم سوال کا جواب قرآنِ مجید اور سُنّتِ حسنہ سے یہ ملتا ہے کہ مُشیروں کی اہلیت کا معیار وہی ہے جو خلیفہ کی اہلیت کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ خلیفہ، رائے دینے والوں اور مشیروں کی اہلیت کا معیار اور انتخاب کا اصل الاصول ایک ہی ہے؛ لہٰذا خلیفے کے مُشیر ایسے ہونے چاہییں جو ایمان و صالحیت اور علمیت و جسمانی صلاحیت میں دوسروں پر فوقیت رکھتے ہوں۔ ایسے اصحاب کے لیے "اہلِ حسنِ رائے" کی تعبیر اختیار کرنا احسن ہوگا۔

یہ درست ہے کہ اپنے مشیروں کا انتخاب خلیفے کا حق ہے، لیکن قرآن مجید کی رُو سے اس معاملے میں بھی اُسے بعض اہلِ حسنِ رائے سے مشورہ کرنا لازم ہے۔ مشاورت اسلامی زندگی کا اصل الاصول ہے اور اُسے کُل اُمورِ حیات میں اپنانا مسلمانوں پر واجب ہے۔

اس جگہ "جمہوری اصولِ مشاورت" اور "اسلامی اصولِ مشاورت" کے بنیادی فرق کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ جمہوری اصولِ مشاورت کی رُو سے امورِ مملکت کا فیصلہ کثرتِ رائے کرتی ہے، اور حکمران پر اُسے قبول کرنا لازم ہوتا ہے، چاہے وہ فیصلہ عقل و دین کی رُو سے غلط اور دین و ملّت، قوم و وطن اور نوعِ انسانی کے لیے مضرّت رساں ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے "اسلامی اصولِ مشاورت" کا اصول یہ ہے کہ خلیفے کو امورِ مملکت میں اپنے مشیروں کا مشورہ تو ضرور لینا چاہیے اور مشاورت کرنی چاہیے، لیکن فیصلہ اپنی صواب دید کے مطابق کرنا چاہیے۔ خلیفے کو کثرتِ رائے کا احترام تو ہونا چاہیے اور اس پر خلوصِ نیّت سے حکیمانہ غور و فکر بھی بدرجۂ غایت کرنا چاہیے، لیکن اگر اس کی نظر میں کثرتِ رائے کا فیصلہ غلط و ناصواب ہو یا دینی، قومی اور ملکی مفاد کے منافی ہو تو وہ اسے مسترد کرنے کا مجاز ہے۔

چونکہ خلیفہ مؤمن وصالح، ذی علم اور صحت مند جسم و دل و دماغ کا مالک ہوگا، لہٰذا وہ خود غرض و خوشامد پسند ہوگا نہ بزدل و تکاثُر پسند، بلکہ وہ خود اعتماد و متوکّل اور متقی و صاحب رائے ہوگا؛ نیز خلافت کو خلفائے راشدین کی طرح گراں بارِ امانتِ الٰہی سمجھے گا، لہٰذا وہ فرعون ہوگا، نہ اس کی طرح تختِ حکومت پر ہمیشہ متمکن رہنے کی خاطر اپنے مشیر قارونوں، آزروں اور ہامانوں میں سے منتخب ہی کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ خلیفہ نہیں، فرعون ہوگا، لہٰذا خلافت کا سزاوار نہ ہوگا؛ نتیجۃً اس کی اطاعت انفرادی لحاظ سے تو نہیں، البتہ اجتماعی طور سے ساقط ہو جائے گی اور رعایا کو اسے معزول کرنے کا اختیار ہوگا۔ یہ یاد رہے کہ یہ جس طرح "امر بالمعروف" میں اطاعتِ خلیفہ فرض ہے، اسی طرح "امر بالمنکر" میں نافرمانی خلیفہ فرض ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے اطاعت "معروف" سے مشروط ہے، چاہے خلیفہ کی ہو یا اور کسی کی۔

خلیفہ قوم کا خادم ہوتا ہے

خلافت ایک ایسا ملکی ادارہ ہے جو ہیئتِ اجتماعیہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ایسی قوتِ جاذبہ ہوتی ہے جو ہیئتِ اجتماعیہ کے مختلف عناصر میں اِتحاد و ایتلاف اور قومیت و وحدت پیدا کرتی ہے۔ یہ ادارہ کسی وجہ سے کمزور ہو جائے تو اس کی قوّتِ جاذبہ بھی اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں قوم کے اِتحاد و ہم آہنگی کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور اس میں پہلے فکری و عملی تضادات و عصبیّات کا ظہور ہوتا ہے اور پھر اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا خلافت کی مرکزی حیثیت اور قوتِ جاذبہ کو مضبوط و محکم رکھنا خلیفے اور قوم دونوں کا ازبس اہم فریضہ ہے۔ یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ خلافت کا ادارہ خلیفے کی ذات پر فوقیت و ترجیح رکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی ادارے کی اہمیت و افادیت خود اس ادارے میں مضمر ہوتی ہے اور خلیفہ نظامِ خلافت کا ایک پُرزہ ہوتا ہے، لہٰذا وہ قوم کا خادم ہوتا ہے اور اسے ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ چونکہ قوم کا خادم اس کا مخدوم ہوتا ہے، لہٰذا اِطاعتِ خلیفہ ہر فرد پر لازم ہے۔ البتہ ان امور میں جو شرعاً ناجائز ہوں، اطاعتِ خلیفہ ساقط ہو جاتی ہے۔

قوم کے مرکزی ادارے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ اپنے فرائضِ منصبی احسن طریق سے سرانجام دے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے صبر و تحمّل اور حکمت و بردباری سے کام لے اور ٹھنڈے دل و دماغ اور عقلِ سلیم سے فیصلے کرے۔ چونکہ عدل و احسان کرنے کے لیے تقوے اور متوازن شخصیّت کا ہونا ناگزیر ہے، لہٰذا خلیفے کا متّقی اور طبعاً متوازن ہونا لابدی ہے۔

خلیفے اور فرعون میں فرق

خلیفے اور فرعون میں فرق یہ ہے کہ خلیفہ اپنے آپ کو قوم کا خادم، احکامِ الٰہی کا پابند اور ان کو نافذ کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے والا، اہلِ علم و نظر اور متّقی و صالح لوگوں پر مشتمل مجلسِ شوریٰ کے مشوروں سے اہم فیصلے اور اجتہاد کرنے والا ہوتا ہے؛ نیز وہ اپنے آپ کو قابلِ مواخذہ یعنی اپنے قول و فعل کے لیے اللہ تعالیٰ اور قوم کے سامنے جوابدہ اور ادارۂ حکومت کو اپنی ذات پر مقدم سمجھتا ہے۔ بخلاف اس کے فرعون اپنے ہامانوں یعنی اپنے پروردہ و منظورِ نظر، منافق و مفاد پرست اور عیّار دکاسہ لیس مشیروں کی چرب زبانی سے مسحور ہو کر اپنے آپ کو قوم کا مخدوم و مطاع، حاکم و آقا، مطلق العنان حکمران اور مسؤلیت سے بالا، نیز اپنی ذات کو ادارۂ خلافت پر مقدّم سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں، خلیفہ متّقی و صالح اور عادل و محسن اور فرعون اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اس جگہ اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ جس طرح دولت کا مزاج "قارونی" ہے اسی طرح حکومت کا مزاج "فرعونی" ہے، اور کبر و غرور اور تکاثر دونوں کا خاصہ ہے۔ بہرحال، دولت کا خاصہ انسان میں تکبّر و غرور، بُخل و تکاثر اور قساوت و شقاوت پیدا کرنا اور اس کو خود نما و جاہ طلب اور خوشامد پرست، نیز سب سے بڑھ کر "معاشرتی سرطان" بنانا ہے۔ معاشرتی سرطان کا خاصہ عیّاری و رازداری سے دوسروں کا استحصال کرنا اور ظلم و ناانصافی؛ بخل و سود اور سودی سرمایہ کاری کے ذریعے ان کا خون چوسنا اور اس سے نشو و نما پانا ہے۔ اسی طرح حکومت کا خاصہ حکمران کو متکبّر و سرکش اور مطلق العنان آمر اور "خدا" بنانا ہے۔ خدا بنانے کا مطلب اُسے اِس غلط فہمی میں مبتلا کرنا ہے کہ افرادِ قوم اللہ تعالیٰ

کے نہیں، اس کے بندے اور محکوم ہیں، لہٰذا وہ ان پر احکامِ الٰہی کے بجائے اپنے احکام کے ذریعے حکومت کرنے کا مجاز ہے، چاہے وہ احکامِ الٰہی سے متناقض ہی کیوں نہ ہوں؛ نیز وہ مسئولیت سے ماوراء ہے؛ لہٰذا وہ قوم اور عدلیہ کے سامنے جوابدہ نہیں۔ الغرض فرعونیت کا خاصہ ظلم وطغیان ہے؛ یعنی رعایا کی آزادی سمیت اس کے حقوقِ انسانی کو سلب کرنا، اس کا استحصال اور جبر وتشدد کے ذریعے اس پر حکومت کرنا ہے۔ علاوہ بریں، وہ رعایا کو بہرہ، گونگا اور اندھا بنانے اور دیکھنے کی طلب وآرزو رکھتی ہے۔ بخلاف اس کے خلافت کا خاصہ رعایا کو اللہ تعالیٰ کے بندے سمجھنا اور بنانا، ان پر احکامِ الٰہی کے مطابق حکومت کرنا، ان کی آزادی سمیت حقوقِ انسانی کا احترام کرنا، ان کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وترقی اور روزگار وحُسنِ کفالت کا اہتمام کرنا اور انھیں معاشرے کے آزاد ومجاہد، باشعور وذمے دار اور صالح ومطمئن افراد بنانا ہے۔

ہامانیت وشورائیت میں فرق

ہامانیت اور شورائیت میں فرق یہ ہے کہ ہامانیت کا خاصہ حکمران کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنا اور اس کے مزاج وخواہش کے مطابق مشورہ دینا، قطع نظر اس کے کہ وہ غلط ہو یا درست اور ملک وقوم، دین وملّت یا خود حکمران کے مفاد میں ہو یا نہ ہو؛ نیز اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملک وقوم کو قربان کر دینا ہے۔ بخلاف اس کے شورائیت کا خاصہ حسنِ نیّت سے اپنی صواب دید کے مطابق خلیفے کو مشورہ دینا ہے، چاہے وہ خلیفے کی رائے اور خواہش کے منافی یا مختلف کیوں نہ ہو۔ شورائیت کے پیشِ نظر اپنا نہیں، نہ ہی خلیفے کا، بلکہ ملک وقوم اور دین وملّت کا مفاد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، ہامانیت کا خاصہ حکمران کو خوش کرنا اور شورائیت کا خاصہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شورائیت متقی وصالح حکمران (: خلیفے) کو اور ہامانیت مطلق العنان وخوشامد پسند حکمران (: فرعون) کو چاہتی ہے۔ زمانہ شاہد ہے کہ ہامانیت نے حکمران کو فرعون اور شورائیت نے اُسے خلیفہ بنانے کی کوشش کی ہے؛ لہٰذا ایک متقی وصالح حکمران کو ہامانوں سے اس طرح ڈرنا اور بچنا چاہیے جس طرح انسان زہریلے سانپوں اور بچھوؤں سے ڈرتا اور بچتا ہے۔ یہ علم وحکمت اور عقل ودانش کا تقاضا ہے۔

ہامانیت کی ایک خطرناک چال

ہامانیت حکمران کو اپنی اہمیت جتانے اور مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایک تو اُسے یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی ہے کہ رعایا اُسے بہت چاہتی اور مطیع و فرماں بردار ہے، چاہے صورتِ حال اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہو؛ دوسرے، وہ اُسے قومی ہیرو کے طور پر پیش کرنے میں سارے ذرائعِ ابلاغ استعمال کرتی ہے۔ اس طرح اپنی تشہیر بالباطل کے ذریعے حکمران کو رعایا کے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات سے، نیز ملک کی صحیح سیاسی و عسکری، معاشی و اخلاقی اور دینی و ثقافتی صورتِ حال سے اندھیرے میں رکھتی ہے، اور حکمران کی یہ خوش فہمی و کم آگاہی اس کے زوال کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ ہامانیت کی یہ چال نہ صرف حکمران بلکہ ملک و قوم سب کے لیے بڑی ہی مضرت رساں اور خطرناک ہوتی ہے۔ چونکہ حکومت کے نشے میں ہامانیت کی اس چال کو سمجھنا اور اس سے بچنا حکمران کے لیے محال نہیں تو ازبس دشوار ضرور ہوتا ہے، لہٰذا اُسے ہامانیت پر شورائیت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عادل حکمران کی تعریف

یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ عادل حکمران کسے کہتے ہیں یا اس کی تعریف کیا ہے؟ یہ لطیف نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حکمران کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں: ایک ذاتی اور دوسری حاکمانہ۔ اپنی ذاتی حیثیت میں حکمران بیشک عدل و احسان کرنے والا کیوں نہ ہو، اگر اس کی حکومت میں رعایا کو عدل نہیں ملتا، یا مفت، بلا تاخیر، بروقت اور آسانی سے نہیں ملتا تو اُسے عادل نہیں کہیں گے، اس لیے کہ اپنی رعایا کو عدل فراہم کرنا حکمران کی بنیادی ذمے داری ہے۔ عدل ایسے انصاف سے عبارت ہے جو بلا امتیاز سب کو ملے، بلا تاخیر، بلا تکلف، مفت اور پورا پورا ملے۔ اگر کسی ملک میں لوگوں کو ایسا انصاف یا عدل نہیں ملتا تو اس بے انصافی کا ذمے دار اور جوابدہ حکمران ہوگا۔ علاوہ بریں، محرومِ عدل جملہ افراد کی مظلومی کا بارِ گراں حکمران کے سر ہوگا۔ اس اعتبار سے ایسا حکمران ناانصاف و ظالم اور نااہل ہوگا، لہٰذا اس کی معزولی ملک و قوم کے مفاد میں ہوگی۔

حکمران کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے کسی سے بے انصافی نہیں کرتا، اس کا فرضِ منصبی تو لوگوں کو عدل بہم پہنچانا اور عدلیہ کا ایسا نظام قائم کرنا ہے کہ رعایا کا کمزور سے کمزور شخص بھی عدل وانصاف سے محروم نہ رہے۔ خلافت یا مثالی حکومت کی ایک پہچان اس کا حُسنِ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عدلیہ حکومت کے اثر ونفوذ سے آزاد ہوتی ہے اور اس کے سامنے حکمران و رعایا، امیر و غریب، طاقتور و کمزور سب برابر ہوتے ہیں؛ سب سے یکساں سلوک و انصاف کیا جاتا ہے، اور کوئی شخص مدّعی ہو یا مدّعا الیہ ظُلم وجبر کے سبب عدل سے محروم نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں، عدل مفت، بلاتاخیر اور مفت ملتا ہے۔ اگر کسی ملک میں عدل کی یہ صورتِ حال نہیں ہے تو حکمران اپنے فرائضِ منصبی کو ادا نہ کرنے باعث ظالم ہوگا، لہٰذا حکومت کا سزاوار بھی نہ ہوگا۔

خلیفہ بالشوریٰ ہی اجتہاد کا سزاوار ہے!

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ خلافت اُمّتِ مسلمہ کا اہم ترین ادارہ ہے اور ہیئتِ اجتماعیہ میں نظم وضبط، اتحاد و ہم آہنگی اور وحدت و مرکزیت پیدا کرنا، اس کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرنا، نیز اس کی معروضی وموضوعی کفالت کا احسن واکمل انتظام کرنا، اس کے اوّلین فرائض ووظائف میں شامل ہے۔ علاوہ بریں، دین کو تحریک کی صورت میں زندہ وفعّال رکھنے کی ذمے داری بھی اسی ادارے کی ہے۔ اسلام دراصل انسان کے تزکیۂ نفس واحیاء اور اس کے نور کے اِرتقاء واتمام کی تحریک ہے، جس کی قوّتِ محرّکہ ایمان بالعمل یا اس کے عقائدِ جلیلہ ومحرّکہ ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عقائد میں قوّت وتوانائی اور حرکت وحیات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ انسان (فرد ہو یا قوم) کی زندگی میں خون کے مثل متوازن انداز میں جذب و رواں ہو کر اس کے اجزائے لاینفک بن جائیں اور ان کے مطابق زندگی کرنا اس کا شعار بن جائے۔ اصل یہ ہے کہ یہ انسان کا سوزِ دروں اور زورِ عمل ہے جو اس کے عقائد کو جلیلہ ومحرّکہ بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر عقائد حیاتِ اِنسانی کے اجزائے لاینفک نہ بنیں اور عمل میں نہ آئیں تو وہ اپنی جلالت وقوتِ حیات سے محروم ہو کر مردہ وجامد ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں زندگی اور دین دونوں میں جمود وتعطّل پیدا

ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دین تحریک نہیں رہتا، بلکہ نظری قسم کا ضابطۂ حیات بن کر رہ جاتا ہے۔

عقائد کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں زندہ و حرکی رکھنے کی ذمے داری یوں تو ساری قوم کی ہے لیکن خاص طور سے خلافت اور اس کے سربراہ کی ہے اور اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کا واحد ذریعہ "اجتہاد" ہے، لہٰذا اجتہاد خلیفے کی ناگزیر ضرورت اور اہم ترین فرضِ منصبی ہوا۔ چونکہ امورِ مملکت کو احسن طریق سے سرانجام دینے اور اہم فیصلے کرنے کے لیے خلیفے پر مشاورت حسنہ فرض ہے، لہٰذا اجتہاد ایسے ازبس اہم فریضے کو ادا کرنے کے لیے اپنے مشیروں سے مشاورت ناگزیر ہوئی۔ اس بنا پر خلیفہ بالشورٰی ہی اجتہاد کا سزاوار ہوا۔

بعض مسائل مقامی اور ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن کا فیصلہ بالاجتہاد کرنے کا مجاز علاقے کا والی بالشورٰی ہوتا ہے۔ خلیفہ و والی پر مجلسِ شورٰی کے فیصلوں کا احترام لازمی ہے، ورنہ اس کی مقصدیت و افادیت فوت ہو جائے گی اور اس کے قیام کا جواز باقی نہیں رہے گا۔ لیکن اگر خلیفے یا والی کو اپنے علم و دانش کی بنا پر یقینِ کامل ہو کہ مجلس شورٰی کا اجتہادی فیصلہ قرینِ صواب نہیں تو وہ اسے مسترد کرنے اور اپنا فیصلہ بالاجتہاد نافذ کرنے کا مجاز ہے۔ الغرض، خلیفہ بالشورٰی یا مقامی و ہنگامی حالات میں والی بالشورٰی ہی اجتہادِ شرعی کرنے کا مجاز ہے، البتہ دیگر امورِ زندگی میں اہلِ علم و حکمت کو بھی اجتہاد کا حق ہے اور ان کا یہ اجتہاد ثقافتی زندگی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کے نشو و ارتقا کے لیے ناگزیر ہے۔

اجتہاد کے بغیر دین میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے

دین عبارت ہے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو زندگی میں خون کے مثل جذب و رواں کرنے اور انھیں اس کے اجزائے لاینفک بنانے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زندگی اصلاً تو قائم دائم ہے، لیکن فروعاً متغیر و متبدّل رہتی ہے اور اس کی علّتِ غائی ربِّ کریم کی جمالیاتی، تخلیقی فعلیت کا ثباتِ دوام ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی ہر آن نئے سے نئے مظاہر میں جلوہ نما ہوتی رہتی ہے اور اس طرح خود ہی اپنے لیے مسلسل مسائل پیدا کرتی رہتی ہے، پھر خود ہی

تائیدِ ایزدی سے خلیفہ بالشوریٰ سے مطالبہ کرتی رہتی ہے کہ وہ ان مسائلِ حیات کو ملک و قوم اور دین و ملت کے بہترین مفاد کی خاطر بلاتاخیر کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرے۔ اگر یہ نور و ہدایت میسر نہ ہو تو پھر مسائلِ حیات کو علم و حکمت، عقل و فکر اور مشاہدہ و تجربے کی روشنی میں حل کرتا رہے؛ ورنہ بصورتِ دیگر، مسائلِ نو کا عقائدِ جلیلہ و محرکہ سے متصادم ہونا، تاریخی عمل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس تصادم سے ہمیشہ عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو نقصان پہنچتا ہے، جو بعض اوقات ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ"[۵۹] کی بدولت نئے نئے مسائلِ حیات تو علی الدوام پیدا ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا اگر اسے ساتھ کے ساتھ حل نہ کیا جائے تو ان کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک تو مسائلِ نو بنو کی تعداد و قوت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور دوسرے ان کے زورِ تصادم سے عقائدِ جلیلہ و محرکہ میں اضمحلال و انحطاط پیدا ہوتا رہتا ہے جو ان کے جمود و تعطل پر منتج ہوتا ہے۔ اس انتہائی عبرتناک قومی المیہ کی ذمے داریوں تو ساری قوم ہوتی ہے، لیکن اس کا اصل ذمے دار خلیفہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اجتہاد بالشوریٰ کی ذمے داری خلیفے کی ہے اور وہ اپنی اس مجرمانہ غفلت و خطا کے لیے قابلِ مواخذہ ہے۔ بہر حال، قوم کی اس نقصان پذیری و زیاں کاری کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ "اجتہاد بالشوریٰ" کے ذریعے ان مسائل کو حل نہیں کر لیتی یا ہلاک و برباد نہیں ہو جاتی۔

اصل یہ ہے کہ مسائلِ نو بنو کو ساتھ ساتھ حل کرنا ضروری بھی ہے اور خلافت کا فریضہ بھی، ورنہ مسائل زیادہ پیچیدہ اور لاینحل ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال، معاشرے میں سرطانی طبقوں کی پیدائش اور نشو و نما کے لیے سازگار ہوتی ہے۔ سرطانی طبقے معاشرے میں مضبوطی سے قدم جمالیں تو وہ اپنی قوت و سطوت، اثر و نفوذ اور مال و دولت کے ذریعے ایسے مسائل کو حل کرنے کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فکری جمود و تعطل سرطانوں کی بقا و سلامتی کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے کہ اس کے سبب عامۃ الناس میں حسنِ انقلاب کی آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ مسلم ممالک بالخصوص پاکستان اسی صورتِ حال سے دوچار ہے، جو لاعلاج سرطانی بیماری کی غمازاور حسنِ انقلاب کی متقاضی ہے۔ اگر کسی قوم میں اپنی حالت بدلنے اور سنوارنے کی آرزو و جستجو پیدا ہو جائے اور وہ حسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کے پنجۂ استبداد

سے نجات حاصل کر لے اور ان کا استیصال کر دے اور پھر ایسے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے اُس کی نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کریں گے۔ اگر کوئی قوم ایسا نہیں کرتی یا اس میں حسنِ انقلاب کی آرزو پیدا نہیں ہوتی تو قدرت اپنے نوامیس، مثلاً قانونِ مُجازات، قانونِ احترامِ آرزو اور قانونِ کفرانِ نعمت کے تاریخی عمل کے ذریعے ہلاکت و بربادی کو ان کا مقدر بنا دیتی ہے۔ زندگی حرکت سے اور جمود و تعطل موت سے عبارت ہے چنانچہ کوئی قوم جمود و تعطّل کا شکار ہو جائے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے، اسی لیے مردہ کہلاتی ہے، اور اس کے اِحیاء کے لیے حسنِ انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔

طالحیتِ حکمران میں فرعونیت مضمر ہوتی ہے!

تاریخ شاہد ہے کہ صالحیتِ خلیفہ میں رحمت اور طالحیتِ حکمران میں فرعونیت مضمر ہوتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکمران صالح نہ رہے اور نظامِ حکومت میں خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ فرعونیت کی صورت میں نکلتا ہے اور فرعونیت کے ہیولے میں معاشرتی سرطان مضمر ہوتے ہیں، چنانچہ فرعونی سرطان نشو و نما پاتا ہے تو اس کے بطن سے ہامانی، قارونی اور آزری سرطان جنم لیتے ہیں؛ اور وجودِ معاشرہ کے اندر اتنی رازداری اور چابکدستی سے نشو و نما پانے لگتے ہیں کہ قوم کو اس وقت پتا چلتا ہے جب مرض لادوا ہو چکتا ہے، اور اس کا علاج ضربِ کلیمی رہ جاتا ہے یا جراحتِ رحمۃٌ للعالمینی۔ اگر یہ علاج نہ کیا جائے تو قدرت اِس کا علاج مصر کے بنی اسرائیل کی ذلّت و مسکنت اور بے خانمانی و بربادی کی صورت میں کرتی ہے یا ہسپانیہ و مشرقِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کی شکل میں۔

قدرت کا قانونِ اصلاح بالجبر

عصرِ حاضر کے مسلم ممالک میں بالخصوص معاشرتی سرطانوں کی ریشہ دوانیوں اور تباہ کاریوں کی وجہِ حقیقی بھی طالحیتِ حکومت ہے۔ ظاہر ہے جب تک معاشرتی سرطانوں کا اِستیصال نہ ہو گا، وہ کسانوں اور محنت کشوں کا بالخصوص استحصال کرتے اور اِن کی محنت و مشقّت اور سعی و جہد کا حاصل غصب

کرتے اور ان کے خون پر پرورش پاتے رہیں گے۔ یہ ازبس خطرناک اور عبرت ناک صورتِ حال حسنِ انقلاب کی مقتضی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ہمیں قدرت کے قانونِ اصلاح بالجبر سے بھی متنبہ کرتی ہے۔ اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم خود حسنِ انقلاب کے ذریعے اپنے حکمران، حکومت اور معاشرے کی اصلاح نہیں کرتی قدرت جبراً اس کی اصلاح بالجراحت کرتی ہے۔ اصلاح بالجراحت کی مثال جرّاح کا عملِ جرّاحی ہے، جس کے ذریعے وہ وجودِ سقیم و بسمل کی اصلاح و صحت کی خاطر اس کا کوئی عضو، جارحہ یا فاسد مواد اس سے جدا کر دیتا یا کسی نئے عضو کی پیوند کاری کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ مصنف نے اپنی تصنیف پیغمبر اعظم و آخرؐ (مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۲ء) میں ہر زمان و مکان کی عظیم ترین شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تاریخ ساز و عہد آفرین اور فقید المثال کارنامے کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔

۲۔ دیکھیے البقرۃ ۲: ۲۴۷۔

۳۔ حدیثِ نبویؐ۔

۴۔ مشاورت: دیکھیے آل عمران ۳: ۱۵۹؛ اور الشوریٰ ۴۲: ۳۸۔

۵۔ دیکھیے سورۃ الرحمٰن ۵۵: ۲۹۔

باب (۵)

اسلام کا معاشی نظام

معاشی نظام کی اہمیت : اشتراکی نظریۂ حیات یہ ہے کہ انسان کے نظامِ زندگی کی اساس اس کی معیشت یا معاشی نظام ہے، اور معیشت ہی اس کا اصل مسئلہ ہے، جو اس کے نظامِ حیات میں محور کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا اس کے فکر و عمل کا دائرہ اس کے اِردگرد گھومتا رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی اشتراکیت کے مخالف ہونے کے باوجود سرمائے کو معاشی زندگی کی اساس مانتے ہیں اور اسے روحانی۔ اخلاقی اقدار پر مقدم سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف قرآنِ حکیم، جو زندگی کے متنازع مسائل میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا موقف یہ ہے کہ انسان محض حیوان نہیں، بلکہ حیاتیاتی بشر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ربِّ کریم نے اُسے علم و حکمت، عقل و فکر، شعور و آگہی، اور جذبات و احساسات، نیز ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کی ہے، جن کے سبب ایک تو وہ اس دُنیا میں قانونِ مُجازات یا قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے۔ دوسرے اس میں جمالیاتی اِرتقاء کے لامتناہی امکانات مضمر ہیں، اس لیے کہ لذتِ موت سے آشنا ہو جانے کے بعد وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے اور الحیوان میں پہنچ جاتا ہے جو موت ناآشنا عالمِ حیات ہے۔ تیسرے اس میں اپنے الٰہ و ربّ کی محبت اور آرزو ودیعت کی گئی ہے اور وہ اس قدر شدید ہے کہ اس کی بدولت وہ حُسن پسند ہے اور خوب سے خوبتر، نیز دُنیوی و اُخروی حسنہ اور اپنے معروضِ حُسن و محبت (: اِلٰہ) کے قربِ حضور اور دید و رضوان کی آرزو رکھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ جمالیاتی۔ اخلاقی اقدار کو از بس عزیز اور معاشی اقدار پر مقدم رکھتا ہے، لیکن معاشی اقدار کی اساسی اہمیت پر بھی بہت زور دیتا ہے۔

انسان زندگی، وجود اور اس کے تقاضے تو رکھتا ہے مگر حیوانِ محض نہیں، بلکہ وہ اصل میں جمالیاتی، قلبی بشر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حیوان میں شدید ترین جذبہ بقائے زندگی کا ہوتا ہے اور اس کا انحصار اس کی تقدیری غذا پر ہوتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس میں صیانتِ ذات، آزادی، امومیت و ابوبت (مراد پدری شفقت) اور جنسی، ازواجی محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں، جو معاشی جذبوں پر غالب آنے کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔ بہر حال، حیوان اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کے نظامِ زندگی پر نفسِ بدنی کے تقاضے حاوی ہوتے ہیں، جب کہ انسان کے نظامِ زندگی کو نفسِ بدنی[۲] اور نفسِ روحی[۳] دونوں کے تقاضے کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انسان میں نفسِ بدنی کا تقاضا بھی اُتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اپنے موضوعی، معروضی شیطان کی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے سبب نفسِ روحی کے تقاضوں کو نفسِ بدنی کے تقاضوں تلے دبا دیتا ہے اور بہت کم اس حقیقتِ نفس الامری کا شعور رکھتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود انسان کا ضمیر اور نفسِ لوّامہ اُسے ایسا کرنے سے منع کرتے، زجر و توبیخ کرتے اور توبہ و انابت کی بار بار تلقین کرتے رہتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی رُو سے نظامِ زندگی کی دو بنیادیں ہیں: صلوٰۃ اور زکوٰۃ۔ صلوٰۃ انسان کی جمالیاتی، اخلاقی اقدار کا نظام ہے، جس کی اساس توحیدِ اُلوہیت ہے، اور زکوٰۃ اس کی معاشی اقدار کا نظام ہے، جس کی بنیاد توحیدِ ربوبیت ہے، اور یہ دونوں نظام لازم ملزوم ہیں؛ لہٰذا ایک نظام بگڑتا ہے تو تاریخی عمل کے نتیجے میں دوسرے میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظامِ صلوٰۃ کو اوّلیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کی کارکردگی کے حسن و قبح کے مطابق نظامِ زکوٰۃ کی کارکردگی ہوتی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام نے نظامِ صلوٰۃ یا جمالیاتی، اخلاقی اقدار کو نظامِ زکوٰۃ یا معاشی اقدار پر ترجیح دی ہے۔ لیکن اس جگہ اس لطیف و اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ معاشی نظام کی اصلاح کے بغیر جمالیاتی، اخلاقی اقدار کے نظام کی اصلاح محال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاشی نظام بگڑ جائے تو معاشرے میں خون آشام فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری طبقے پیدا ہو جاتے ہیں، جو دونوں نظاموں کی خرابی کے ذمے دار ہوتے ہیں؛ لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لیے ان معاشرتی سرطانوں کا

اِستیصال ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک یہ سرطانی طبقات معاشرے پر مسلّط رہیں گے، اس کے کسی گوشے میں بھی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ سرطانوں کا استیصال سرطان زدہ معاشرے کی اصلاح یا تعمیرِ نو کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس اِستیصال کا احسن طریقہ حُسنِ انقلاب ہے، جو سنّتِ پیغمبریؐ ہے اور اس کا احسن واکمل نمونہ (: اُسوۂ حسنہ) ہمیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمتہُ للعالمینی میں ملتا ہے، جس کے نتیجے میں دُنیا عالمگیر وہمہ گیر حُسنِ انقلاب سے آشنا ہوئی تھی۔

اسلام کا معاشی نظام: اسلام کے معاشی نظام کی اساس توحیدِ ربوبیّت ہے؛ یعنی اس عقیدے پر کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی اپنی جملہ مخلوقات کا رازق و پروردگار، آقا و مالک اور حاکم ہے؛ نیز آسمانوں اور زمین میں جملہ نعمتوں کا تنہا وہی مالک ہے اور اس نے اُسے اُنھیں کُل افرادِ نسلِ انسانی کے "تمتّع" کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ "تمتّع" قرآن مجید کی ازبس اہم و بصیرت افروز اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے: "استفادہ بقدرِ ضرورت"۔ اس سے مستنبط ہوا کہ کوئی شخص (فرد ہو یا قوم) ضرورت سے زائد مال و دولت جمع کر سکتا ہے نہ اسے فضول خرچ ہی کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، مال و دولت تمتّع کے لیے ہے، اکتناز و احتکار یا اسراف و تبذیر کے لیے نہیں۔

انسان کو کسبِ حلال کی آزادی ہے؛ لیکن وہ جو کچھ کماتا ہے اپنے ربِّ کریم کی عطا کردہ قوتوں اور وسائل کی بدولت کماتا ہے، لہٰذا اس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان کی حیثیت ایسے "امین" کی ہے، جو اس سے معروف طریقے سے تمتّع کرنے کا مجاز ہے، لیکن اسلام اُسے مال و دولت کو محجوب و ناکارہ یا غلط خرچ ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں، کوئی فرد، جماعت یا قوم وسائلِ دولت پر قبضہ جما کر دوسروں کو ان کے تمتّع سے محروم کرنے کی مجاز نہیں، کوئی حکومت کسی فرد، جماعت یا قوم پر جائز و معروف طریقے سے روزی حاصل کرنے کی راہیں مسدود نہیں کر سکتی اور نہ جبر و تشدّد سے اُسے اس کے ربِّ کریم کی نعمتوں سے محروم ہی کر سکتی ہے۔

معاشی نظام کا ایک اہم اُصول سعی واکتساب کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قومی پیداوار یا دولت

میں ہر شخص اپنی سعی و اکتساب کی کیفیت و کمیت کے مطابق حصے کا حقدار ہے۔ کسبِ حلال کا ایک ذریعہ تجارت ہے۔ اسلام میں تجارت اور اس کا نفع حلال لیکن سود اور سودی سرمایہ کاری حرام ہے۔ چونکہ وہ ہر فردِ بشر کو معاشرے کا ایک فعّال و ذمے دار، نیز محنت کار و جفاکش اور حلال خور و محسن فرد سمجھتا اور دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ کاہل و کام چور، حرام خور و سیاہ کار، سودکار و سود خور اور بخیل و مسرف کو بندۂ رحمٰن نہیں، بندۂ شیطان سمجھتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ معاشرے کو خون آشام فرعونی و ہامانی اور آزری و قارونی طبقات سے منزہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے ہر چیز حسین بنائی ہے اور اُسے حسین دیکھنا چاہتا ہے؛ لہٰذا وہ انسان کو محسن اور دولت کو حسین دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ دولت کو حسین بنانے کا ذریعہ زکوٰۃ ہے، اس لیے زکوٰۃ نظامِ اسلام کی دوسری اساس ہے۔ بخلاف اس کے سود غارتگرِ حسنِ دولت ہے، اس لیے حرام ہے۔ زکوٰۃ، انفاق بالعفو اور صدقہ و خیرات سے اگر مال و دولت اور قلب میں حُسن پیدا ہوتا ہے تو اسراف و تبذیر اور بخل و سود سے مال و دولت آگ کے انگارے بنتے ہیں اور قلب و جاں نورِ حُسن سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک ہر انسان واجب التکریم ہے اور عزت کا معیار تقویٰ ہے، مال و دولت، نسب و نجابت یا قوت و صولت نہیں؛ لہٰذا وہ کُل بنی نوع انسان کو متقی و مکرم دیکھنے کا آرزومند ہے۔ علاوہ ازیں، اس کے نزدیک جملہ افرادِ نسلِ انسانی اللہ تعالیٰ کے عیال ہیں اور دُنیا سب کے لیے نعمتوں کا دسترخوان ہے، جس طرح ایک صالح خاندان میں کھانے کا دسترخوان سب افرادِ خانہ کے لیے کھُلا ہوتا ہے۔

کیا اسلامی معاشی نظام کا قیام ممکن ہے؟

اسلام دشمن اقوام اور ان کے پروردہ مستشرقین اپنی منظم و عالمگیر تشہیر بالباطل کے ذریعے اُمتِ مسلمہ سمیت اقوامِ عالم کو یہ باور کرانے میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے ہیں کہ اسلام کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کی قوت و توانائی کا چشمہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں رہا۔ چنانچہ جب کسی گوشے سے اسلام کے معاشی نظام کے قیام کی آواز بلند ہوتی ہے تو اغیار تو کیا خود مسلم دانشور

ہی اُسے مجذوب کی بڑ پر محمول کر کے اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ایسی کوشش پر تحصیلِ لاحاصل کی چھاپ لگانے میں تاخیر نہیں کرتے۔ اس سے عام مسلمان بھی متأثر ہوتے ہیں اور بڑی سادگی سے پوچھتے ہیں: کیا چودہ سو سال پرانا اسلام کا معاشی نظام سائنس و ٹیکنالوجی کے اس جدید و ترقی یافتہ دَور میں قائم ہو سکتا اور کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے؟ ہمارے "دینی" علماء و مشائخ جدید معاشی نظام اور دیگر علومِ جدیدہ سے نابلد ہونے کے سبب چونکہ یہ مسئلہ سمجھ ہی نہیں سکتے، لہٰذا اِس کا نہ تو کوئی معقول جواب دے سکتے ہیں اور نہ اس مسئلے کا کوئی تسلّی بخش حل ہی بتا سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں مسلمان من حیث الأمّہ تشکیک ولاادریت کے شکار ہیں، جو اس کی ذلّت و مسکنت کی بنیادی وجہ ہے، اور ان کی ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

بہر حال، یہ انتہائی اہم معاشی مسئلہ ہے اور فلسفۂ ترجیحات کی رُو سے اس دَور میں بالخصوص اوّلیت کا سزاوار ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے قیام کے بغیر مُسلم ممالک نہ تو خون آشام معاشرتی سرطانوں کی صدیوں کی محکومی و غلامی سے رہائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ قعرِ ذلّت و مسکنت سے نکل کر خوشحالی و ترقی اور آزادی کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آیا مسلم ممالک میں اسلام کا معاشی نظام قائم کیا جا سکتا ہے جو کفالتِ قومی کی ضمانت فراہم کر سکتا ہو؟ قرآن و سُنّہ، آثار و تاریخ اور مغربی اقوام کے کامیاب تجربات کی سند پر ہم کامل ایقان و اذعان کے ساتھ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ماضی میں اسلام کا یہ معاشی تجربہ کامیاب رہا تھا اور اُس نے اہلِ دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تو زمانۂ حال میں اس کے کامیاب ہونے کے متعلق شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے اس کامیاب تجربے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مغربی اقوام نے نظامِ کفالتِ قومی کو اپنا کر ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام اپنی کُلّی و جزوی حیثیت میں عامۃ الناس کے بہترین مفاد میں ہے اور اُنھیں بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ بلا وجہ تشکیک ولاادریت کامیابی کی راہ میں سدِ سکندری بن جایا کرتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کا دور آیا تو اس میں معاشرتی سرطانی طبقوں کا پیدا ہو جانا تاریخی عمل کا نتیجہ تھا۔ چونکہ سرطانی طبقات ارِبعہ مزارعوں اور محنت کشوں کے خون پر نشو و نما پاتے ہیں، لہٰذا انھوں نے مشترکہ مفاد کی خاطر باہم مل کر تاویل بالباطل اور تشہیر بالباطل کے ذریعے اسلام کے معاشی نظام کی ہیئت کو اس طرح مسخ اور اس کے مقاصدِ جلیلہ کو اس طرح بدل ڈالا کہ وہ بجائے رحمت کے مزارعوں اور محنت کشوں کے لیے بالخصوص محکومی و غلامی اور ذلّت و مسکنت کا آلۂ کار بن گیا۔ ہوا یوں کہ انھوں نے رعایا بالخصوص مزارعوں اور محنت کشوں کو اپنا محتاج و دست نگر اور محکوم و غلام بنانے کی خاطر لوگوں کے لوحِ ذہن سے قرآنِ حکیم کا یہ معاشی اصل الاصول محو کر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ کفالتِ قومی اسلامی حکومت کی اوّلین ذمے داری اور اس کا بنیادی فریضہ ہے۔ انھوں نے اُمّتِ مسلمہ پر مزید ظلم یہ کیا کہ جاگیرداری و زمینداری اور سودی سرمایہ کاری اور اس کی ہر شکل مثلاً مزارعت و مضاربت، اجارہ داری و کرایہ داری اور اکتناز و احتکار کو شرعاً جائز قرار دیا۔ اس فتوے سے ایک طرف اُمّتِ مسلمہ نے فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کا وجود عملاً تسلیم کر لیا اور دوسری طرف محنت کشوں کو ہمیشہ کے لیے معاشرتی سرطانوں کا محتاج و دست نگر اور محکوم و غلام بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں انسانی احترام اور آزادی کا جنازہ اُٹھ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخِ اسلام کا یہ سب سے بڑا اور انتہائی عبرت ناک اور دُور رس نتائج کا حامل المیہ تھا جس نے تحریکِ اسلام کو غلط راہوں پر ڈال دیا اور اس کی روحِ رحمۃٌ للعالمینی کو سلب کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سرطانی معاشرے میں لوگ آزادی و احترامِ انسانی کے مفہوم سے ناآشنا ہو جاتے ہیں، اور ان کے لیے اسلام کے معاشی نظام کی ہیئت کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا اور اس کے مقاصدِ جلیلہ کا ادراک کرنا اور ان کے حقیقی مفہوم کو سمجھنا ازبس دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں سیاسی رہنماؤں، مذہبی علماء و مشائخ، "دانشوروں" اور معاشی مفکّرین و ماہرین کو اسلام کے معاشی نظام کی تعمیرِ نو کا مسئلہ لاینحل نظر آتا ہے؟

اس گفتگو کے بعد بھی یہ سوال حل طلب رہتا ہے کہ آیا سرطان زدہ مسلم ممالک میں اسلام کے معاشی نظام کا قیام ممکن ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ اس اہم سوال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور قرآنِ حکیم کی رُو سے اس کا مطلب زندگی کا اکمل و احسن نظری و عملی نظام ہے، لہٰذا اس کا کُلّی یا جزوی

طور سے نافذ العمل ہونا نہ صرف ممکن ہے، بلکہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، لہٰذا اس کا قیام و نفاذ اس اعتبار سے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر نہ معاشرتی امن قائم ہو سکتا ہے اور نہ افرادِ معاشرہ آرام سے زندگی ہی گزار سکتے ہیں۔ اس بنا پر پورے وثوق سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نظامِ اسلام ہی حیاتِ انسانی کے لیے موزوں ترین ہے اور اس میں دیگر تمام نظاموں پر غالب آنے کی صلاحیت ہے جس طرح نامیاتی وجود ہر لحظہ صحت و شفا کا متقاضی رہتا ہے، اسی طرح وجودِ معاشرہ کو بھی صحت و شفا کی طلب و جستجو رہتی ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ اسلام کا نظامِ زندگی ہے جس کا جزوِ اعظم ولاینفک معاشی نظام ہے۔

اب اس سوال کی دوسری شق سامنے آتی ہے کہ یہ نظام کیسے قائم اور نافذ العمل ہو سکتا ہے؟ اس کا ابتدائی جواب ہمیں سرطان زدہ وجودِ انسانی میں ملتا ہے۔ جس طرح بدن کا سرطانی مرض پھیل کر لادوا ہو جائے تو اس کا علاج جرّاحی ہی کے ذریعے کیا جاتا ہے، اسی طرح وجودِ معاشرہ کے سرطانی مرض کا آخری علاج جراحتِ مسیحائی یا حُسنِ انقلاب ہے۔ بہر حال جس طرح کسی بوسیدہ عمارت کی تعمیرِ نو مقصود ہو تو پہلے اس کی بیخ کنی لابدی ہوتی ہے، اُسی طرح اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو کے لیے موجودہ سرطانی معاشروں کا استیصال ناگزیر ہے؛ اور اس کا بہترین ذریعہ حُسنِ انقلاب ہے، جس کا احسن و اکمل نمونہ (= اُسوۂ حسنہ) رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حسنِ انقلاب ہے۔ ہمیں انقلاب کا یہ اصل الاصول یاد رکھنا چاہیے کہ "انقلاب آفرینی کی پیش شرط آرزوئے انقلاب ہے"۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ یہ اصولِ انقلاب قرآنِ مجید سے ماخوذ ہے تو پھر عامۃ النّاس میں سے بالخصوص کسانوں اور محنت کشوں کے دلوں میں آرزوئے حسنِ انقلاب کا احیاء ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مرفّہ الحال طبقات (اصطلاحِ قرآن میں مُترَفین[۴۴]) تو حُسنِ انقلاب کی آرزو کبھی کر ہی نہیں سکتے، اس لیے کہ یہ ان کے لیے پیغامِ ہلاکت و بربادی ہے، اور انھیں مال و دولت، عیش و عشرت، حاکمیت و سیادت، قوّت و سطوت اور شان و شوکت سے محروم کر دے گا۔ علاوہ بریں، تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی ملک و قوم میں انقلاب آیا، اس کے لانے والے مظلوم و مفلوک الحال مزارعین اور محنت کش طبقات تھے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حُسنِ انقلاب کی تحریک کا مقصودِ اوّل

لوگوں کے دلوں میں آرزوئے حسنِ انقلاب کا احیاء، مقصودِ دوم سرطانی طبقات کا استیصالِ کُلّی اور مقصودِ آخری نظامِ اسلام کا قیام و نفاذ ہے۔

ان مباحث کا ماحصل یہ نکلا کہ نہ صرف پاکستان بلکہ کسی مسلم ملک میں بھی اسلام کا معاشی نظام قائم نہیں اور نہ حُسنِ انقلاب کے پہلے قائم ہی ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں ایک طرف جاگیرداری و زمینداری، سرمایہ کاری و سود کاری، کرایہ داری و دستارگیری، اجارہ داری و رشوت ستانی، ظلم و استحصال، مضاربت و مزارعت کو روا رکھا جائے اور دوسری طرف اس میں عدل و احسان، زکوٰۃ و انفاق بالعفو اور کفالتِ قومی کا فقدان ہو، وہاں اسلام کے معاشی نظام کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ظلم و جہل کی حد یہ ہے کہ ہم سرطانی معاشروں پر اسلام کی چھاپ (لیبل) چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو خود فریبی و خدا فریبی اور قوم فریبی بھی ہے اور اسلام کے نام کے ساتھ تمسخر اور اسے بدنام کرنے کا بڑا ہی سنگین جرم بھی۔ اگر ہم پاکستان سمیت مسلم ممالک میں اسلام کا معاشی نظام قائم کرنے میں سنجیدہ ہیں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ ہمارا معاشی نظام اسلامی نہیں قارونی۔ سرطانی ہے اور اس کا استیصالِ کُلّی کیے بغیر نظامِ اسلام قائم کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

انفاق بالعفو

(یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کا فی السبیل اللہ خرچ کرنا)

ربِّ علیم کو معلوم تھا کہ نظامِ زکوٰۃ یا معاشی نظام کے مقاصدِ جلیلہ کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کی رقم کافی نہ ہو گی، لہٰذا اُس نے اِیتائے زکوٰۃ کے ساتھ انفاق بالعفو کا حکم بھی صادر فرما دیا۔[۶] اس فرمانِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے جملہ افراد پر فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم کے علاوہ جائز ضرورتِ زندگی سے زائد مال و دولت کو خزانۂ عامرہ میں جمع کرا دیں۔ ایسا کرنا اگر ارشادِ الٰہی کی تعمیل، پیرویِ سُنّتِ رسولؐ، عملِ صالح اور خیر و حسنہ ہے تو ایسا نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، سنّتِ حسنہ سے انحراف اور بُخل و اکتناز ہے، جو جرم و ظُلم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اس سے نفس کو سرطانی مرض لاحق ہو جاتا ہے، جو نوعیت میں وبائی ہے

اور نفسِ معاشرہ کو لگ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان اسراف و تبذیر، سود خوری و حرام کاری، نمود و نمائش، اِستحصال و ناانصافی اور ہوس و تکاثر ایسے مہلک امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان سرطانی امراض کے تحفظِ ماتقدم، نیز ان کے علاج و شفا کی خاطر ربِّ رحیم نے اہلِ ایمان کو زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے ساتھ عدل و احسان اور صدقات و خیرات کے احکام بھی صادر فرمائے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان اور اسی قبیل کے دیگر احکامِ الٰہی کی غایت قومی اور بین الاقوامی سطح پر افراد و نسلِ انسانی کی کفالت و خوشحالی، نیز خوف و حزن سے تحفظ و صیانت ہے یہی درحقیقت اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا مقصودِ حقیقی ہے اور اسی بنا پر اس تحریک کے بانی و علمبردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ربّ العالمین نے رحمۃ للعالمین اور حاملِ خُلقِ عظیم ایسے انتہائی عظیم و بے مثال القاب سے سرفراز فرمایا ہے۔ یہ نکتہ از بس فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ اُس نے آپؐ کی بعثت کی غایت ہی رحمۃ للعالمینی بتائی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیآء ۲۱: ۱۰۷)، اور ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لیے رحمتِ محض بنا کر بھیجا ہے۔

اِس ارشادِ الٰہی میں جہاں یہ مژدہ بصورتِ پیش گوئی تھا کہ آپؐ انجام کارِ عالمِ انسانی کے لیے بالخصوص اور دیگر عوالم (مثلاً حیوانی، نباتاتی، جماداتی، سماوی اور الجوانی) کے لیے رحمت بنیں گے، وہاں یہ حکم بھی تھا کہ آپؐ رحمۃ للعالمین بننے کے لیے تحریک چلائیں۔ چنانچہ آپؐ نے تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا آغاز کیا اور اس عالم میں کیا کہ آپؐ تنہا تھے اور سارا معاشرہ سرطان زدہ تھا۔ چونکہ اس تحریک کا مقصد معاشرے کو معاشرتی سرطانوں سے پاک و صاف کرنا تھا اور اس کے لیے اس کا اِستیصالِ کُلی ناگزیر تھا، لہٰذا ان کا مشتعل ہو کر دُشمن بن جانا تاریخی عمل تھا۔ چنانچہ وہ آپؐ کی جان اور تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے دُشمن بن گئے اور دونوں کا خاتمہ کرنے کے درپے ہو گئے۔ حالات اِنتہائی ناساعد و صبر آزما تھے اور آپؐ کے سوا سب کے لیے ہمت شکن و صبر شکیب رُبا ہو سکتے تھے، لیکن آپؐ کی خودی انتہائی مُحکم و ناقابلِ تسخیر اور آپؐ کا عزم و صبر ناقابلِ شکست تھا، لہٰذا آپؐ مثالی ذوق و شوق سے بے خوف و خطر حسین اِنقلاب کی تحریک چلاتے رہے۔ یہ دیکھ کر ربِّ کریم نے آپؐ کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا:

عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۷۹)؛ عنقریب ہم آپ کو (ارحمۃ للعالمینی کا) ایسا مقامِ ستودہ عطا کریں گے جو قابلِ تحمید و ستائش بھی ہے اور اس کی تحمید و ستائش سدا ہوتی رہے گی۔

اس ارشادِ ربِ ذوالجلال والاکرام میں ایک تو آپؐ کو رضوانِ الٰہی کی، دوسرے مقامِ محمود پر آپؐ کے تمکّن اور تیسرے آپؐ کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی کامیابی کی خوشخبری تھی۔ تاریخ نے دیکھا کہ آپؐ کی مساعیٔ جمیلہ بارآور ثابت ہوئیں اور آپؐ ملک میں تحریکِ حُسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا استیصالِ کُلّی کرنے، نیز اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس عظیم و بے مثال کامیابی کی داد ربِ ذوالمنن نے ان بصیرت افروز الفاظ میں دی! وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۝ (القلم ۶۸: ۴)؛ بلاشبہ آپ خُلقِ عظیم پر ہیں۔

خُلقِ عظیم میں حُسنِ خُلق کی ہمہ گیری و عالمگیری اور مکارمِ اخلاق کے کمال کے معانی مضمر ہیں۔

صدیوں سے مسلم اقوام ایسے ادوارِ ملوکیت میں زندگی بسر کرتی چلی آ رہی ہیں، جن میں معاشرتی سرطانوں کی سیادت و سطوت اور اقتدار و حکومت کے سبب معاشی نظام کبھی اپنی اصل قرآنی شکل میں قائم نہیں ہوا اور نہ انھوں نے اس کے مقاصدِ جلیلہ کو پورا ہی کیا۔ صدیوں سے تاریخ قرآنی نے کبھی کسی مسلم ملک میں حکومت کو رعایا کی کفالت کا انتظام و انصرام کرتے نہیں دیکھا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اسلام کے معاشی نظام کی ہیئت اور اس کے مقاصدِ جلیلہ سے اس قدر نابلد ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ بدک جاتے ہیں اور تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے فنون میں یدِطولیٰ رکھنے والے آزری مشائخ و علمائے سوء دشنام طرازی اور فتویٰ بازی سے سرطانی طبقوں اور ان کے سرطانی معاشی نظام کی حمایت اور اہلِ حق کی آزادیٔ بیان و ابلاغ کو سلب کرنے میں اس طرح لگ جاتے ہیں جیسے جہاد بالحق کر رہے ہوں، حالانکہ اس آزری طبقے کو معاشرتی سرطانوں کے خلاف جہاد بالحق کرنے کی کبھی ہمت و توفیق ہوئی ہے نہ ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ دینِ آزری کے ہیولے ہی میں شرک کی طرح جہاد بالباطل کی صورت مضمر ہوتی ہے۔

غیر اسلامی معاشرے میں انفاق بالعفو یا ضرورت سے زائد مال و دولت خرچ کرنے کا مسئلہ

یہ درست ہے کہ قرآنِ حکیم کے ہر حکم کی تعمیل فرض ہے، لیکن احکامِ الٰہی میں سے ایسے بھی ہیں جو بعض شرائط سے مشروط ہوتے ہیں، مثلاً حج اسلام کا رُکن ہے، لیکن زادِ سفر، سفر کی سہولت اور استطاعتِ بدنی وغیرہ ہو تو فرض ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی فرضیت صاحبِ نصاب ہونے سے مشروط ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس سے یہ منطقی استنباط کر سکتے ہیں کہ جس مسلم معاشرے میں اسلامی معاشی نظام اُسوۂ رسول اللہؐ کے مطابق قائم نہیں اور اس میں رعایا کی کفالت کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور نہ حکومت اسے اپنی بنیادی ذمے داری ہی سمجھتی ہے، اس میں انفاق بالعفو یا مال و دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے امرِ ربی پر عمل کرنے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ اس ارشادِ الٰہی کی تعمیل کے لیے ملک میں ایسے اسلامی معاشی نظام کا قیام ناگزیر ہے، جو رعایا کی کفالتِ کُلّی کا ضامن ہو اور حکومت اس کے لیے رعایا کے سامنے جوابدہ ہو۔

بہرحال، یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اِیتائے زکوٰۃ اور انفاق بالعفو یا فالتو مال و دولت کو خزانۂ عامرہ میں جمع کرانے کے احکامِ قرآنی کی تعمیل کرنا فرض ہے اور نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ چونکہ اسلام کے نظامِ زکوٰۃ یا معاشی نظام کے مقاصدِ جلیلہ میں رعایا کی کفالتِ کُلّی کا حسنِ اہتمام و انصرام اساسی اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا جو مسلم قوم ایسا نہیں کرتی، وہ ایسے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتی ہے جس کے نتائج اس کے حق میں دُور رس اور مہلک ہوتے ہیں، جیسے کہ ہم مسلم ممالک میں دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مسلم اقوام میں تشتت و افتراق، فتنہ و فساد، تضاد و تخالف، ضعف و پس ماندگی، اضمحلال و انحطاط، محتاجی و دست نگری، محکومی و غلامی اور ذلّت و مسکنت کی جو صورتِ حال ہے، اس کے عوامل و مؤثرات میں سے ایک ازبس عامل و مؤثر اسلامی معاشی نظام کا فقدان ہے، خاص کر رعایا کی کفالتِ کُلّی کے نظام کا فقدان۔

اسلامی معاشرے میں ضرورت سے زائد دولت خرچ کرنے کا رہنما اصول

ہم استدلال کی خاطر یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جس میں اسلامی معاشی نظام

قائم ہے اور اس میں کفالتِ قومی کا معقول انتظام ہے۔ ظاہر ہے ایسے معاشرے میں انفاق بالعفو یا ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل ہم پر فرض ہو گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فالتو دولت کو خرچ کرنے کا اصول کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر، فالتو مال و دولت کو خرچ کرنے کے لیے "ضرورت" کی تعیین و تحدید کا معیار کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام کے عدل و احسان اور اخوت و مساوات کے اُصولوں اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سنّتِ حسنہ کے مطابق یہ ہے کہ "ضرورت" کا معیار افرادِ معاشرہ کا عام معیارِ زندگی ہو گا، اور ہر شخص کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی تعیین و تحدید کرتے وقت اس عام معیار کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا تاکہ تفاوت کم سے کم ہو اور موزون و حاجاتی ہو، یعنی ہر شخص کے احوال و ظروف کے مطابق ہو۔ جمالیاتی زبان میں اس کے لیے "اُصولِ حسنِ ضرورت" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انفاق بالعفو کا اصول یہ ہوا کہ حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت (= العفو) کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا یا خزانۂ عامرہ میں جمع کرانا فرض ہے۔

اسلام کے نزدیک دولت انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتی ہے، لہٰذا وہ اُسے افراط و تفریط، بخل و تبذیر، اکتناز و احتکار یا سودی سرمایہ کاری کے ذریعے گردشِ دولت کو غیر متوازن و ناہموار اور اس کے دائرے کو تنگ کرنے یا اس کی رکاوٹ پیدا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اس حکمِ امتناعی میں یہ حکمت بھی مضمر ہے کہ گردشِ دولت میں رکاوٹ بالخصوص نفسِ اجتماعیہ کے لیے ایسی ہی خطرناک و مہلک ہوتی ہے، جیسی گردشِ خون میں رکاوٹ فردِ بشر کے نفس کے لیے مہلک ہوتی ہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی کر دینے سے اس مسئلے کو واضح طور سے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ قرآنِ مجید احکامِ الٰہی، نیز زندگی کے رہنما اصولوں اور تعلیمات کی کتابِ سماوی ہے تو مہبطِ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبہ اس کی عملی تفسیر ہے۔ سائنس کی زبان میں قرآن مجید قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہے تو سیرتِ طیبہ ان کا عمل و تجربہ ہے۔ اس بنا پر یہ ہماری سچی اور قابلِ اعتماد رہنما ہے۔ چنانچہ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعے سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ مہبطِ قرآن پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عمر بھر انفاق بالعفو کے حکمِ الٰہی پر عمل کیا، حتیٰ کہ وفات کی چند ساعات پہلے آپؐ کو یاد

آیا تو آپؐ نے ان دو ایک سُرخ دیناروں کو بھی خیرات کر دیا جو "العفو" تھے، یعنی ضرورت سے زائد آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس رہ گئے تھے، اس لیے کہ وہ آپؐ کی تیمارداری کی مشغولیت کے سبب اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھول گئی تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اپنے پاس بیکار جمع رکھنا، اکتناز و بخل ہے، جو حرام ہے اور اسے فی سبیل اللہ خرچ کرنا بھی فرض ہے اور سنتِ مؤکدہ بھی۔

تاریخ اور کتبِ سیرت و حدیث شاہد ہیں کہ آپؐ نے عمر بھر انتہائی سادہ زندگی بسر کی؛ کبھی اکتناز و احتکار اور بخل و جمعِ مال کو روا نہ رکھا، اس لیے کہ آپؐ نے ساری عمر انفاق بالعفو کے حُکمِ قرآنی پر عمل کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کبھی صاحبِ نصاب نہ ہوئے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ آپؐ کا سچا پیروکار یعنی آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی کرنے والا مثالی مؤمن صاحبِ نصاب نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ قرآن و سُنّت کے مطابق ضرورت سے زائد مال و دولت اپنے پاس جمع رکھ ہی نہیں سکتا۔ یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ چونکہ انفاق بالعفو کے حُکم کی رُو سے اہلِ ایمان کو حسنِ ضرورت کے مطابق مال و دولت رکھنے کی رخصت ہے، لہٰذا وہ صاحبِ نصاب بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض صحابۂ کرامؓ صاحبِ نصاب تو بنے، لیکن ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ انفاق بالعفو کے حُکم پر بھی برابر عمل کرتے رہے۔ وہ حُکمِ الٰہی سے سرتابی کر سکتے تھے، نہ سنتِ حسنہ کو ترک ہی کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے ایسا کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حکومت کو جب بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود، تحریکِ اسلام کے دائرے کو وسیع کرنے یا دفاعی یا جہاد کے لیے مال و دولت کو خرچ کرنے کی ضرورت پڑی تو صحابہ کرامؓ نے رضاکارانہ طور سے حتی الامکان حکومت سے تعاون کیا اور ضرورت سے زائد مال و دولت (= العفو) بلکہ بسا اوقات اپنی ضروریاتِ زندگی کی پروا کیے بغیر حکومت کو سب کچھ دے دیا۔ اس طرح انھوں نے انفاق بالعفو کے فرمانِ الٰہی اور سنّتِ پیغمبریؐ پر ہمیشہ عمل کیا۔ وہ نہ تارکِ قرآن و سنّت ہو سکتے تھے نہ ہوئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ اس سے خوش تھے، نیز عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کا معاشی نظام مثالی تھا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سربراہِ مملکت اور سپہ سالارِ اعظم بھی تھے اور آپؐ کے پاس مال و دولت بھی آتا تھا، لیکن آپؐ سب کچھ معاشرے کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود،

نیز دفاعی امور اور تحریکِ اسلام پر خرچ کر ڈالتے تھے اور خود انتہائی سادگی اور عسرت سے زندگی کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے خانوادے کا معیارِ زندگی عوام کے معیارِ زندگی سے ہرگز بلند نہ تھا بلکہ بہتوں سے کمتر تھا۔ یہ ہے آپؐ کی سنّتِ حسنہ جسے مدعیانِ اتباعِ سنّت مسلمان فراموش کر چکے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ "معاشرتی سرطانیت" ہے، جو صدیوں سے مسلم معاشروں پر مسلّط ہے۔ اس کی ایک پہچان یہ ہے کہ جہاں معاشرتی سرطان ہوں گے وہاں سادگی و قناعت کی جگہ اسراف و تبذیر، تکلفات اور حرص و تکاثر کی گرم بازاری ہوگی، رزقِ حلال پر رزقِ حرام کو ترجیح دی جائے گی اور عزّت و تکریم کا معیار تقویٰ کے بجائے مال و دولت اور حکومت و اقتدار ہوگا۔ الغرض، اسلام ہمیں سادگی و قناعت اور رزقِ حلال، نیز اخوّت و مساوات کی وصیّت کرتا اور قارونی و فرعونی اور آزری و ہامانی کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے، اور یہی انفاق بالعفو یا حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کی علّتِ غائی ہے۔

"العفو" یا حُسنِ ضرورت کی تعیین و تحدید کے ضمن میں ایک ٹھوس، واضح اور بصیرت افروز مثال ہمیں نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس بصیرت افروز رویّے میں ملتی ہے جو آپؐ نے اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اپنے ایک صحابیؓ کے ساتھ روا رکھا تھا، جنھوں نے عام معیارِ زندگی سے ہٹ کر اپنے لیے ایک گنبد دار مکان تعمیر کرایا تھا، جو "حسنِ ضرورت" سے بلند تر ہونے کا غمّاز تھا۔ چونکہ اس فعل سے معاشرے کے توازن میں برہمی اور اس میں جذبۂ تکاثر کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا، لہٰذا آپؐ کو سخت ناگوار گزرا۔ چنانچہ آپؐ نے معاشرتی مفاسد کے سدِّباب اور معاشرے میں اخوّت و مساوات کی فضا قائم رکھنے کی خاطر اس صحابیؓ سے ترکِ التفات کا رویّہ اختیار کر لیا، جو آپؐ کی ناراضی کی علامت ہوتا تھا۔ رحمۃ للعالمینؐ کی ناراضی چونکہ رفعِ فساد اور اصلاحِ احوال کی غرض سے ہوا کرتی تھی، اس لیے اس میں رحمت مضمر ہوتی تھی، اور مزاج شناسانِ رسول اس حقیقت سے آشنا تھے۔ چنانچہ جب اس صحابیؓ کو آپؐ کی وجہِ ناراضی کا علم ہوا تو انھوں نے بلاحیل و حجّت اور بغیر تاخیر کے اپنے مکان کی ہیئت تبدیل کر دی اور قبّہ گرا دیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں قناعت و سادگی، مساوات و اخوّت، حسنِ ضرورت اور معاشرتی عدل و توازن کو غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے۔

معاشرتی سرطانوں کی تشہیر و تاویل بالباطل سے متاثر و مرعوب ہو کر اُمّتِ مسلمہ کی اکثریت اس زعمِ باطل میں مبتلا ہے کہ زکوٰۃ کے حکم نے انفاق بالعفو کے فرمانِ الٰہی کو ساقط کر دیا ہے، حالانکہ اپنے اس مؤقف کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی نصِ قرآنی ہے نہ حجتِ شرعی، بلکہ نصِ قرآنی و سُنّتِ حسنہ دونوں نہ صرف اس کے نظریے کی تکذیب کرتی ہیں، بلکہ انفاق بالعفو کی فرضیت پر دلائلِ قطعیہ ہیں۔ باوجود اس کے آزری سرطانوں کی تشہیر بالباطل سے متاثر و مرعوب ہو کر اکثر علماء و مشائخ اور دانشور اس غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں کہ ایتائے زکوٰۃ کے حکم سے انفاق بالعفو کا فرمانِ الٰہی و سنّتِ حسنہ ساقط و متروک ہو چکے ہیں اور اپنے اس غلط موقف کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین (تو بہ نعوذ باللہ دخاکم بدہن) قرآن و سُنّہ کے تارک اور اکتناز و احتکار کرتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ کے پاس تجارت و غنائم کے ذریعے دولت تو آئی، لیکن انھوں نے اسے جمع کیا نہ محجوب و ناکارہ ہی بنایا اور نہ اس کی گردش میں کوئی رکاوٹ ہی پیدا کی، برخلاف اس کے انھوں نے اسے کاروبار میں لگائے رکھا۔ اس طرح ایک تو دولت کو گردش میں رکھا اور دوسرے اس کی گردش کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ زکوٰۃ اور انفاق بالعفو کے احکامِ الٰہی پر برابر عمل پیرا رہے اور حکومت کو جب بھی جہاد اور رفاہی امور کے لیے مال و دولت کی ضرورت پڑی، انھوں نے حکومت سے بھرپور تعاون کیا اور حتی الوسع اپنا مال و دولت اس کے حوالے کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے روحِ قرآن اور سُنّتِ حسنہ کے مطابق ہمیشہ انتہائی سادگی و قناعت سے زندگی گزاری اور اپنا معیارِ زندگی عوام ایسا ہی رکھا۔

یہاں اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اسلام میں اکتناز و احتکار یا جمع مال و بخل کے ذریعے دولت کو محجوب و ناکارہ بنانے، اس کی گردش میں رکاوٹ پیدا کرنے یا اس کے دائرے کو محدود و تنگ کرنے کی ممانعت ہے؛ لیکن جائز طریقے سے، زیادہ سے زیادہ دولت کمانے پر کوئی پابندی نہیں؛ بشرطیکہ دولت کو کاروبار و صنعت کاری وغیرہ کے ذریعے گردش میں رکھا جائے اور اس سے قوم و ملّت اور نوعِ انسانی بلکہ دیگر مخلوقات کو بھی فائدہ پہنچایا جائے؛ نیز منافع میں سے حصہ

سعی و محنت اور عدل و احسان کے قرآنی اصولوں کے مطابق لیا جائے۔ یہ یاد رہے کہ جدید نوعیت کی سرمایہ کاری حرام ہے، اس لیے کہ اس کے نظام کی تاسیس سود اور طلب و رسد کے غیر منصفانہ اصولوں پر کی جاتی ہے۔

اِس بحث سے یہ از بس اہم اُصول مستنبط ہوا کہ اسلامی مملکت کے ہر شہری کو اپنے معاشرے کے عام معیارِ زندگی کا پاس و احترام کرنا اور اس کے مطابق بسر اوقات کرنا، اِتباعِ سنّتِ حسنہ بھی ہے اور اسلامی اخوّت و مساوات کا مقتضیٰ بھی۔ علاوہ ازیں، اہلِ ایمان چونکہ نہ تو اکتناز و احتکار اور نہ اسراف و تبذیر کے مجاز ہیں، لہٰذا اپنی جائز ضروریات کے لیے مال و متاع رکھنے کے بعد، جو مال و دولت باقی رہ جائے، اُسے خزانہ عامرہ میں داخل کرانا، انفاق بالعفو کے حُکمِ الٰہی کی رُو سے لابدی ہے؛ اور ایسا نہ کرنا نافرمانی و گناہِ کبیرہ ہے، بشرطیکہ ملک میں حکومت کی طرف سے رعایا کے حسنِ کفالت کا معقول انتظام ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اسلام کے معاشی نظام کے مقاصدِ جلیلہ، خصوصاً کفالتِ قومی سے ناآشنا اور غیر اسلامی نظامِ حکومت میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اگر وہ انفاق بالعفو کی وجہ سے مال و دولت جمع نہیں کر سکیں گے تو ان کا مستقبل مخدوش ہو جائے گا؛ چنانچہ وہ عموماً یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کسی حادثے، آفت، بیماری، بیکاری، پیری یا معذوری کی صورت میں ہمارا اور ہمارے بال بچوں کا کیا بنے گا؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں اسلامی حکومت ان کی کفالتِ کُلّی کی ذمے دار ہوگی، اس لیے کہ قومی کفالت اسلام کے معاشی نظام کی غایت الغایات اور اسلامی حکومت کا فرضِ منصبی ہے۔

اگرچہ اسلامی حکومت میں ایسے معاشی اندیشوں کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے، لیکن پھر بھی مسلمان اکتناز و احتکار ایسے افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کیے بغیر اپنی جائز ضروریات کے لیے اپنی جائز کمائی میں سے پس انداز کر سکتے ہیں؛ بلکہ اسلام کی معاشی حکمتِ عملی کا تقاضا ہے کہ انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے؛ بشرطیکہ معاشرتی حالات انھیں ایسا کرنے کی اجازت دیں۔ بہرحال ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام

میں اکتناز و احتکار، جمعِ مال و دولت اور بخل و منعِ ماعون حرام ہے، لہٰذا ان سے بچنا لازمی ہے۔
علاوہ بریں، سائل و محروم کے حقوق کی ادائی بھی اسلامی معاشرے کے افراد پر فرض ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی معاشرے کو محولۂ بالا چار امتیازی خصوصیات میں سے ایک کفالتِ قومی و مُلکی کا معاشی نظام ہے، جس کا پاکستان سمیت جملہ مسلم ممالک میں فقدان ہے۔ اس پر بھی ہر ملک میں معاشرتی سرطانوں نے تشہیرِ باطل کے ذریعے سادہ دل مسلمانوں کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ ان کے ممالک اور معاشرے اسلامی ہیں۔

انفاق بالعفو اور زکوٰۃ و وراثت

جب یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو انفاق بالعفو یعنی حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت (العفو) کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے حکومت کے حوالے کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اُمّتِ مسلمہ پر فرض ہے؛ نیز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر دمِ واپسیں تک عمل کیا تو پھر اس پر عمل نہ کرنا یا اس کا انکار بالتّاویل کرنا گناہِ کبیرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ بحیثیتِ قوم و ملت ہماری ذلّت و مسکنت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ "ہم جانتے ہیں پر مانتے نہیں"۔ ہماری نافرمانی اور انکار بالتّاویل کی وجہِ حقیقی یہ ہے کہ ہم صدیوں سے غیر قرآنی یا سرطانی معاشروں میں زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں اور ہمارے پاس علم و ادب اور فقہ کا جو سرمایہ ہے وہ اُنھیں ادوار اور معاشروں کا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک تو ہمارے ذہن میں اُس اسلامی معاشرے کے واضح خط و خال نہیں ہے، جسے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل دیا اور جس کی مزید تعمیر و تزئین خلفائے راشدہؓ نے کی تھی، دوسرے جب ہم احکامِ قرآن کو اپنے غیر اسلامی نظامِ معاشرہ پر منطبق کرنا چاہتے ہیں اور وہ منطبق نہیں ہو پاتے تو بجائے اس کے کہ ہم اپنے معاشروں کو حسنِ انقلاب کے ذریعے اسلامی بنائیں اور پھر ان میں احکامِ قرآن نافذ کریں، ہم تاویل باطل کے ذریعے اُنھیں مسترد کر دینے کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ عادت قوم کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم قرآنِ حکیم ایسی نعمتِ عظمیٰ سے بہت دُور ہو چکے

ہیں اور ہمارے درمیان مغائرت کی خلیج حائل ہو چکی ہے، جسے دُور کرنے کا واحد ذریعہ حُسنِ انقلاب ہے۔

بہر حال، یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ انفاق بالعفو یعنی حُسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو قوم و ملّت کے لیے خرچ کرنا ارشادِ الٰہی بھی ہے اور رحمۃٌ للعالمینؐ کی سُنّتِ حسنہ بھی، آزری طبقے یا علمائے سوء یہ اعتراض کرنے کے عادی ہیں کہ اس ارشادِ الٰہی پر عمل درآمد کرنے سے زکوٰۃ و وراثت کے احکامِ الٰہی ساقط ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ یہ تاریخی حقیقت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ دمِ واپسیں تک اس حکمِ قرآنی پر عمل کرتے رہے، حتّٰی کہ آپؐ نے عالمِ نزع میں بھی امُ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس صدقہ کے لیے رکھی ہوئی دو اشرفیوں کو تقسیم کر دیا تھا، جو العفو تھیں۔ یہ اور اس سے ملتے جلتے اعتراضات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ہمارا مدرسہ علم و حکمت اور تحقیق و تدبّر سے خالی ہو چکا ہے، اور ہمارے نام نہاد مذہبی علماء کورانہ تقلید کے خوگر اور ذوقِ اجتہاد سے ناآشنا ہیں۔ علاوہ بریں، وہ اپنی پیشوائیت کے تحفّظ کی خاطر غیر اسلامی و سرطانی معاشرے کا استیصال کر کے اس کی جگہ قرآنِ حکیم اور اُسوۂ حسنہ کے مطابق اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو کرنے کے حق میں نہیں، اگرچہ اسلامی معاشرے کے قیام کا نعرہ لگانا ان کی پیشہ وارانہ مجبوری ہے۔ بہرکیف، اس سوال کا ایک الزامی جواب تو یہ ہے کہ محض ایک "مفروضے" کی خاطر از بس اہم ارشادِ الٰہی اور سنّتِ حسنہ کو ترک کرنا کہاں کا اسلام اور مسلمانی ہے؟ پھر اگر عہدِ نبویؐ میں مسلمانوں کا اس ارشادِ الٰہی پر عمل کرنے کے ساتھ احکامِ زکوٰۃ و وراثت پر عمل کرنا بھی ثابت ہے تو پھر اس پر ہمارے عمل کرنے سے زکوٰۃ و وراثت کے احکام کیسے ساقط ہو سکتے ہیں؟

اصل یہ ہے کہ ایسے اعتراضات دَورِ ملوکیت میں معاشرتی سرطانوں کے سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظاموں کی پیداوار ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو حکومت کے حوالے کر دینے کے ارشادِ باری تعالیٰ پر عمل کرنے سے نہ تو سرمایہ داری و جاگیرداری کے نظام قائم رہ سکتے تھے اور نہ معاشرتی سرطانوں کی سیادت و سطوت۔ چنانچہ جس طرح عہدِ نبویؐ میں اکابرِ قریش کو یہ منظور نہ تھا کہ معاشرے میں عزّت و احترام کا معیار تقویٰ قرار پائے اور وہ اپنی پیشوائیت، سیادت و تفوّق اور امارت و غُلُو سے محروم ہو جائیں۔ اسی طرح آج کے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری طبقوں کو یہ منظور نہیں کہ مسلم ممالک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے

اور وہ انفاق بالعفو کے فرمانِ الٰہی پر عمل کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں اپنے مال و دولت، شان و شوکت، سیادت و حاکمیت، تفوّق و عُلوِ مرتبت اور اقتدار و پیشوائیت سے محروم ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت خرچ کرنے کے فرمانِ الٰہی سے زکوٰۃ و وراثت کے احکام پر قطعاً کوئی زد نہیں پڑتی اور نہ کوئی حکم ساقط ہی ہوتا ہے۔ یہ محض پراپیگنڈہ یا تشہیر بالباطل ہے، جو اسلام کے خلاف یہود کی عالمگیر سازش کا شاخسانہ ہے، جس کا بہت کم شعور رکھتے ہیں۔ اس قسم کی تشہیر بالباطل کا مقصد مسلمانوں کو ان کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کی قوّت و توانائی سے اور مسلم معاشروں کو احکامِ الٰہی کے نور و ہدایت سے محروم رکھنا ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد اب ہم محوّلہ بالا اعتراض کا جواب دیتے ہیں، جو بے بنیاد ہونے کے باوصف تشہیر بالباطل کی بدولت مشہور و مقبول ہے۔ انفاق بالعفو کے سلسلے میں سب سے پہلے ایک بار پھر اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ "ضرورت" سے زائد مال و دولت کے حُکمِ انفاق میں حفظِ ماتقدم یا غیر متوقع و مفاجاتی اخراجات کے لیے "ضرورت" کے مطابق مال و دولت رکھنے کی رُخصت بھی ہے اور فہمائش بھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ "ضرورت" کے مطابق مال و دولت رکھنے سے اہلِ ایمان صاحبِ نصاب بھی بن سکتا ہے اور مورث بھی۔ بالفاظِ دیگر، اہلِ ایمان عام معیارِ زندگی کے مطابق باندازۂ ضرورت اس قدر مال و دولت رکھنے کے مجاز ہیں، جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، نیز وہ میراث بھی چھوڑ سکتے ہیں؛ لہٰذا انفاق بالعفو کے فرمان پر عمل کرنے سے زکوٰۃ و میراث کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں نہ ان کے ساقط ہونے کا سوال ہی پیدا ہوتا ہے۔ غور کریں تو العفو، زکوٰۃ اور میراث کے احکامِ ثلاثہ ایک ہی اصل کے تین فروع ہیں۔

یہ اصل اہلِ ایمان کے ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم اور سُبحان و قدیر ہے، لہٰذا اس کے احکام عبث و متناقض ہو سکتے تھے نہ ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنا یا سوچنا، انسان کو کُفر کے قریب کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں، مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ پورے طور سے حیطۂ اسلام میں داخل ہوں اور جملہ احکامِ الٰہی کو قولاً و فعلاً تسلیم کریں۔ یہ نہیں کہ بعض احکام کو مانیں اور بعض کا تاویل بالباطل یا شرعی حیل سے قولاً یا فعلاً انکار کریں۔ اسی طرح نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحیح معنوں میں متبعین وہ

اہلِ ایمان ہیں جو آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی کرتے ہیں؛ یہ نہیں کہ بعض سُنَنِ جمیلہ پر عمل کریں اور بعض کو شرعی حیل و تاویل بالباطل سے ترک کر دیں۔ ہم کیوں سچے مسلمان نہیں؟ ہم کیوں دائرۂ اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں؟ اس کی وجہِ حقیقی یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں صدیوں پرانی "سرطانیت" کے سبب ہم پوری طرح دائرۂ اسلام میں داخل نہیں اور "نیمے دروں، نیمے بیروں" کی مثال ہم پر صادق آتی ہے؛ نیز ہم قرآن و سُنّہ دونوں کے متّبعین ہونے کے مدّعی تو ہیں، لیکن عملاً دونوں کے تارک ہیں، گو جزوی طور سے دونوں پر عمل بھی کرتے ہیں اور خرقۂ سالوس پہن کر اسلام اور اس کے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا دم بھی بھرتے ہیں۔ ہم اپنی اس منافقانہ روش کے بیشک ذمے دار ہیں، لیکن اس کی ذمے داری ہمارے معاشرتی سرطانوں پر بھی عائد ہوتی ہے، جو مسلمانوں کو دین کی راہ میں چلنے نہیں دیتے؛ اُنھیں اسلام میں پورے طور سے داخل نہیں ہونے دیتے اور جُملہ احکامِ الٰہی پر عمل نہیں کرنے دیتے۔

علاوہ بریں، معاشرتی سرطان خاص طور سے اسلام کا معاشی نظام، جس کی خصوصیت کفالتِ قومی کا حُسنِ انتظام ہے، قائم نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ اس طرح لوگوں کا استحصال و خون آشامی نہیں کر سکیں گے، نیز نہ سودی سرمایہ کاری (، مضاربت و مزارعت، کرایہ کاری و دستارگیری، احتکار و جلبِ منفعت، ہمگلنگ اور سرکاری محصولات کی چوری) ہی کر سکیں گے، بلکہ قارونی چھوڑنے اور محنت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس گفتگو سے منطقی طور سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب تک مسلم ممالک، خصوصاً پاکستان میں معاشرتی سرطانوں کی سیادت و سطوت اور حکومت و عملداری ہے، اسلام کا کفالتِ قومی اور بلاسود معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا، لٰہذا یہ نظام قائم کرنے کی خاطر معاشرتی سرطانوں کا استیصال ناگزیر ہے۔

سود: معاشی سرطانیت

اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول حرمتِ ربوٰ ہے۔ اس کا مادہ رب و ہے، جس میں راس المال یا اصل سرمائے (Capital) پر مزید کچھ لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے، مثلاً روپیہ پیسہ، پیداوار، کرایہ، پگڑی، معاوضہ، مراعات، مفاد، محنت، بیگار، ہدیہ، عطیہ وغیرہ وغیرہ۔[۹] اسلام میں سود حرامِ مطلق ہے؛

یعنی اس کی ہر صورت حرام ہے، جس طرح سوٗر کا گوشت، پوست، بال، خون، چربی، الغرض ہر چیز حرام و نجس ہے، اور اسے انتہائی گھناؤنا جرم قرار دیا گیا ہے[10]۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ سود اصل میں مال و دولت (سیّال ہو منجمد) کے ذریعے مجبور و لاچار یا اہلِ احتیاج و ضرورت مند لوگوں کے استحصال اور غیر منصفانہ جلبِ منفعت سے عبارت ہے، یہ صریحاً ظلم ہے، لیکن صدیوں سے سرطانی نظامِ معیشت میں زندگی بسر کرنے اور سرطانوں کی تشہیر بالباطل کے سبب سود خور اور سودی سرمایہ کاری کرنے والے، نیز دیگر معاشرتی طبقات بھی سرمائے کی منجمد اور بعض سیّال شکلوں کے سود کو سود ہی نہیں سمجھتے، اور سودی نظام کا جواز پیدا کرنے کی خاطر سود کو منافع، بٹائی، کرایہ، پگڑی وغیرہ وغیرہ ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کی عبرتناک سزا ہے۔ اس بنا پر ہم نے سود خور و سود کار کو سرمایہ دار کو معاشرتی سرطان یا قارون سے اور سود کو سرطانیت سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک سود کاری یا موجودہ سرمایہ کاری اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے[11]۔ اس میں یہ بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے کہ بنی نوعِ انسان کا استحصال کرنا، ان کی کمزوری و مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور ان سے ناانصافی و ظلم کرنا، دراصل ان سے جنگ کرنا ہے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت[12] کے حسین و مکرّم شاہکار اور بندے ہیں، لہٰذا جو سرطانی سرمایہ دار و سرمایہ کار ایسا کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو چیلنج اور ان کے خلاف بغاوت و محاذ آرائی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جو قوم سود خوری و سود کاری کر کے اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرتی ہے، وہ مؤمن و متقی کیسے ہو سکتی ہے اور اس سے بڑھ کر ان کا دشمن و باغی، نیز مجرم و گناہگار کون ہو سکتا ہے؟

آئیں، ہم دیکھیں اور غور کریں کہیں بحیثیت قوم و ملّت ہم سود خور و سرمایہ کار تو نہیں؟ کیا ہمارے معاشی نظام کی اساس سود پر یا سودی سرمایہ کاری پر قائم تو نہیں؟ کہیں ہمارا قومی و ملّی شعار مزارعوں، محنت کشوں اور حاجت مندوں کا استحصال کرنا اور ان کے ساتھ ناانصافی روا رکھنا تو نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر ہم بھی بلاشبہ قرآنِ حکیم اور احادیثِ جمیلہ کی رو سے ظالم و جاہل، مجرم و گناہگار اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبولؐ کے دشمن و مقاتل ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ہمارا اپنے آپ کو مسلمان و

مؤمن، متقی و صالح، زاہد و عابد، عالمِ دین و رہنما، پیر و مرشد اور شیخ و خطیب سمجھنا اور کہلانا ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

آج کل کی سرمایہ کاری کی ہر شکل سود کاری ہے، جو دراصل "استحصال بالمال" ہے، جس کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے۔ سرمایہ یا دولت چاہے زرِ سیال (یہ سکہ رائج الوقت یا (Currency) کی صورت میں ہو یا زرِ منجمد (مثلاً تمسکات، حصص، ہنڈیوں، سرکاری قرارناموں (Bonds)، سرمایہ کاری دستاویزات (Debentures)) کی جائیدادِ منقولہ کی شکل میں یا غیر منقولہ کی، اسے اہلِ احتیاج کو جلبِ منفعت کی غرض سے استعمال کے لیے دینے اور اس کے عوض مقررہ شرح حساب سے یا علی الحساب روپیہ، پیداوار، مراعات یا مفادات وغیرہ وغیرہ حاصل کرنے کے لیے ہم نے "استحصال بالمال" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ سود کاری و سود خوری کی شکل ہے جو حرام ہے۔

ہیئتِ اجتماعیہ میں سود کار و سود کاری کی نوعیت سرطان و سرطانیت کی ہوتی ہے۔ چنانچہ سود کار اگر انسان کا خون آشام و سنگدل دشمن ہوتا ہے تو سود بھی سود خور و سود دہندہ دونوں کے لیے غارتگرِ حسن و حیات اور رہزنِ طمانیت و قناعت ہوتا ہے۔ سود اگر سود دہندوں کی معیشت کو تنگ کرتا اور انھیں لذتِ حسن و زندگی سے محروم کرتا ہے تو سود خوروں کی زندگی کو بھی مسموم کرتا اور اس کی جمالیاتی ثروت یا دولتِ دل سلب کر کے اسے ایسی مادی دولت حرام دیتا ہے، جس میں آگ مضمر ہوتی ہے، جو قلب کو لگتی ہے تو اس کو محیط ہو کر آدمی کو اہلِ نار و خبطی بنا دیتی ہے[۱۳]۔ سود کی سرطانیت یعنی اس کے انسانیت سوز اثرات، سلب و نہبِ حسن و زندگی، غارت گریِ طمانیت و سعادت اور رہزنیِ ایمان و تقوای کے پیشِ نظر اسلام نے اسے حرام، گناہِ کبیرہ، ظلم اور انسانیت سوز جرم قرار دیا ہے اور اس سے محترز و گریزاں رہنے کی پُرزور تاکید کی ہے[۱۴]۔

اب ہم اپنے اس موقف کی تائید و مزید صراحت کے لیے چند احادیثِ جمیلہ نقل کرتے ہیں، جن کے اختصارِ لفظی میں معنویت کے دفاترِ بے پایاں مضمر ہیں:

۱۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خور اور سود دینے والے پر،

نیز منشی اور گواہ پر لعنت فرمائی ہے۔ (مسلم، در المشکوٰۃ، کتاب البیوع، بابُ الرِّبٰو، ح ۱)

۲۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کا ایک درہم جس کو آدمی جانتے بوجھتے کھائے چھتیس ۳۶ بار زنا کرنے سے زیادہ گناہ ہے (احمد، دارقطنی۔ البیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت نقل کی ہے اور یہ الفاظ بھی روایت کیے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جو گوشت مالِ حرام سے پیدا ہو وہ النار یا دوزخ ہی کے لائق ہے (در المشکوٰۃ، باب الرِّبٰو، ح ۱۹)۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سود کے ستر اجزا ہیں، ان میں ایک معمولی سا جز بلحاظِ گناہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے جماع کرے (ابن ماجہ و بیہقی در المشکوٰۃ، باب الرِّبٰو، ح ۲۰)۔

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میرا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا، جن کے پیٹ گھڑوں کے مانند تھے اور ان بڑے بڑے پیٹوں (بطون) میں سانپ تھے جو باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جبریلؑ سے پوچھا، یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا، یہ سود خور لوگ ہیں (احمد، ابن ماجہ در المشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۲۳)۔

۵۔ حضرت اَنَس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کو قرض دے تو اس سے ہدیہ قبول نہ کرے (اس لیے کہ یہ سود کا حکم رکھتا ہے) (بخاری در المشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۲۶، نیز دیکھیے ح ۲۷)۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا کہ سود خوروں کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا، اگر کوئی ایسا شخص ہو گا بھی تو اس کو سود کے بخارات یا اثرات پہنچیں گے۔ ایک روایت ہے کہ اس کو سود کا غبار پہنچے گا۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، در المشکوٰہ، موضوع مذکور، ح ۱۲) عصرِ حاضر نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کو سچ کر دکھایا، اور ہمارے لیے یہ عبرت کا مقام ہے۔

مفصلۂ بالا احکامِ الٰہی قرآنی اور احادیثِ طیبہ ہمیں سودکاری کے تباہ کن نتائج وعواقب سے متنبہ کرتی اور اللہ تعالیٰ کی اس سُنّت کی یاد دلاتی ہیں کہ جو قومیں احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتی اور سُنّتِ پیغمبریؐ سے منہ موڑتی ہیں، وہ ہلاک و برباد یا محکوم و غلام ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری اقوام لے لیتی ہیں جو ایمان و عمل میں ان سے بہتر اور صالح ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنا تزکیۂ نفس کرنے اور تاریخی عمل سے منفی نتائج وعواقب سے محفوظ رہنے کی خاطر حسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ناگزیر ہے؛ اس لیے کہ یہی دُنیا میں سودخوری و سودکاری کے، نیز ہمارے دین و ایمان کی بربادی اور دُنیا و آخرت کی خرابی کے ذمے دار ہیں۔

سود کی صورتیں

قرآن مجید اور احادیثِ جمیلہ کی رُو سے سود مطلقاً حرام ہے، یعنی اس کی ہر صورت حرام ہے اور اسے کسی نام سے یا شکل میں لینا حرام کاری و حرام خوری اور اللہ تعالیٰ کے خلاف باغیانہ فعل ہے؛ لیکن دورِ ملوکیت میں معاشرتی سرطانوں کی سازش سے بعض تصانیف، مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں سود کو شرعی حیلوں سے جائز بنانے کے گوناگوں طریقے بتائے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور حرام خوری کی خواہش کی غمازی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، ان میں تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے آزری فنون کے ذریعے سود کی مختلف شکلوں کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور سے کوئی سرمایہ دار کسی ضرورت مند بے زمین کسان کو کاشت کاری کے لیے قطعۂ اراضی خریدنے کے لیے روپیہ سود پر قرض دینے کی بجائے اُسے خود قطعۂ اراضی خرید کر قرض کے طور پر دیتا ہے اور مروّجہ شرحِ سود سے کئی گنا زیادہ سود بٹائی کے نام سے وصول کرتا ہے، لیکن آزریت کے فتوے کی بنا پر اُسے "مزارعت" کے نام سے موسوم کر کے جائز و حلال سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک بے روزگار یا حاجت مند شخص کاروبار کرنے کی خاطر کسی سرمایہ دار سے روپیہ قرض مانگتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے بُخل و تکاثر کی وجہ سے اس کی حاجت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا یا سود لینا چاہتا ہے؛ لیکن سودخوری و حرام خوری کو اپنے زعم میں اور

آزریت کے فتوے کی بنا پر جائز و حلال قرار دینے کی خاطر شرعی حیلے سے کام نکالتا ہے. چنانچہ وہ حاجت مند شخص کو اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ وہ نقصان میں نہیں فقط نفع میں اس کا شریک ہوگا اور نفع کی شرح حساب مروّجہ شرح سود سے کہیں زیادہ ہوتی ہے. آزریت اپنے فن تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے ربٰو یا سود کی اس شکل کو "مضاربت" کے نام سے موسوم کر کے جائز و حلال قرار دیتی ہے.

قرآنِ مجید کا ارشاد ہے کہ "سارے مؤمن بھائی بھائی ہیں" لہٰذا جس طرح ایک صالح گھرانے میں سارے افراد ایک جیسی زندگی بسر کرتے اور ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں؛ نیز سب کا سود و زیاں مشترکہ ہوتا ہے اور سب ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے اور ایک چھت کے نیچے سوتے ہیں، اسی طرح اسلامی معاشرے کے سب افراد بھائی بھائی ہیں اور انھیں صالح بھائیوں کی طرح مل جُل کر رہنا اور ایک دوسرے سے حُسنِ سلوک کرنا چاہیے. جس طرح ایک صالح بھائی اپنے بھائی کا نہ تو استحصال کرتا اور نہ اس پر ظُلم روا ہی رکھتا ہے، بلکہ اس مدد کرنے، اس کے دُکھوں کا مداوا اور اس کی حاجت روائی کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے، اسی طرح اسلامی معاشرے کے افراد کو اپنے بھائیوں سے سلوک کرنا چاہیے. اس اخوّت و مساوات یا مواخات کا ایک عملی مظاہرہ ہم تاریخ کے آئینے میں عہدِ رسالت مآبؐ میں دیکھتے ہیں. ہجرت کر کے مسلمان مدینۂ منوّرہ آئے تو بے سرو سامان بھی تھے اور بے گھر بھی؛ لیکن انصارؓ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرمؐ کے ارشاد کی تعمیل میں اُنھیں اپنا بھائی بنا لیا اور اُنھیں اپنے گھر بار اور مال و دولت میں برابر کا شریک بنا لیا. قرآنِ مجید کے اس اصولِ اخوّت و مساوات کو اساس بنا کر پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈالنے کے ساتھ ہی کفالتِ قومی کا معاشی نظام قائم کر دیا. یہ احسن و مثالی معاشی نظام خلافتِ راشدہ تک قائم رہا. دَورِ ملوکیت آیا تو رفتہ رفتہ اسلامی معاشی نظام کی جگہ سرمایہ داری و جاگیرداری نظاموں نے لے لی. یہ دونوں نظام اصلاً ایک ہی ہیں اور ان کے ہیولے میں معاشرتی سرطانوں کی صورتیں مضمر ہوتی ہیں. معاشرتی سرطانوں کی غذا رزقِ حرام ہے، جس کی قبیح ترین

صورت ''سود'' ہے، جو غایت درجہ حرام ہے۔ چونکہ سود کاری کے بغیر سرمایہ داری و جاگیرداری نظام چل سکتے ہیں۔ نہ قائم ہی رہ سکتے ہیں؛ لہٰذا سرمایہ دار سود کھانے کے شرعی حیلے ڈھونڈنے لگے اور آزریت نے اپنے سرپرستوں کو شرعی حیلے فراہم کر دیے۔ چنانچہ آزریت نے تاویلِ باطل کے ذریعے سود کی مختلف صورتیں اختراع کیں اور تسمیہ بالباطل کے ذریعے انھیں مختلف ناموں سے موسوم کر دیا؛ مثلاً مزارعت، مضاربت، کرایہ کاری، دستار گیری (: پگڑی لینا) اور معاوضۂ نام و شہرت[15] (Good-will) وغیرہ وغیرہ؛ تاویل یا باطل کے ذریعے انھیں جائز و حلال قرار دینے دیا۔ علاوہ بریں، اُس نے سود کو حلال بنانے کے متعدد طریقے ایجاد کر لیے جن کو دیکھ کر

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ کیا کہیے؟

بہرحال، ان میں سے تین شرعی حیلوں کو مثال کے طور پر نقل کرتے ہیں:

۱۔ فرض کیجیے ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے کر اس پر کچھ زائد رقم لینا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ زائد رقم صریحاً سود ہو گی، جو شرعاً حرام ہو گی، لہٰذا اس حرام کو طیّب بنانے اور اس جُرمِ عظیم سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض لینے والے کی کوئی چیز اس سے مثال کے طور پر دس روپے میں نقد خرید لے اور اسے قرض لینے والے کے پاس مدّتِ معیّنہ کے لیے بارہ روپے میں اُدھار فروخت کر دے۔ اس شرعی یا فقہی حیلے سے دو روپے کی یہ زائد رقم حلال و طیّب ہو جائے گی۔

۲۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا اپنی کوئی شے قرض لینے والے کے پاس ایک سو دس روپے میں اُدھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس شے کو کسی اور کے پاس ایک سو روپے میں نقد فروخت کر دے۔ اب قرض دینے والا وہی چیز اس تیسرے شخص سے ایک سو روپے میں خرید لے۔ اس حیلے سے وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض والے (مقروض) کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

۳۔ تیسری تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا ایک چیز قرض لینے والے کے ہاتھ دو سو روپے میں اُدھار فروخت کر دے۔ پھر وہ چیز اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا مدّتِ

معینہ کے بعد اس چیز کی قیمت کے طور پر اُسے دو سو روپے ادا کر دے گا۔ اس طرح اُسے سو روپے کی رقم زائد مل جائے گی، جو حلال و طیّب ہو گی۔[۱۶]

خبیث کو طیّب، حرام کو حلال یا سود کو جائز بنانے کی یہ محوّلہ بالا تدابیر تلبیسِ ابلیس اور تاویل بالباطل کی، نیز استہزاء و استہانتِ دین کی عبرت ناک مثالیں ہیں۔ زکوٰۃ کو کُلّی سے جزوی اور لازمی سے اختیاری بنانے کا آرڈیننس جو موجودہ حکومتِ پاکستان کا کارنامہ ہے[۱۷] اس قبیل کا شرعی حیلہ ہے۔

بلا سود معاشی نظام

ہمارا ایک ملّی المیہ یہ ہے کہ ہم سینکڑوں برس سے خلافت یا اسلامی حکومت کے فیوض و برکات سے محروم ہیں اور ملوکیت کے سودی۔ سرطانی نظام میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا دوسرا قومی المیہ یہ ہے کہ پاکستان بنے اور ہمیں آزاد ہوئے ساڑھے تین عشرے گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک ہم نے اپنا سودی۔ سرطانی نظام تبدیل نہیں کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قارونی اور دیگر سرطانی طبقے اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں نہ کرنے ہی دیتے ہیں اور وہی حقیقت میں اربابِ حل و عقد ہیں۔ بہر حال ہمارا قومی و ملّی المیہ یہ ہے کہ ہم جب معاشی نظام قائم کرنے کی باتیں کرتے ہیں اور ماہرین منصوبے بناتے ہیں تو یہ اصل فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ غیر اسلامی بلکہ سرطانی نظامِ معیشت میں اسلامی معاشی نظام قائم و رائج کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں جو اصلاً غلط ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کاریگر مصوّری کے ایک بے مثال مربع شاہکار کو مستطیل چوکھٹے کو بدلنے اور مربع بنانے کے بجائے اس اعجوبۂ روزگار تصویر ہی کو ناقص و ناموزوں سمجھ کر ردّ کر دے۔ اس مثال سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بلا سود معاشی نظام کا خاکہ تیّار کرنے سے پہلے ہمیں اسلامی نظام کا خاکہ قرآن و سنّت کے مطابق تیّار کرنا اور اس میں اسے احسن طریق سے چلانا ہو گا۔

ہمارا ایک قومی و ملّی المیہ یہ بھی ہے کہ ہم سینکڑوں برس سے خلافت یا اسلامی حکومت کے فیوض و برکات سے محروم ہیں اور سودی۔ سرطانی معاشی نظام میں زندگی کر رہے ہیں۔ ہماری عہد شکنی اور ظلم و جہل

کی انتہا یہ ہے کہ ہمیں آزاد پاکستان میں رہتے چار عشرے گزرنے کو ہیں، لیکن ابھی تک ہمارا معاشی نظام سودی۔ سرطانی ہے۔ اوّل تو ہم سودی نظام کے اس قدر خوگر ہو چکے ہیں کہ اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور نہ اسے بدلنے کی سچی آرزو ہی رکھتے ہیں۔ دوسرے اگر سادہ دل مسلمانوں کو دلاسا دینے اور سبز باغ دکھانے کی خاطر ہم اسے بدلنے کی فکری کوشش بھی کرتے ہیں تو وہ احسن د اکمل نہیں ہوتی، بلکہ ادھوری اور بادلِ نخواستہ ہوتی ہے، اس لیے کامیابی نہیں ہوتی، اور ہونی بھی نہیں چاہیے، کیونکہ

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ "عشق" کی
دل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں ؟

بعض مسلم حکومتوں کے ایما پر ماہرین معاشیات کئی برسوں سے بلاسود معاشی نظام کا خاکہ تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ ان کے پیشِ نظر سود کی متبادل اساس معلوم کرنے کا مسئلہ ہے۔ ان کی رائے ہے کہ جب تک سود کی متبادل اساس دریافت نہیں ہوتی، اسلامی معاشی نظام کا خاکہ تیار نہیں ہو سکتا لیکن ابھی تک وہ ایسی اساس دریافت نہیں کر سکے اور اُنھیں اپنی ناکامی کا اعتراف بھی ہے، اگرچہ ان کا یہ اعتراف اُن کے اِس شک کی غمّازی کرتا ہے کہ "دورِ جدید" میں اسلامی یا بلاسود معاشی نظام کا قیام عملاً ممکن نہیں۔ ایک اعتبار سے ان کا یہ شک بجا بھی ہے، اس لیے کہ وہ دورِ جدید سے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام مراد لیتے ہیں۔ ظاہر ہے جس نظام کی اساس ہی سود ہو، وہ اس کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے قرآن حکیم کی ہدایت اور اُسوۂ حسنہ کے مطابق اسلام کے نظامِ حیات کا مکمل نقشہ تیار کیا جائے اور پھر اس کے نقوش یا اصولوں کے مطابق بلاسود معاشی نظام کا خاکہ تیار کیا جائے جو اس میں بلاشبہ اس طرح منطبق ہوگا، جس طرح مرصّع انگشتری میں نگینہ جڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ بلاسود معاشی نظام کا خاکہ تیار کرنے سے پہلے اس کے حوالے سے نظامِ اسلام کے چند اہم اصولوں کی ایک بار پھر نشاندہی کر دی جاتی ہے:

نظامِ اسلام کے اُصول

۱۔ خلافت یا اسلامی ریاست رعایا کی کفالت کی ذمے دار ہوگی۔ بالفاظِ دیگر رعایا کی بنیادی ضروریات، مثلاً نان نفقہ، لباس، گھر، تعلیم و تربیت، صحت و صفائی، سیر و تفریح اور سیاحت و جلال بازی کا اہتمام ریاست کی ذمے داری ہوگی۔

۲۔ نظامِ زکوٰۃ کے قیام و انصرام کی ذمے داری بھی ریاست کی ہوگی اور وہ انفاق بالعفو، صدقات و خیرات اور احسان کے اوامر، اور اکتناز و احتکار، جمع و تکاثر، اسراف و تبذیر اور بُخل و شُحِ نفس کے نواہی کے ساتھ قائم ہوگا۔

۳۔ اسلامی معاشرے میں زمین، وسائلِ پیداوار اور مال و دولت کی ملکیت قانوناً ربّ العالمین کی تسلیم کی جائے گی اور انسان مالک نہیں امین متصوّر ہوگا؛ اگرچہ اُسے ضرورت کے مطابق مال و دولت جمع اور خرچ کرنے، نیز زمین کی کاشت کرنے اور حسنِ مزارعت[19] کا اختیار ہوگا۔

۴۔ مالدار افراد کے مال و دولت میں مفلوک الحال، حاجت مند اور محروم افراد کا حق یا حصّہ قانوناً تسلیم کیا جائے گا اور انھیں قانوناً ادا کرنا ہوگا۔

۵۔ اسلامی نظام میں کوئی شخص حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت جمع کرنے کا مجاز نہ ہوگا، البتہ قرآنی شرائط کے ساتھ فعال سرمایہ کار بن سکتا ہے، لیکن وہ اپنے سرمائے کا معاوضہ، جو قرآن کی تعریف میں سود ہے، لینے کا مجاز و حق دار نہ ہوگا۔

۶۔ محنت کاروں میں پیداوار یا منافع کی تقسیم عدل و احسان اور سعی و اکتساب کے قرآنی اُصولوں کے مطابق کی جائے گی؛ لہٰذا محنت کاروں کی تقرّری اور معاوضے کی تعیین کے اصولِ طلب و رسد کی، جو سرمایہ دار نظام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اسلام کے معاشی نظام میں استحصالی ہونے کی بنا پر قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔ اس کی جگہ حصّہ داری کی بنیاد پر محنت کشوں کی تقرّری اور اصولِ عدل و احسان کے مطابق حصّہ داری ہوگی۔

۷۔ عدل بلا امتیاز سب کو مفت، آسان اور بلا تاخیر میسر ہوگا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ○ (البلد-۹۰: ۴) کے مطابق ہر شخص محنتی ہوگا اور اپنی ہمت و قابلیت کے مطابق ملکی پیداوار میں بلاواسطہ یا بالواسطہ حصہ لینا اس پر لازم بھی ہوگا۔

۹۔ محنت باعثِ عزت و افتخار ہوگی اور مال و دولت، قوت و اقتدار، منصب و نسب کے بجائے عزت و تکریم کا معیار تقویٰ ہوگا۔

۱۰۔ علم بالقلم، حکمت اور ہنر کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہوگا۔ ہنر سے سائنسی تحقیق و ٹیکنالوجی مراد ہے۔

۱۱۔ معاشرہ سرطانی طبقوں یعنی فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری سرطانوں سے پاک و صاف ہوگا۔

۱۲۔ غلامی و بردہ فروشی اور کنیز داری ممنوع ہوگی۔

۱۳۔ نکاحِ باطل کی اجازت نہ ہوگی اور مہر کی ادائی ضروری ہوگی۔

۱۴۔ اخوت و مساوات اور حریت و سادگی اسلامی معاشرے کی امتیازی و نمایاں خصوصیات ہوں گی۔

۱۵۔ شرک و بت پرستی (مثلاً پیر پرستی، مزار پرستی، اکابر پرستی، شبیہ پرستی وغیرہ وغیرہ کی) ہر صورت قانوناً ممنوع ہوگی۔

۱۶۔ حکومت کی سرپرستی میں ملک میں تشہیر بالحق کا نظام قائم ہوگا، جسے افراد کا تعاون حاصل ہوگا۔

۱۷۔ نظامِ تعلیم میں قرآن مجید کو محور کی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کے حوالے سے نصاب تیار کیے جائیں گے۔

۱۸۔ حکومت رعایا کے جان و مال، عزت و آبرو اور عقائدِ جلیلہ و محرکہ کی محافظ ہوگی۔

۱۹۔ عورت کو قرآن مجید کے مطابق انسانی حقوق بشمول حق آزادی حاصل ہوں گے۔

الغرض اسلامی معاشرے کا ہر فرد آزاد و مکرم، محنت کار و جفاکش اور پیداواری و تخلیقی عمل

اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں عملاً حصہ لینے والا باشعور ذمے دار شہری ہوگا۔

بے سود سرمایہ کاری

ایسے صالح معاشرے میں جہاں احکامِ الٰہی کے مطابق مکمل نظامِ زکوٰۃ قائم ہو اور انفاق بالعفو، عدل و احسان اور خیرات و صدقات کرنا قومی زندگی کا شعار ہو اور جہاں اکتناز و احتکار، جمع و بُخل اور اسراف و تبذیر کی شرعاً ممانعت ہو، نیز جہاں تکاثُر کا فقدان اور سادگی و محنت وجہِ شرف ہو، وہاں لوگ ضرورت سے زائد مال و دولت رکھنے کے اسی صورت میں مجاز ہوں گے کہ اس سے ان کا ارادہ قومی پیداوار میں اضافے کی خاطر کوئی نیا کاروبار کرنے، نیا کارخانہ لگانے یا کوئی اور تعمیری یا فلاحی کام کرنے کا ہو۔ "العفو" یا ضرورت سے زائد مال میں مسکین، محروم اور اہلِ احتیاج افراد کا بھی حصہ ہوتا ہے، جسے وہ اصولِ عدل و احسان کے مطابق دیں گے۔ اس کے معاشرتی زندگی پر حسین و دُور رس اثرات مرتب ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ افرادِ قوم میں آرزوئے حُسن و حیات زندہ و فعّال ہوگی اور وہ قومی پیداوار و دولت کی افزائش اور تعمیری و فلاحی کاموں میں ذوق و شوق سے حصہ لینے لگیں گے۔ علاوہ ازیں، مالدار لوگ اہلِ احتیاج کو بلاسود قرض دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کریں گے، بلکہ اپنے اللہ و ربّ العالمین کی خوشنودی اور قوم و انسانیت کے بہترین مفاد کی خاطر اُنھیں قرض دینے کو اپنے لیے خیر و برکت اور دُنیوی و اُخروی حسنہ کا موجب خیال کریں گے۔

اس کے نتیجے میں ایک تو لوگوں کو صنعت کاری، کاشتکاری اور کاروبار کرنے یا بالفاظِ دیگر، قومی دولت کی پیدائش اور پیداوار کی افزائش میں عملاً حصہ لینے کے مواقع میسّر آئیں گے، جس سے ایک طرف قومی پیداوار و دولت میں تدریجی اضافے کا اور دوسری جانب بیکاری و افلاس اور ظلم و استحصال کے تدریجی استیصال کا آغاز ہو جائے گا۔ علاوہ بریں، مُلک میں گردشِ دولت تیز و متوازن اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا، اور تعمیر و ترقی کے منصوبوں کے لیے ضروری سرمائے کی فراہمی بتدریج آسان ہوتی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں حکومت کو قوم سے سود پر قرض لینے اور

سودی قرضے جاری کرنے کی احتیاج نہیں رہے گی۔

بلاسود بینکاری

ایسے صالح معاشرے میں بینکاری سرکاری ہو یا نجی، اس کا محرک جلبِ منفعت نہیں، حسنِ منفعت ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ نجی بینکاری میں جلبِ منفعت کی صورت میں "العفو" یا ضرورت سے زائد منافع خزانۂ عامرہ کو لوٹانا ہوگا، اس لیے کہ یہ امرِ الٰہی ہے۔ یہاں ایک معرکۃ الآراء سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینک اپنے مصارفِ ضروریہ پورا کرنے اور منفعتِ ضروریہ حاصل کرنے کے لیے سود کاری نہ کرے تو کیا کرے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ بینک اپنے کھاتے داروں سے ان کے مال و دولت کی حفاظت میں اُٹھنے والے جملہ اخراجات یا مصارفِ ضروریہ اور متعلقہ محنت کاروں کا معاوضہ اصولِ عدل واحسان کے مطابق وصول کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینک اپنے مصارفِ ضروریہ اور خدمات کا معاوضہ اس شرحِ حساب سے وصول کرے گا جو واجبی ہو۔ ایسی شرحِ حساب کی تعیین ماہرین معاشیات اور بینکاروں کے لیے مشکل نہیں۔

کیا بینک کے مصارفِ ضروریہ کا معاوضہ اور محنتانہ سود نہیں؟

یہاں سودی بینکاری کے نظام کی خوگر طبائع کو یہ شک گزر سکتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بینک اپنے مصارفِ ضروریہ کا جو معاوضہ اور حقِ خدمت وصول کرے گا، وہ سود ہو یا اس پر سود کا اطلاق ہو سکتا ہو؟ اس کا جواب ہے نہیں؛ اس لیے کہ قرآن حکیم کے مفہوم اور اس کے قانونِ عدل واحسان اور اُصولِ محنت وسعی کی رُو سے مصارفِ ضروریہ کا معاوضہ اور محنت کشی وخدمت گزاری کا حق یا محنتانہ لینا، قطعاً سود نہیں اور نہ کسی عنوان اس پر سود کا اطلاق ہی ہو سکتا ہے۔ بینک اپنے کھاتہ داروں کو ان کی جمع کردہ رقوم پر زائد رقم یا "نفع" نہیں دیتا کہ اس پر سود کا اطلاق ہو سکتا ہو؛ بلکہ وہ تو اُن سے مصارفِ خدمت گزاری اور حقِ محنت وخدمت اصولِ تناسب اور قانونِ عدل واحسان کے مطابق وصول کرتا

ہے۔ یہ بھی کسی عنوان سود نہیں۔ اسی طرح وہ اپنے قرض داروں سے ان کی خدمت گزاری کے دوران اُٹھنے والے مصارفِ ضروریہ اور حقِ خدمت یا محنتانہ وصول کرتا ہے، قرضے کی رقم کا قطعاً کوئی معاوضہ نہیں لیتا، لہٰذا یہ بھی سود نہیں اور نہ اس پر سود کا اطلاق ہی ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ اصل نہیں بھولنی چاہیے کہ سود کا اطلاق قرض کی رقم کے معاوضے یا اصل زر سے زائد رقم پر ہوتا ہے، چاہے اصل زر سرمایۂ سیال کی صورت میں ہو یا سرمایۂ منجمد کی۔ چونکہ ہمارے مجوزہ اصولِ بینکاری میں سرمائے کا معاوضہ نہیں لیا جاتا، لہٰذا اس پر سود کے اطلاق کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے "بے سود بینکاری کے اصولِ محنت و احسان" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ بینکاری کا رہنما اصول ہے، جس کا اطلاق اس کے ہر شعبے پر کیا جا سکتا ہے۔

ہُنڈی اور درشنی ہُنڈی کے معاوضے کا مسئلہ

درآمدات و برآمدات، نیز اندرونی کاروبار میں بینک کی ہُنڈی (C [illegible]) اور درشنی ہُنڈی (Promissory note) کے ذریعے ترسیل و وصولیِ زر کا مسئلہ ازبس اہمیت رکھتا ہے۔ بینک اس سلسلے میں ایسا اہم کردار ادا کرتا ہے کہ اس کے بغیر اندرونی و بیرونی منڈیوں میں کاروبار کرنا، اگر محال نہیں تو ازبس دشوار ضرور ہے۔ بہرحال سود کاری کے بغیر بینکاری کرنے میں بینک کا کردار وہی ہوگا، جو دیگر امورِ بینکاری میں ہوگا اور جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ہنڈی اور درشنی ہنڈی کے ذریعے ترسیل و تحصیلِ زر کے سلسلے میں اُٹھنے والے مصارفِ ضروریہ کا معاوضہ اور کارکنان بینک کا محنتانہ بینک بطریقِ تناسب اور باصولِ عدل و احسان مُرسِل و مُرسَل الیہ دونوں سے وصول کرے گا۔

اب "طریقِ تناسب" کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک کے مجموعی اخراجات کو بینک کے گاہکوں پر ان کے کاروبار اور لین دین کی کیفیت و کمیّت کے مطابق تقسیم کرنے کی شرحِ حساب، جو مصارفِ ضروریہ اور بینکاروں کے محنتانے کی کُل رقم کی وصولی کے لیے متعین کی جائے گی۔ اس شرحِ حساب کی تعیین سند یافتہ محاسبین، بینکاروں اور ریاضی دانوں کے لیے آسان اور کمپیوٹر کے ذریعے تو سہلِ محض ہے۔

بلاسود بیرونی تجارت کا مسئلہ

موجودہ بینکاری نظام میں بلاسود بیرونی تجارت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا؛ البتہ اگر مسلم ممالک میں معاشی نظامِ اسلام قائم ہو جائے اور وہ اپنا کام قرآنی اصولوں کے مطابق کرنا شروع کر دے تو بلاسود بیرونی تجارت کے موجودہ لاینحل مسئلے کو حل کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ مثال کے طور پر موجودہ نظامِ بینکاری میں اگر کوئی شخص بیرونی ملک، مثلاً انگلستان سے کوئی مال منگوانا چاہے تو اسے پہلے بیرونی تاجر کے حق میں اپنے کسی ملکی بینک میں قیمتِ مال کے برابر ہنڈی ( ) جمع کرنا ہوگی، اور اس کی اطلاع بیرونی تاجر کو بینک کے تصدیق نامے اور ضمانت نامے کے ساتھ دینا ہوگی۔ ان دستاویزات کے ملنے پر تاجر مطلوبہ مال بحری یا ہوائی جہاز وغیرہ کے ذریعے ارسال کر کے دستاویزاتِ ترسیل (Shipping documents) اور مطلوبہ رقم کے طلب نامے (Bills) اپنے ملک کے کسی بینک میں جمع کرا کر اسی سے مطلوبہ رقم عند الطلب وصول کرے گا؛ لیکن ظاہر ہے انگلستان کے بینک کو پاکستانی بینک سے مطلوبہ رقم وصول کرنے میں کچھ مدت لگے گی، لہٰذا وہ بینک پاکستانی بینک سے مطلوبہ رقم کے علاوہ اس پر درمیانی مدت کا سود بھی وصول کرے گا۔ یہ سود درآمد کنندہ کا بینک اس کی طرف سے دے گا، لہٰذا اس سے وصول کرے گا۔

چونکہ بیرونی ممالک کے ترسیل و تحصیل زر لازماً اپنے قومی بینکوں کے ذریعے کرتے ہیں، جو سود کے بغیر بینکاری کر ہی نہیں سکتے، لہٰذا اسلامی ممالک کو لازماً درآمدی تجارت میں بالخصوص سود دینا ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس سود کی لعنت سے نجات پانے کی کون سی سبیل ہو سکتی ہے؟ اس کی ایک احسن سبیل یا قابلِ عمل طریق کار یہ ہے کہ اسلامی ممالک اپنا ایک بلاسود بینکاری کرنے والا مرکزی ملّی بینک قائم کریں، جو اسلامی ممالک کی بیرونی تجارت کے امور سرانجام دے، اور مقامی بینکوں کو فوری طور سے عند المطلب مطلوبہ رقم ادا کر دے، اور سود کی لعنت سے اسلامی ممالک کو بچا لے۔ اسلامی ممالک برآمدی تجارت بھی اسی مرکزی اسلامی بینک سے کریں گے اور سود سے

بچ جائیں گے۔ اس بینک کے وظائف وفرائض وغیرہ کا تعیین اور دیگر امور کے مسائل کو حل کرنے میں بینکاری اور مالیت کے مختصصیں اور ماہرین کو دشواری پیش نہیں آئے گی۔

یہاں اس نکتے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ اس ملّی مرکزی بینک کے اخراجات کو پورا کرنے اور حُسنِ منفعت کا بندوبست کرنے کا طریقہ وہی ہوگا جو قومی بینکوں کے ساتھ روا رکھا جائے گا؛ یعنی "بے سود بینکاری کا اُصول محنت واحسان"۔

بیرونی واندرونی قرضوں کا مسئلہ

اگر ہم بیرونی واندرونی قرضوں کے مسئلے کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیں تو ہم اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ مسئلہ غیر اسلامی نظامِ حیات اور ساہوکارانہ معاشی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ اسلام کے نظامِ زندگی میں ایک طرف سادگی وقناعت، سعی وجہد اور محنت ومشقّت قوم کا شعارِ زندگی ہوگا اور دوسری جانب سرطانی طبقوں اور اُن کی تعیّش پرستی وتن آسانی کا فقدان ہوگا۔ اس کے نتیجے میں تعیّشات وتزیّنات اور غیر ضروری اشیاء کی درآمد کی قوم کو حاجت ہوگی نہ دماغ؛ اور نہ ایسی مصنوعات قوم کے استعمال کے لیے تیّار ہی کی جائیں گی، البتّہ غیر اسلامی ممالک میں برآمد کرنے کے لیے اُنھیں تیّار کرنے کی اجازت ہوگی۔ چنانچہ اسلامی ریاست کو صنعتی اور کاروباری منصوبہ بندی اصولِ سادگی وضرورت کے مطابق کرنا ہوگی۔

سود اور سرطانی طبقوں کے اِستیصال سے ملک میں دولت محجوب؛ (Shy) ؛ ہوگی نہ مجہول و ناکارہ (Idle) ؛ اور نہ اس کی گردش غیر متوازن ہی گی، لہٰذا زرعی وصنعتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے سرمائے کے حصول میں چنداں دقت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے نتیجے میں قوم کو اندرونی اور بیرونی سود خور سرمایہ کاروں سے قرضہ لینے کی اوّل تو حاجت نہ ہوگی، اور اگر ہوگی بھی تو بہت کم؛ اور یہ قرضہ دولت مند اسلامی ممالک سے بلا سود لیا جاسکے گا۔ اس کے لیے اسلامی ممالک کے مرکزی بینک کو فوری طور سے قائم کرنا ہوگا، اور یہ بینک اپنے مصارف ضروریہ اور محنت کا معاوضہ

فریقین سے قرآنِ حکیم کے اُصولِ عدل واحسان کے مطابق وصول کرے گا۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بین الاقوامی اسلامی بینک کے سرمائے اور وظائف (Functions) کی نوعیت وہی ہوگی جو قومی بینکوں کی ہوگی۔ سرمایہ قومی بینکوں میں ہو یا بین الاقوامی اسلام بینک میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت متصوّر ہوگا اور متعلقہ افراد واقوام کی امانت ہوگا، اور اس سے اِستفادہ کرنے کا کُل مسلم اقوام کو حق حاصل ہوگا۔

یہاں اِس نکتے کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ ریاست رعایا سے سود یا سود کاروں کی اصطلاح میں "نفع" پر قرضہ لینے اور نہ سودی قرضے جاری کرتے، نیز نہ سود پر قرض دینے کی مجاز ہوگی۔ الغرض سود کی ممانعتِ کُلّی، انفاق بالعفو کے بشمول نظامِ زکوٰۃ اور اسلامی معاشرے کے قیام کے فیوض و برکات سے قومی وملّی سرمائے میں روزافزوں اضافہ ہوگا اور ریاست بہت جلد اپنے وسائل کے اندر رہ کر قوم کے تعمیری وترقی کے منصوبوں کی تکمیل کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ درمیانی عرصے میں قوم کو اپنے پیغمبرِ اعظم وآخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوہ حسنہ کے مطابق صبر واستقامت، حلم وبردباری، اخوّت و مساوات اور ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا؛ نیز حق وصبر کی تشہیر بڑے زور اور پورے وسائل کے ساتھ مسلسل کرتے رہنا ہوگی۔

مزارعت بالاستحصال اور مزارعت بالاحسان

مزارعت کے معرکۃ الآراء مسئلے کے حل کا اصل الاصول یہ ہے کہ مزارعت بالاستحصال ظُلم ہے، اس لیے ناروا وناجائز ہے، جب کہ مزارعت بالاحسان حسنِ عمل ہے، لہٰذا مستحسن وجائز ہے۔

اب اس اصل الاُصول کی توضیح کر دی جاتی ہے:

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید کی رُو سے زمین اور اس میں جُملہ نعمتوں کے خزائن اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں، جس نے اُنھیں کُل بنی نوعِ انسان کے لیے زمین میں بالقوۃ ودیعت کر رکھے ہیں تاکہ ان سے متمتّع ہونے کے لیے اُنھیں اپنی محنت ومشقّت اور سعی وجہد سے قوّت سے فعل میں لائیں۔ اس فقرے میں دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّلاً، اراضی اور اس کی پیداوار کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ

ہے، کوئی قوم، جماعت یا فرد نہیں ہے۔ ثانیاً، ربِ کریم کی نعمتیں کُل بنی نوع انسان کے صرف "تمتّع" کے لیے ہیں۔ ثالثاً، انسان کو محنت ومشقت کے لیے پیدا کرنے (البلد ۹۰: ۴) کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا کام محنت ومشقت اور سعی وجہد سے ان نعمتوں سے تمتّع کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ تمتّع بالاکتساب قرآنِ حکیم کا اصل الاصول ہوا۔ اس سے مندرجۂ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

اوّل، اراضی اللہ تعالیٰ کی "امانتِ مستفاد" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان زمین کا "امینِ مستفید" ہے، اور اس سے اپنی محنت ومشقت اور سعی وجہد سے پیداوار حاصل کرنے اور اس سے استفادہ یا تمتّع کرنے کا مجاز ہے۔

دوم: امینِ مستفید اس اراضی کو اپنے قبضہ وتصرّف میں نہیں رکھ سکتا، جسے وہ کاشت نہیں کرتا یا کر نہیں سکتا۔ بالفاظِ دیگر، وہ مزروعہ اراضی کو کاشت نہ کر کے اسے بیکار ولاحاصل بنانے کا مجاز نہیں جیسے اسے مال ودولت کو محجوب ومجہول وناکارہ بنانے کی اجازت نہیں۔

سوم: ملکیّتِ الٰہی اور سعی واکتساب کے قوانین کی رُو سے امینِ مستفید اپنی اراضی یا امانتِ مستفاد کو مضارعت بالاستحصال کے رواج کے مطابق بٹائی، ٹھیکے وغیرہ پر دینے کا مجاز نہیں، اس لیے یہ ظلم وسود خوری ہے، لہٰذا

چہارم: اُسے غیر مزروعہ یا فالتو اراضی کو جو "العفو" ہے، حکومت کے حوالے کرنا لازمی ہے تاکہ اس سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے اُسے حاجتمند کاشتکاروں میں تقسیم کر دے۔

پنجم: اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو حکومت افرادِ نسلِ انسانی کے مفاد کی خاطر اس فالتو غیر مزروعہ اراضی کو امینِ مستفید سے جبراً چھین کر ضرورت مند کاشتکاروں کو دینے کی مجاز ہے۔

مزارعت بالاحسان

غور سے دیکھیں تو مزارعت بالاستحصال سودکاری ہی کی ایک شکل ہے، اس لیے ممنوع و حرام ہے، لیکن بخلاف اس کے "مزارعت بالاحسان" کی رخصت ہے۔ مزارعت بالاحسان سے

مراد یہ ہے کہ امینِ مستفید امانت و مستفاد اراضی کو کُلّی طور سے زیر کاشت لانے اور اس سے بدرجۂ تمام پیداوار حاصل کرنے کی خاطر افرادِ معاشرہ کی خدمات حاصل کرنے کا مجاز ہے، جو پیداوار میں برابر کے حصے دار ہوں گے۔ بالفاظِ دیگر، پیداوار کی تقسیم امینِ مستفید سمیت کُل رفقائے کار میں عدل و احسان اور سعی و اکتساب کے قرآنی اُصولوں کے مطابق ہوگی، طلب و رسد کے مروجہ غیر منصفانہ و سرطانی اصول کے مطابق نہیں ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حرمتِ مزارعت کے سلسلے میں عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مزارعت کے بغیر ان لوگوں کا کام کیسے چل سکتا اور ان کی روزی کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے جو کسی وجہ سے خود کاشتکاری نہیں کر سکتے؟ فرض کیجئے ایک بے سہارا سالخوردہ بیوہ عورت کو ترکے میں ایک قطعۂ اراضی ملا ہے، جو اس کی کفالت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر وہ اسے بٹائی، پٹے یا ٹھیکے پر نہیں دیتی تو اس کی کفالت کس طرح ہوگی اور اس کی محرومی کا مداوا کیا ہوگا؟ یہ سوال و اعتراض اس حقیقت کی چغلی کھاتا ہے کہ معترض کے ذہن میں اسلامی معاشرہ نہیں بلکہ موجودہ قارونی۔ سرطانی معاشرہ ہے، جس کے حوالے سے یہ سوال یا اعتراض تو واقعی برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اسلامی معاشرے کے حوالے سے یہ سوال معترض کی اسلامی حکومت کے اصولِ کفالتِ رعایا سے بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔ ہمیں یہ اصل نہیں بھولنی چاہیے کہ کفالتِ رعایا اسلامی حکومت کی بنیادی ذمے داری ہے، لہٰذا جملہ بے سہارا و بے روزگار پیر و جواں اور معذور و محتاج مرد و زن اور یتیموں کی روزی و روزگار، لباس و رہائش، علاج معالجے اور سیر و تفریح، نیز علمی و تحقیقی، ادبی و فنّی یا ہنروری و تکنیکی قسم کے تجارب و مشاغل کا انتظام و انصرام کرنے کی اسلامی حکومت شرعاً مکلّف و پابند اور ذمے دار ہوتی ہے۔ کفالتِ رعایا کا ایک فکر انگیز نمونہ مغربی ممالک میں ملتا ہے۔ علاوہ بریں ہمیں اشتراکی ممالک کے معاشی نظام اور اس کے شعبۂ کفالتِ قومی سے بالخصوص بہت ہی حکیمانہ باتیں سیکھ سکتے اور ان کے تجربات سے مستفید

ہو سکتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ دوسروں کے تجربات وغیرہ سے حکمت کا سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ دلیل یہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے، جہاں سے ملے اسے لے لینا چاہیے"۔

مضاربت بالاستحصال اور مضاربت بالاحسان

مضاربت کا مسئلہ بھی وہی ہے جو مزارعت کا ہے اور دونوں پر ایک ہی اصل الاصول کا اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا مضاربت بالاستحصال ناجائز و حرام اور مضاربت بالاحسان جائز ہے۔ اس مسئلے سے پہلے اسلام کے اس معاشی اصل الاصول کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں ظلم و استحصال ممنوع و حرام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی مفلسی و بیچارگی یا احتیاج و مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا، سودکاری و حرام خوری ہے؛ لہٰذا نظامِ سرمایہ کاری کا طریقِ استحصال، جو اصولِ طلب و رسد کے نام سے معروف ہے، ناجائز و حرام ہوا۔ علاوہ بریں، انفاق بالعفو کے حکمِ الٰہی کی موجودگی میں فالتو مال و دولت صرف اسی مرفہ الحال شخص کے پاس ہوگا جو قومی پیداوار میں اضافے، بیروزگاری دور کرنے میں اور روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنے کی خاطر کوئی کارخانہ لگانے یا گھریلو قسم کی صنعتکاری و دستکاری یا کاروبار کرنے کا ارادہ یا منصوبہ رکھتا ہوگا۔ چونکہ ایسے شخص کی سرمایہ کاری کا محرک استحصال و ذاتی جلبِ منفعت اور تکاثر نہیں ہوگا، بلکہ قومی و ملّی یا انسانی مفاد ہوگا، لہٰذا عادل سرمایہ کار جن افراد کو اپنے کاروبار میں شریک کرے گا، طلب و رسد کے استحصالی اصول کے بجائے عدل و احسان کے اصولِ قرآنی کے مطابق شریک کرے گا؛ لہٰذا جملہ رفقائے کار حاصلِ محنت یا پیداوار بصورتِ نفع میں حسنِ سعی و اکتساب اور حسنِ ضرورت کے اصولوں کے مطابق برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو محنت کار اپنے حصّے کا زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کریں گے، نیز کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور ذمے داری کا مظاہرہ کریں گے، دوسرے ان کی خوشحالی اور قومی پیداوار و ترقّی میں اس تیزی سے اضافہ ہوگا جو کسی اور طرح ممکن

ہی نہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کار جلبِ منفعت و تکاثر کی خاطر بطریقِ طلب و رسد دیگر فرد یا افراد کو اپنے کاروبار میں شریک کرتا ہے اور یہ ناجائز و حرام ہے۔ اس کے لیے ہم نے مضاربت بالاستحصال کی تعبیر اختیار کی ہے۔ بخلاف اس کے شرکتِ عمال یا رفقائے کار بطریقِ عدل و احسان ہو تو وہ حسین و جائز ہوتی ہے اور اسے ہم نے مضاربت بالاحسان سے تعبیر کیا ہے۔

کرایہ کاری و دستار گیری

غور کریں تو کرائے میں سود کی صورت مضمر ہے، جو انسان کی معاشی زندگی کے لیے ہلاکت آفرین ہے، جس طرح مثال کے طور پر ذرّے میں جوہری توانائی کی صورتِ مضمرہ دُنیا کے لیے قیامت خیز ہے؛ لیکن اس امر کے باوجود کرایہ ہماری معاشرتی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سود ہمارے معاشی نظام کی اساسِ باطلہ ہے، اور اُسے ایسا بنانے کے ذمے دار ہمارے معاشرتی سرطانی طبقے ہیں۔ یہ نکتہ غور کرنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلام کے نظامِ زندگی میں سود کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک طرف اکتناز و احتکار اور جمعِ مال و بُخل کی سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے، اور دوسری جانب انفاق بالعفو، صدقات و خیرات اور احسان کرنے پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ کوئی شخص ضرورت سے زائد مال و دولت رکھنے کا مجاز ہی نہیں۔ ظاہر ہے جب آدمی کے پاس فالتو یا زائد از ضرورت مال و زر ہو گا ہی نہیں تو وہ سود کاری کیسے کر سکے گا؟ اس سے مستنبط ہوا کہ سود کاری، جو قارونی طبقے کی ایجاد ہے، اسلامی معاشرے میں نہیں، فقط غیر اسلامی معاشرے یا معاشی نظام ہی میں ہو سکتی ہے، لہٰذا سود کاری کی جملہ مروجہ اشکال بشمولِ کرایہ کاری و دستار گیری، جہاں پائی جائیں گی وہ لازماً غیر اسلامی۔ قارونی معاشرہ ہو گا۔

بہر حال کرایہ کاری بھی سود کاری ہی کی ایک شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ سود زرِ سیّال پر اور کرایہ زرِ منجمد پر لیا جاتا ہے۔ زرِ سیّال کے استعمال کے عوض جو زائد رقم مقروض سے لی جاتی ہے، اُسے ربٰو،

سود یا بیاج سے موسوم کیا جاتا ہے، جب کہ زرِ منجمد کے استعمال کے عوض جو رقم مقروض یا کرایہ دار سے لی جاتی ہے، اُسے کرایہ کہتے ہیں۔ سود کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ اسی یہودی ذہن کی انسانیت سوز ایجاد ہے، جس نے صدیوں بعد کارل مارکس کی صورت میں سود تو سود سرمائے کو بھی انسانیت کے لیے سمِ قاتل ثابت کر کے اس کے خلاف اس زور سے باغیانہ نعرہ لگایا کہ مظلوم و مقہور محنت کش صدیوں کے خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور انھوں نے "لا" کی بُت شکن قوت سے قیصر و فغفور اور ہامان و قارون کے ساتھ آزر کا بت بھی پاش پاش کر دیا۔

انسان کے ظلم و جہل کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ یہود نے سود ایجاد کیا، حالانکہ ان کے دین میں سود قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے سود خوری و سود کاری کا یہ شرعی حیلہ نکالا کہ زرِ سیّال کو منجمد کر کے اس پر سود لینا شروع کر دیا، لیکن تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے اس سود کو "کرایہ" کے نام سے موسوم کر دیا، اور اس طرح سود خوری و سود کاری کا شرعی جواز پیدا کر لیا۔ زرِ منجمد کا مطلب ہے غیر منقولہ جائیداد، جیسے زمین، مکان، دکانیں، ہوٹل، پلازے وغیرہ وغیرہ۔ جس طرح سود زرِ سیّال کے حاجتمند لوگوں کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اُٹھانے سے عبارت ہے، اس لیے ظلم اور شرعاً حرام ہے؛ اسی طرح کرایہ بھی زرِ منجمد کے حاجت مندوں لوگوں کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا نام ہے، لہٰذا ظلم اور شرعاً حرام ہے۔

اصل یہ ہے کہ سود اور کرایہ ایک ہی مسمّیٰ کے دو نام ہیں۔ اس اجمال کی صراحت ایک مثال کے ذریعے کی جاتی ہے۔ فرض کیجیے ایک بے گھر شخص اپنے مال دار دینی بھائی سے اپنے لیے مکان بنانے کی خاطر کچھ رقم بلا سود قرض مانگتا ہے۔ مالدار شخص سود لیے بغیر روپیہ قرض دینا نہیں چاہتا، لیکن سود کے نام سے ڈرتا بھی ہے، اس لیے کہ اُسے شرعاً حرام سمجھتا ہے۔ ساتھ ہی وہ کسی شرعی حیلے سے سود لینے کی طلب و جستجو بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ قرض کی مطلوبہ رقم سے خود مکان بناتا اور بے گھر حاجتمند شخص کو رہنے کے لیے دیتا ہے اور اپنی زرِ منجمد کے عوض اس سے معاوضہ یا سود لیتا ہے، لیکن اپنے آپ، معاشرے اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خاطر اُسے تسمیہ بالباطل کے ذریعے "کرایہ" کے نام سے موسوم

اور تاویل بالباطل کے ذریعے اُسے جائز و حلال قرار دیتا ہے۔ نام بدل دینے سے اصلیت تو نہیں بدل دی جاسکتی؛ خنزیر کو پالتو بنانے یا اس کا کوئی نام رکھ دینے سے وہ حلال تو نہیں ہوسکتا۔ وہ حرام ہے ہر حال میں حرام ہی رہے گا۔ اسی طرح سود ہر حال میں سود ہی رہے گا، چاہے اسے منافع کہیں یا کرایہ کا نام دیں یا پگڑی سے موسوم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ روپے کا معاوضہ سود ہے، چاہے وہ زر یا ال کی صورت میں ہو یا زرِ منجمد کی، جیسے زمین، مکان، دکانیں، فلیٹ، کارخانے، مارکیٹیں وغیرہ وغیرہ۔

دستار گیری یا پگڑی لینا

دستار گیری دراصل سود در سود کی ایک شکل ہے۔ اس کی رقم کی تعیین رسد و طلب کے استحصالی قاعدے کے مطابق کی جاتی ہے اور یک مشت پیشگی وصول کرلی جاتی ہے۔ سرمایہ کاری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ قرض کی مانگ بڑھی تو ساہوکاروں نے سود در سود کی شرح بڑھادی اور پھر سود در سود ایسی ظالمانہ وسفاکانہ رسم کی داغ بیل پڑی اور شرحِ سود کی تعیین سرمائے کی رسد اور قرض کی مانگ کے استحصالی قاعدے کے مطابق ہونے لگی۔ زرِ منجمد کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ مکانوں، دکانوں، فلیٹوں، کمروں وغیرہ وغیرہ کی مانگ بڑھی تو سرمایہ کاروں نے کرائے بھی بڑھا دیے اور کرائے کے تعیین کا قاعدہ بھی طلب و رسد کا استحصالی قاعدہ مقرر ہوا۔ ظاہر ہے اس کو مقرر کرنے والے بھی سرمایہ کار تھے۔ بر کیف، اس ضمن میں طلب بہ نسبت رسد کے زیادہ ہوئی تو سرمایہ کاروں نے سود در سود کی طرح دستار گیری یا پگڑی لینے کی رسم ایجاد کرلی۔ دستار گیری ظالمانہ اور طاغوتی فعل ہے، لیکن اس کے باوجود لوگوں نے اسے قبول کرلیا ہے، جس طرح وہ سود در سود اور کرائے کو قبول کرچکے ہیں، حالانکہ وہ اپنے آپ کو مسلمان و مؤمن سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ سرطان زدہ طبقے میں لوگوں کا حسِ قلبی۔ نظام بگڑ جاتا ہے، جس کے سبب ان کی سامعہ و باصرہ، جمالیاتی حس، ضمیر اور نفسِ لوامہ مفلوج و مردہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک تو انسان حق و باطل، حسن و قبح، حسنہ و سیئہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا، دوسرے اس میں ایسا کرنے کا داعیہ ہی پیدا نہیں ہوتا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں حسنِ زندگی

کی مردہ و خفتہ آرزو زندہ و فعّال ہی نہیں ہوتی۔

اس حقیقت کا ادراک کر لینے کے بعد کہ سود کی ہر صورت حرام ہے اور کرایہ اور "پگڑی" بھی سود کی صورتیں ہیں، ان مسلمانوں کے دلوں میں، جن میں رائی برابر بھی ایمان ہو گا، یقیناً یہ سوال پیدا ہو گا کہ سود کی ان لعنتوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیسے؟ اس سوال کا جواب ہے: ہاں۔ ہم سود کی لعنتوں سے یقیناً نجات پا سکتے ہیں، بشرطیکہ پہلے ہم میں ان سے نجات پانے کی سچی طلب و جستجو پیدا ہو، دوسرے طریقۂ نجات ایک ہی ہے اور وہ ہے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری سرطانوں کا استیصالِ کُلّی، جس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے:

حُسنِ انقلاب

پیغمبرِ اعظم و آخر، صاحبِ خُلقِ عظیم اور رحمۃ للعالمین صَلَّی اللہ علیہ وسلّم کا حُسنِ انقلاب۔

ایک اعتراض کا جواب

ہمارے اس موقف پر "کہ کرایہ اصل میں سود ہے، لہٰذا حرام ہے" بعض ناقدین کو یہ اعتراض ہے کہ اگر سرمایہ کار کرائے کے لیے مکان، دکانیں اور دیگر عمارتیں نہیں بنائیں گے تو ملک میں ان کی قلت پیدا ہو جائے گی، جسے دُور کیسے کیا جا سکے گا؟ یہ اعتراض اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ معترضین کے ذہن میں اسلامی معاشرہ نہیں، بلکہ ہمارا موجودہ سرمایہ دارانہ سرطانی معاشرہ ہے؛ ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ اسلامی معاشرے میں ایسی صورتِ حال کے پیدا ہونے کے کم امکانات ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں قرآنِ حکیم کے قوانین کی وجہ سے گردشِ دولت متوازن اور اس کا دائرہ کُل معاشرے کو محیط ہو گا؛ نیز افرادِ معاشرہ بھائی بھائی، خوشحال اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے۔ ضروریاتِ زندگی میں نان نفقہ، لباس، روزگار سمیت رہنے کے لیے مکان، کام کرنے کے لیے اراضی، روزگار اور کاروبار کرنے کے لیے دکان، دفتر وغیرہ وغیرہ سب چیزیں آتی ہیں۔ علاوہ بریں، صالح معاشرے میں افراد بھی ایک دوسرے کی ضروریاتِ زندگی کو حقوق العباد سمجھ کر پورا

کریں گے۔ حسنِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے حکمِ الٰہی میں یہی حکمت مضمر ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر بعض افراد کو رہنے کے لیے مکانوں اور کاروبار کے لیے دکانوں وغیرہ کی حاجت ہو گی تو اُسے رفع کرنا اسلامی حکومت کی بنیادی ذمے داری ہو گی۔

اصل یہ ہے کہ سود اور اس کی مروّجہ شکلوں کی ممانعت و اِستیصالِ کُلّی سے معاشرے میں جو متعدد حسین و مثبت نتائج برآمد ہوں گے، ان میں سے ایک نتیجہ سرطانی سرمایہ داروں کے اِستیصال کی صورت میں نکلے گا، اور یہ سرطانی طبقے ہیں جو معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں، جس کے نتائج قومی دولت کی غیر متوازن گردش، افلاس و احتیاج، معاشی ناہمواری و اقتصادی بدکرداری، استحصال و سودکاری، بددیانتی و بُخل، اسراف و تبذیر، تکاثر اور فحشاء و منکرات کی صورتوں میں نکلتے ہیں۔

حواشی

۱۔ جمالیاتی ارتقاء: انگریزی میں اسے (Aesthetic evolution) سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہ دراصل قرآنِ حکیم کا فلسفۂ اِرتقاء ہے۔ اس کے نزدیک انسان کا حقیقی اِرتقاء اس کے حسنِ ذات کے نور کا ارتقائے مدام ہے، اور اس کے لیے ہم نے "جمالیاتی ارتقاء" کی اِصطلاح وضع کی ہے۔ جمالیاتی ارتقاء حیاتِ انسانی کی غایت الغایات اور عظیم ترین کامیابی ہے، اور اس میں نور کی درجہ بدرجہ ترقی و اِتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ربِ ذوالجلال والاکرام نے قرآن میں انسان کو اپنے جمالیاتی اِرتقاء کے لیے دُعا سکھائی ہے اور وہ ہے: "رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (التحریم ۶۶: ۸: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کا اِتمام کردے اور ہمارے حفاظت فرما، بلاشبہ تو ہر چیز کرنے پر قادر ہے)۔ اس دُعا میں یہ لطیف نکتہ مضمر ہے کہ یہ دُعا مستقل و سرمدی نوعیت کی ہے؛ اور نور کی درجہ بدرجہ تکمیل کا مطلب اس کا اِرتقائے مدام ہے۔

آغازِ تخلیقِ انسانی میں اِرتقاء کی نوعیت حیاتیاتی تھی۔ لیکن اس کے اختتام کے بعد اس کی نوعیت جمالیاتی ہو گئی۔ ہوا یوں کہ انسان کی زندگی کا آغاز پانی میں ہوا جس طرح اب بھی رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔

بعدازاں، وہ ساحل کی جانب سفر کرنے لگا۔ یہ سفر اضطراری نوعیت کا تھا، شعوری نہ تھا۔ لیکن اسے اس کی آرزو ضرور تھی، بہرحال، وہ پانی سے نکل، پھر کیچڑ، بعدازاں سفر کرتے کرتے خشک کیچڑ اور پھر سوختہ اور کھنکھناتی مٹی میں رہنے لگا۔ انجامِ کار وہ جرأت کر کے ساحل پر اتر آیا اور وہاں سے آگے خشک سرزمین میں رہنے لگا۔ یہاں اس میں دو پاؤں پر چلنے کی آرزو پیدا ہوئی اور اُس نے بشر کی صورت و سرشت میں دو پاؤں پر چلنا سیکھ لیا تو اس کے حیاتیاتی ارتقاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس کے جمالیاتی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زمین پر اس کی حیاتِ نو کے سفر کا آغاز ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح سے پھونکا تو اس کے اعجاز سے اس میں حسّی، قلبی، نفسی نظام متحرک و فعال ہو گیا، ساتھ ہی اُسے ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی ودیعت ہو گئی اور بشر قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مکلف ہو گیا۔

جمالیاتی ارتقاء دراصل انسان کے نورِ بصیرت و شعور کا اِرتقاء ہے، جس کی بدولت وہ حسن و قبح، خیر و شر، حسنہ و سیئہ، عدل و ظلم، احسان و بُخل اور معروف و منکر میں تمیز کر سکتا ہے؛ نیز اپنی راہِ مستقیم اور منزلِ مقصود کو دیکھ سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نور کے ذریعے وہ روحانی یا ماورائی حقائق اور آسمانی بادشاہت کے علاوہ یگانہ و بے مثال ربِّ جلیل کا بصورتِ مجاز مشاہدہ بھی کر سکتا ہے۔ اسی نور کے ارتقاء و اِتمام کے طفیل ربِّ جلیل انسان کو "احسان" یا شاہدیت و مشہودیت کے حُسن المقام پر متمکّن کرتا ہے۔ جمالیاتی اِرتقاء کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اجتماعی صورت اختیار کر لے تو اس سے معاشرے کو حسن و نور، ترقی و خوشحالی اور امن و سلامتی کی جنّت اور افراد کو مؤمن و صالح یا اہلِ حسن و سرور بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چنانچہ اس سے امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو آپس میں ایک دوسرے کو حق و صبر اور مرحمت کی وصیّت کرتے رہنے کی تاکید کی ہے۔ (العصر ۱۰۳: ۲، اور البلد ۹۰: ۱۷)۔

انسان کے حیاتیاتی ارتقاء کا دوسرا دَور اس کی موت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ موت کے ذریعے اس جہانِ مرگ و زیست سے محض جہانِ حیات یا الحیوان کی طرف سفر کرتا ہے تو ازسرِ نو

اس کا جمالیاتی ارتقاء شروع ہو جاتا ہے، اور الحیوان میں پہنچ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ سفرِ موت عالمِ زمان و مکان سے ماوراء عالمِ دھر میں ہوتا ہے، اس لیے اس کی مدّتِ مدید کا اندازہ لگانا محال ہے۔ بہر حال، الحیوان میں انسان کو ایسا حسین و سدا بہار وجود عطا ہوتا ہے، جو "موت پروف" یا "منزہ عن الموت" ہوتا ہے، یعنی ہلاکت و موت، تباہی و بربادی، خرابی و فساد اور اضمحلال و انحطاط سے منزّہ و وراء اور محفوظ و مصئون ہوتا ہے۔ یہاں اس کے جمالیاتی ارتقاء کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں اس ازبس اہم و بصیرت افروز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اہلِ جنّت جو اہلِ حسن و نور ہوتے ہیں، ان کے جمالیاتی ارتقاء کا سلسلہ خود بخود شروع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس کا سلسلہ دُنیا میں بھی جاری و ساری ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اہلِ نار کے جمالیاتی ارتقاء کے لیے ان کا تزکیہ بذریعہ آتشِ جہنم کیا جاتا ہے، اور اس کی کیفیّت و کمیت اور مدّت کا انحصار قلب کے حسن و قبح یا اس کی مثبت و منفی جمالیاتی اقدار کی نوعیت پر ہوتا ہے۔

(۲.۳) **نفسِ بدنی و نفسِ روحی:** انسان اور حیوان میں ایک مابہ الامتیاز فرق یہ ہے کہ حیوان میں صرف نفسِ بدنی ہوتا ہے، جبکہ انسان میں نفسِ بدنی کے ساتھ نفسِ روحی بھی پایا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وجودِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کی روحِ خلّاقی ہوتی ہے، جس کی بدولت اس میں حسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام قائم و دائم اور فعّال و حرکی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ روحِ خلّاقی جب کسی فردِ بشر کے وجود میں نفوذ و سرائیت کر جاتی ہے تو اپنی ایک منفرد و مشخّص صورت و حیثیت اختیار کر لیتی ہے، جس کے لیے نفس، روح، خودی، انا، من، "میں" وغیرہ وغیرہ متعدّد تعبیریں استعمال کی جاتی ہیں۔

نفسِ انسانی کا تعلّق ایک تو وجود یا بدن سے ہوتا ہے، جس کے باعث اس میں حیوانیت یا حیوانی تقاضے پائے جاتے ہیں اور اس بنا پر اسے "حیوان" کہتے ہیں؛ دوسرے اس کا تعلق روحِ خلّاقی سے ہوتا ہے، جس کے باعث اس میں "انسانیت" یا انسانی تقاضے پائے جاتے ہیں۔ انسانی تقاضوں کی نوعیت "ذہنی" ہوتی ہے؛ یعنی اُخروی، جمالیاتی، اخلاقی، درائی، اُخروی، نیز اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسانیت کا بنیادی تقاضا آرزوئے حسن و حیات ہے۔ آرزوئے حسن سے مراد جمال و جلال،

حسن و رحمت، عشقِ الٰہی اور جمالیاتی ارتقاء کی آرزو ہے؛ اور آرزوئے حیات سے مراد خوف و حزن کے آتشیں عناصر سے منزّہ، حسین و منوّر اور مطمئن و مسرور زندگی کی سچی آرزو ہے۔ الغرض، نفس جس کا رابطہ روحِ خلّاقی سے ہوتا ہے، نفسِ روحی کہلاتا ہے اور جس نفس کا تعلق بدن سے ہوتا ہے، اُسے نفسِ بدنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے وحدتِ نفس میں ثنویت پائی جاتی ہے۔ اس ثنویت میں تسویہ و تعدیل یا توازن و اعتدال قائم رکھنے سے انسان کی شخصیت میں توازن یا جمال و جلال پیدا ہوتا ہے اور اُسے صاحبِ حسن و سرور بناتا ہے۔

۴۔ مترفین؛ دیکھیے الواقعہ ۵۶: ۴۵ و بمواضع کثیرہ۔

۵۔ انفاق بالعفو؛ دیکھیے البقرہ ۲: ۲۱۹۔

۶۔ دیکھیے المائدہ ۵: ۱۱۹؛ المجادلہ ۵۸: ۲۲۔

۷۔ بخاری در المشکوٰۃ،

۸۔ الاسراء ۱۷: ۲۹۔

۹۔ ربوا یا سود؛ دیکھیے امام راغب، المفردات، بذیلِ مادہ ربو و آلِ عمران ۳: ۱۳۰؛ نیز دیکھیے بخاری در المشکوٰۃ، بابِ الربوا، ح ۲۶۔

۱۰۔ البقرہ ۲: ۲۷۵؛ نیز دیکھیے حرمتِ سود پر متن میں احادیثِ جلیلہ۔

۱۱ البقرہ ۲: ۲۷۸ تا ۲۷۹۔

۱۲۔ جمالیاتی تخلیقی فعلیت (Aesthetic creative activity) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ احسن الخالقین کہا ہے، اس لیے کہ اس کی یہ سُنّت ہے کہ وہ جو شے تخلیق کرتا ہے اُسے حسین بناتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر تخلیق جمیل و جلیل اور خوبصورت و حیرت انگیز ہوتی ہے۔ تخلیق و حسن کاری کے اس دُہرے اور لازم و ملزوم عمل کے لیے ہم نے جمالیاتی۔تخلیقی فعلیت کی تعبیر اختیار کی ہے اور خطِ وصل (-) اسی حقیقت پر دال بھی ہے اور اس کی علامت بھی۔

۱۳۔ البقرہ ۲: ۲۷۵

۱۴۔ البقرہ ۲: ۲۷۵ تا ۲۷۸؛ آلِ عمران ۳: ۱۳۰؛ النسآء ۴: ۱۶۱۔

۱۵۔ معاوضۂ نام و شہرت: (Good-will)

۱۶۔ دیکھیے مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری: معاشیاتِ نظامِ مصطفیٰ، بحوالہ "فتاوٰی قاضی خاں مع عالمگیری"، ۲: ۲۷۹ ببعد، مصر۔

۱۷۔ دیکھیے روزنامہ جنگ، لاہور، ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء۔

۱۸۔ جلال بازی: اس سے مراد میدانی کھیل ہیں جن میں انسان اپنے جلال یا قوت و توانائی اور حوصلہ و شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۱۹۔ حسنِ مزارعت: اس سے متن میں بحث کی گئی ہے، دیکھیے ص ۷۵ ببعد۔

باب ۶

ثقافتی انقلاب[1]

ثقافت عبارت ہے کسی قوم کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ، جمالیاتی ذوق، حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت، نظامِ تعلیم و تربیت، جمالیاتی فنون و ادبیات، قومی و ملّی روایات اور رسم و رواج سے۔ یہ بڑی ہی تلخ و عبرتناک حقیقت ہے کہ "پاکستانی ثقافت اسلامی نہیں سرطانی ہے"۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو اس نے ملوکیت و استعماریت کے ادوار میں نشو و نما پائی ہے؛ دوسرے یہ فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کے سانچوں میں ڈھلی ہے، اور تیسرے یہ کہ ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں بلکہ سرطان زدہ ہے، اس لیے کہ اس کا آئین غیر قرآنی ہے اور اس کے نظامِ معاشیات کی اساس ظلم و استحصال، سود و زکاتِ اور اکتناز و احتکار پر قائم ہے، نیز اس پر معاشرتی سرطانوں کی سطوت و سیادت اور عملداری و حکمرانی ہے۔ ظاہر ہے سرطان زدہ معاشرے کی ثقافت بھی سرطانی ہونی چاہیے اور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہماری کوئی قومی یا ملّی ثقافت ہے ہی نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اوّل تو ہماری کوئی قومیّت ہی نہیں، اس لیے کہ ہم میں شعورِ قومیّت ہی نہیں؛ دوسرے اس میں وحدتِ ثقافت کا فقدان ہے۔ تیسرے ہمارا کوئی ثقافتی تشخص ہے، نہ ہم میں اس کا احساس و شعور ہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پاکستان محض علاقائی ثقافتوں کا ملک ہے اور ان میں ہم آہنگی و وحدت عنقا ہے۔ علاوہ بریں، علاقائی ثقافتیں بھی معاشرتی سرطانوں کے وضع کردہ سانچوں میں ڈھلی ہیں اور ان پر ان کی چھاپ لگی ہے، علاوہ ازیں، یہ نہ تو اپنے عقائدِ جلیلہ و محرکہ اور قومی و ملّی روایات کی مظہر ہیں اور نہ ان میں قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم و تربیت ہی قائم ہے، نیز وہ رنگِ قومیت سے مزیّن ہیں نہ نفسِ قومی سے ان کا رشتہ استوار ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرتی سرطانوں کی پیدا کردہ عصبیت کی وجہ سے وہ اسلامی ثقافت کی روح سے محروم ہیں۔

قرآنِ حکیم نے انسانیت کو یہ جانفزا و انقلاب آفرین مژدہ دیا تھا کہ اسلام اُسے ایک حسین و طیّب ثقافتی زندگی سے روشناس کرانے اور معاشرتی سرطانوں کی غلامی اور ان کی رسوماتِ قبیحہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بنی نوعِ انسان کو نجات دلانے آیا ہے۔[۲] تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے واقعی اپنی تحریکِ رحمۃً للعالمینی اور حسنِ انقلاب کے ذریعے اپنے معاشرے میں فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کا قلع قمع کر دیا، اُن کے طوقِ غلامی اور ان کی آفریدہ رسوماتِ قبیحہ کی سلاسل سے انسان کو نجات دلائی، اور اُسے حسین ثقافتی زندگی سے آشنا کیا۔[۳] لیکن بدقسمتی سے خلافتِ راشدہ کے بعد دَورِ ملوکیت کا آغاز ہوا اور وہ بتدریج رنگِ فرعونیت سے مزیّن ہوتی گئی تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں چار معاشرتی سرطان پیدا ہو گئے، جنھوں نے حکومت و سیادت، قوّت و سطوت، منصب و اقتدار، شان و شوکت، مال و دولت اور اثر و نفوذ کے ذریعے اسلامی معاشرے کو سرطانی بنا دیا۔ پھر ہر سرطانی طبقے نے رعایا کو اپنا محکوم رکھنے اور اس کا استحصال کرنے اور جلبِ منفعت کی خاطر اُسے دین کے نام پر طرح طرح کی رسوم و قیود میں جکڑ دیا۔ اس تاریخی واقعیّت کی نشاندہی کی جاتی ہے؛

برِصغیر کی ثقافتی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس اصل سے آگاہ کرتا ہے کہ قریب قریب جُملہ رسوماتِ سیّئہ آفریدۂ آزریت ہیں، یعنی انھیں مشرک دینی پیشواؤں یا برہمنوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ رسومات آزری علماء و مشائخ کے ذریعے مُسلم معاشرے میں "باندازِ قارونی" رائج ہوئی ہیں۔ "باندازِ قارونی" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ان رسومات میں حتّی المقدور اسراف و تبذیر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور آزری شیاطین کے جمالیاتی فریب کی وجہ سے ان رسومات کو "دینی" سمجھتے ہیں اور اسراف و تبذیر بھی کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔

آزروں کے جمالیاتی فریب کی دو بڑی اقسام ہیں تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل۔ ان مصطلحات سے مفصّل بحث میں اپنی تصنیف "آرزوئے حسن" میں کر چکا ہوں، لہٰذا یہاں ان کی مجمل صراحت کر دی جاتی ہے؛

"تسمیہ بالباطل" کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ کسی ذی روح، غیر ذی روح یا محض خیالی چیز کو اس نام سے موسوم کرنا یا اس صفت یا صفات سے موصوف کرنا، جو اس میں موجود نہ ہوں؛ یعنی وہ چیز یا ہستی اسم بے مسمّٰی ہو۔ تسمیہ بالباطل دراصل اسم بے مسمّٰی کو جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے اسم با مسمّٰی بنانے کا آزری فن ہے۔

"تاویل بالباطل" بھی آزری فن ہے جس کے ذریعے وہ احکام الٰہی اور جمالیاتی و اخلاقی مستقل اقدار کی غلط و گمراہ کُن تعبیر و تاویل اس انداز میں کرتے ہیں کہ سادہ دل لوگ ان کو سچ سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تعبیریں اور تاویلیں آزری تشہیر بالباطل کے ذریعے ان کا پختہ عقیدہ بن جاتی ہیں۔

قارونیت چونکہ آزریت کی معاون و سرپرست ہوتی ہے، اس لیے وہ قارونی رسومات سے تعرض نہیں کرتی؛ نیز آزروں کا اغماض قارونی رسومات کا جواز بن جاتا ہے۔ قارونی رسومات سے وہ تمام رسومات مراد ہیں، جن میں اسراف و تبذیر، تفاخُر، نام و نمود اور شان و شوکت کا مظاہرہ کیا جائے، مثلاً شادی بیاہ، پیدائش و ختنہ، سالگرہ وغیرہ وغیرہ کی رسومات؛ ان میں بعض رسوماتِ مرگ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

رسوماتِ مرگ، جو پاکستانی معاشرے میں رائج ہیں، قریب قریب سب آزروں کی پیدا کردہ ہیں اور قارونی رنگ سے مزیّن ہیں۔ شادی و مرگ کی رسومات، جو اسراف و تبذیر کی مظہر ہیں، حقیقت میں سرطانی ہیں اور اسلام بنی نوعِ انسان کو ان سے رہائی دلانے کے لیے آیا تھا، لیکن آزروں اور قارونوں نے لوگوں کو ان کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ حسنِ انقلاب کے بغیر ان سے گلو خلاصی ناممکن ہے۔

آزروں اور قارونوں کی وہ رسومات جنھوں نے مسلم ثقافت کو رشکِ ثقافتِ برہمنی بنا رکھا ہے، "مزاری و پیری" اور "اصنامی" و "شبیہی" رسومات ہیں۔ یہ ان کے تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کی معرکتہ الآراء ایجادات ہیں، جن کو ابلیس کے جمالیاتی فریب نے ایسا مزیّن کر دیا ہے کہ لوگ اُنھیں عبادت و کارِ ثواب سمجھ کر ادا کرتے اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ ستم بر ستم یہ کہ اس شرک و اصنام پرستی کو توحید پرستی پر محمول کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہماری ثقافتی رسومات قارونی و آزری ہیں؛ یعنی وہ اسراف و تبذیر، شرک و اصنام پرستی

اور توہم پرستی کی آئینہ دار ہیں، حالانکہ اسلام کے نزدیک اسراف و تبذیر اگر شیطانی عمل ہے تو شرک و اصنام پرستی ظلمِ عظیم ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ یہ بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے کہ سرطانی۔ استحصالی طبقے ان رسومات کے متحمل ہو سکتے ہیں، لیکن متوسط الحال اور مفلوک الحال طبقات ان قارونی و آزری رسومات کی زنجیروں میں اس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ وہ ان سے گلو خلاصی تو چاہتے ہیں، لیکن جب تک معاشرے پر سرطانی طبقات مسلّط رہیں گے، ان کا ان سرطانی رسومات سے نجات پانا ناممکن ہے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ بنی نوع انسان کو ان سرطانی رسومات سے نجات دلانا اسلام کے اوّلین مقاصدِ جلیلہ میں ہے۔ اگر ہم اسلام کا یہ بنیادی مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان سرطانی رسوم و قیود کی زنجیروں کو توڑنا اور ان سے بنی نوع انسان کو بالعموم اور اپنے افرادِ معاشرہ کو بالخصوص رہائی دلانا ہو گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا طریقِ کار کیا ہے؟ قرآنِ حکیم اور اُسوۂ حسنہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کا اب ایک طریقِ کار باقی رہ گیا ہے اور وہ ہے:

سرطانی طبقات کا اِستیصال بذریعہ حُسنِ انقلاب

گرم بازاریِ عقائد کا قانون

قوم کے نشو و اِرتقاء اور قوت و توانائی کا اِنحصار اس کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک یہ عقائد اس کے وجود میں خون کی طرح جاری و ساری رہتے ہیں وہ مضبوط و توانا اور نشو و اِرتقاء کرتی رہتی ہے، اور ان عقائد کی گرم بازاری بھی رہتی ہے۔ علاوہ بریں، قوم ان کے حوالے سے سوچتی اور ان کی قوت سے عمل کرتی ہے، لیکن جب عقائد بعض عوامل و محرّکات کے باعث کمزور پڑ جاتے ہیں تو قوم کی زندگی میں اپنی موزونیِ تقدیر کے مطابق جاری و ساری نہیں رہتے اور اس طرح ان کا رشتہ اس سے بتدریج منقطع ہونے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی جگہ عقائدِ باطلہ لینے لگتے ہیں اور جب وہ ایک بار قوم کی زندگی میں جذب ہو کر جاری و ساری ہو جاتے ہیں تو وہ عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کو مضمحل و کمزور اور

بے جان بنانے اور انھیں قوم کی زندگی سے نکالنے میں سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں، اور آخرِکار ان کی جگہ متمکن ہو جاتے ہیں یا ان کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا قوم کیلئے ازبس دشوار بلکہ بعض صورتوں میں محال ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال قریب قریب جملہ مسلم اقوام کی ہے۔ عقائد کے اس تاریخی عمل کو ہم نے قانونِ گرمِ بازاریِ عقائد سے تعبیر کیا ہے۔

گرم بازاریِ عقائد کا قانون اور تسمیہ بالباطل

گرم بازاریِ عقائد کے قانون اور تسمیہ بالباطل کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اس لیے کہ عقائدِ باطلہ کی تشہیر بالباطل کسی طرح بھی تسمیہ بالباطل کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ حیاتِ قومی میں عقائد باطلہ رچ بس جاتے ہیں تو ان سے سرطانی طبقے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں، اس لیے کہ ان کی بدولت انھیں لوگوں کا استحصال کرنے، ان پر اپنا حکم چلانے اور معاشرے میں معزز مقام حاصل کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ژرف نگاہی سے جائزہ لینے اور اس پر تفکر بالحق کرنے سے اس اصل کا سُراغ ملتا ہے کہ عقائدِ باطلہ کے موجد اور ان کے جواز کی تشہیر بالباطل کرنے، نیز انھیں قبولِ عام کی سند عطا کرنے والے معاشرتی سرطان ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام اپنے پروردہ معاون آزری طبقے سے کراتے ہیں، جو تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے عقائدِ باطلہ کو جائز و حسین بنا کر دکھاتے ہیں اور سادہ لوح انسان اس دھوکے میں مارے جاتے ہیں۔ اس خوشنما دھوکے کے لیے ہم نے "ابلیس کا جمالیاتی فریب" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت پاکستانی قوم سمیت کُل مسلم اقوام میں تسمیہ بالباطل کے جمالیاتی فریب کے سبب عقائدِ باطلہ جاری و ساری ہیں تو یہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایسی حقیقت کا اعتراف ہوگا جو ان عقائدِ باطلہ اور ان کے نقیب معاشرتی سرطانوں کے استیصالِ کُلّی و فوری کی متقاضی ہے۔ ظاہر ہے یہ کام حسنِ انقلاب ہی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

نظامِ تعلیم

کسی قوم کا نظامِ تعلیم اس کی باطنی وظاہری زندگی کا مظہر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظامِ تعلیم خُلقِ انسانی کی تشکیل وتزئین کرتا ہے، اور خُلق ہی وہ باطنی سانچہ ہے، جس میں عقائد ونظریات، افکار وتصورات، عواطف وامیال، جذبات واحساسات، اقوال وافعال اور اخلاق وکردار تشکیل پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے نظامِ تعلیم اپنی قوم کے علم وحکمت، ادب وفن اور سائنس وٹیکنالوجی کے ارتقاء، نیز دینی وفکری اور اخلاقی وجمالیاتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر نصابِ تعلیم کی تاسیس جمالیاتی واخلاقی اقدار پر ہوگی اور اس کے مقاصدِ جلیلہ میں آرزوئے حُسن وحیات کا احیاء وارتقاء بھی ہوگا تو وہ آدم گر ہوگا اور اس میں صالح انسان پیدا کرنے کی قابلیت ہوگی۔ صالح شخص ہی حقیقت میں ان اوصافِ حمیدہ سے متصف ہوتا ہے جو وجہِ شرفِ انسانی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اصل فطرتِ صحیحہ پر ہوتا ہے، لہٰذا وہ مفسد نہیں، مُصلح؛ ظالم نہیں، عادل؛ بخیل وحاسد نہیں، کریم ومحسن؛ شقی القلب نہیں، سعید؛ سنگدل نہیں، رحم دل؛ بدخُلق وبدکردار نہیں، خوش خُلق ونیک کردار؛ جاہل وسرکش نہیں، صاحبِ علم وحکمت؛ مجرم وحرام خور نہیں، نیک وحلال خور؛ تن آسان وکام چور نہیں، محنتی وجفاکش؛ کاذب نہیں، صادق؛ متکبّر ومغرور نہیں، حلیم ومتواضع؛ الغرض اہلِ نار نہیں، صاحبِ حُسن وسرور ہوتا ہے؛ نیز اُس میں آرزوئے بیتہ ومرگ نہیں، آرزوئے حسن وحیات ہوتی ہے اور زندہ وفعّال ہوتی ہے، علاوہ بریں وہ حُسن کور وکور ذوق نہیں، بلکہ صاحبِ ذوق ونظر ہوتا ہے؛ اس کا قلب اندھا نہیں بینا اور اس کا نورِ حرکی وارتقائی ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر بچہ فطرتِ صحیحہ یا حسین سرشت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے خُلق کو حسین رکھنے یا قبیح بنانے کا ذمے دار نظامِ تعلیم ہوتا ہے اور اس میں والدین کی تعلیم اور ماحول کے ثقافتی اثرات (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی قوم کا سچّا نظامِ تعلیم وہ ہوتا ہے جو اس کے عقائدِ جلیلہ ومحرّکہ، نظریات وخیالات اور عزائم وتمنیات کا ترجمان ہو۔ اگر ایسا

نہیں تو اس میں کذب و منافقت کی آمیزش ہوگی، جو بشمول طلبا افرادِ قوم کے خُلق کو اس رنگ میں رنگ دے گی، یعنی انھیں کاذب و منافق بنادے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا نظامِ تعلیم نہ تو ہمارے موحدانہ عقائدِ جلیلہ و محرکہ کا اور نہ ہماری فطری آرزوئے حُسن و زندگی کا مظہر ہے، بلکہ رنگِ کذب و منافقت سے مزین ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ یہ حقیقت ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اُسے مزید تاخیر اور حیل و حجت کے بغیر تسلیم کرلیں اور اپنے جھوٹے اور منافق نظامِ تعلیم کا، جس میں ثنویت بھی پائی جاتی ہے، قلع قمع کردیں اور اس کے بجائے صرف ایک قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم قائم کریں، اس لیے کہ اس پر ہی ہماری قومی و ملّی بقا و سلامتی، آزادی و عزت اور قوت و ترقی کا انحصار ہے۔ ہم اگر اپنے موجودہ بے قرآن و قلم "دینی" اور بے قرآن سیکولر تعلیمی نظاموں کے حوالے سے اپنی قومی و ملّی زبوں حالی و پس ماندگی کا بغور جائزہ لیں تاکہ ہم اس کے عوامل و محرکات کا سراغ لگا سکیں تو ہم لامحالہ ان کو ہی اس کا ذمے دار پائیں گے۔ اس صورتِ حال کا مداوا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے نظامِ تعلیم میں جو ثنویت پائی جاتی ہے اُسے دُور کیا جائے اور دو تعلیمی نظاموں کی جگہ صرف ایک قرآن کا نظامِ تعلیم قائم اور اس کا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے۔ قرآنِ حکیم کا نصابِ تعلیم کیا ہے؟ اس سے اب گفتگو کی جاتی ہے۔

ہماری قرآن ناشناسی اور اس سے دُوری و مہجوری کا یہ عالم ہے کہ عوام تو عوام، اہلِ علم و دانش، حتیٰ کہ اکثر نام نہاد علمائے دین بھی یہ سوال کرتے حجاب محسوس نہیں کرتے کہ قرآنِ مجید کا نصابِ تعلیم کیا ہے؟ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظامِ تعلیم کا ذکر آتا ہے تو یہ سوال اکثر دلوں میں خلش پیدا کرنے لگتا ہے کہ اسلام کا کوئی نظامِ تعلیم و نصاب ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم ثنویت کا کیوں شکار ہے، اور اس توحید رُبا ثنویت کو پیدا کرنے کے ذمے دار کون تھے؟ نیز اس ثنویت کو دُور کیوں نہیں کیا جاتا؟ اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو کیسے کر سکتا ہے؟ کیا ہمارے "دینی" مدارس کا نصابِ تعلیم وہی ہے جو قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے اور جسے معلّمِ اوّل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام کی پہلی درس گاہِ نبوی میں رائج کیا تھا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں دورِ ملوکیت

میں "دینی" مدارس میں قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم کے بجائے کوئی دوسرا نصابِ تعلیم داخل اور رائج کیا گیا؟ نیز اس کے ذمے دار کون تھے اور اس سے ان کی غرض و غایت کیا تھی؟ ایسا کیوں ہے کہ اسے تبدیل کر کے قرآنی نصابِ تعلیم رائج نہیں کیا جاتا؟ اِحیائے اسلام اور نفاذِ اسلام کی تشہیر کرنے والے کیوں تعلیمی ثنویت کو دُور نہیں کرتے اور قرآنِ مجید کا نصابِ تعلیم درس گاہوں میں رائج نہیں کرتے؟ یہ انتہائی اہم و بصیرت افروز سوال ہیں، جن کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا اسلام کا کوئی اپنا نصابِ تعلیم ہے یا نہیں؟ اس کا ایک لفظ میں جواب دینا ہو تو وہ ہے، "ہاں"۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام میں علم کو "فرض" کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا سیکھنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے اور فرض کی حیثیت کُلّی و دائمی ہے[۵]۔ چنانچہ ہر مسلمان مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کا مکلّف ہے[۶]۔ علاوہ بریں، تقویٰ قرآنِ حکیم سے ہدایت حاصل کرنے کی ناگزیر پیش شرط ہے اور قرآن مجید کی رُو سے اہلِ علم متّقی ہوتے ہیں[۷]۔ یہ بھی قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ علم کی استعداد ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے اور اسے قوّت سے فعل میں لا کر وہ زمان و مکان کی تسخیر کر سکتا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے تمتّع کر سکتا ہے؛ نیز علم اگر "سلطان"[۸] یا قوتِ تسخیر ہے تو حکمت خیرِ کثیر[۹] ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس دین کا علم سے متعلق یہ عقیدہ و رویّہ ہو، وہ علم کی قوتِ تسخیر اور حکمت کی خیرِ کثیر حاصل کرنے کے لیے انسان کو تعلیم کا کامل و مثالی نصاب و نظام نہ دیتا، کیسے ہو سکتا تھا؟ اصل یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو ایسا نظامِ تعلیم و نصاب دیا ہے جو احسن و اکمل ہے اور ہر دَور میں رہنما اصول دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور قرآنِ مجید لوحِ محفوظ میں مرقوم ہے۔ اس سے اب یہ دوسرا اور بنیادی سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا نظامِ تعلیم و نصاب کیا ہے؟ لہٰذا اب اس کا جواب قرآنِ مجید کے حوالے سے دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں نظامِ تعلیم کا قیام و انصرام حکومت کی اہم ترین ذمے داری اور اس کے اوّلین فرائض میں سے ہے۔ نظامِ تعلیم اصل میں نظامِ صلوٰۃ کا جزوِ لاینفک ہے۔ بالفاظِ دیگر، مکتب مسجد کا جزوِ لاینفک یا اٹوٹ انگ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مدینۂ منوّرہ میں

ورودِ مسعود فرماتے ہی سب سے پہلے نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے کی غرض سے مسجدِ نبویؐ تعمیر کی، جو بیک وقت سجدہ گاہ بھی تھی اور درس گاہ بھی۔ اس کے معلّمِ اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور تلامذہ اصحابِ صُفّہ تھے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے نبوّتِ آخر کا اوّلین فریضہ اور مقصود نظامِ تعلیم کا قیام وانصرام اور اس کے فطری اُصولوں کے مطابق طالبانِ علم کو تعلیم وتربیت دینا تھا۔ یہ درسگاہ اپنے قرآنی نصاب و نظامِ تعلیم کے اعتبار سے ایک مثالی اقامتی یونیورسٹی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس کے نصابِ قرآن کی نشاندہی کر دی جاتی ہے؛ جو مفصلۂ ذیل اجزائے خمسہ پر مشتمل ہے:

(۱) آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت (۲) تزکیہ (۳) تعلیم الکتاب (۴) تعلیم الحکمت (۵) علومِ نو کی تعلیم۔ یہ نصابِ تعلیم بادی النظر میں تو مختصر ہے، لیکن حقیقت میں جامع و مانع ہے۔ اس کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت: یہ قرآنِ حکیم کی فکر انگیز ذومعنی اصطلاح ہے۔ میرے نزدیک اس کی معنویت "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" میں مضمر ہے۔ اس اعتبار سے آیاتِ الٰہیہ کا مطلب ہوا اللہ تعالیٰ کی تخلیقی فعلیت، جو جمالیاتی۔ تزدیجی ہے، اور اس کے نو بنو مظاہر، جو حیات وکائنات، زمان ومکان اور صفاتِ الٰہیہ کے حقائق اور اسرار ورموز کے آئینہ دار ہیں۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ آیاتِ الٰہیہ کے علم کا مطلب طبیعی یا سائنسی علوم ہوئے، جن میں اِرتقائے ابعادی و فروعی کے لامحدود امکانات ہیں۔

اس اصطلاح کا دوسرا معنیٰ "العصر" ہے۔ اس مصطلحۂ قرآنی کا مطلب ہے: اقوامِ عالم کے اہم وسبق آموز اور عبرت ناک وبصیرت افروز واقعات وسانحات جو کُتب میں مرقوم یا لوحِ زمانہ میں محفوظ ہیں۔ اسے مرقوم وغیر مرقوم داستانِ عملِ تاریخی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں؛ "ایام العرب" کی تعبیر کے قیاس پر العصر کو "ایام الانسان" بھی کہہ سکتے ہیں، لہٰذا اس کے مفہوم میں تاریخ وفلسفۂ تاریخ؛ سوانح حیات اور اس سے ملتے جلتے علوم شامل ہیں، جو علم کی ترقی کے ساتھ ایجاد ہوتے رہیں گے۔

اس کے تیسرے معانی آیاتِ قرآنی ہیں، جن کی تلاوت سے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں: قرآنِ مجید کے معانی جاننے والے اور اہلِ زبان اس کے معانی ومطالب سے آگاہ ہوتے ہیں اور یہ آگہی بڑے کام کی چیز ہے اور اس میں سامعین کو خود آگاہ وخدا آگاہ بنانے کی قابلیت پائی جاتی ہے؛

نیز ان سے ذوقِ قرآن پیدا ہوتا ہے۔ ذوقِ قرآن نعمتِ حسنیٰ ہے۔ اس سے جمالیاتی ذوق کا نشو و ارتقاء ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان میں حسنِ کلام سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنے کی قابلیت و آرزو پیدا ہوتی ہے اور کلام کے حسن و قبح میں امتیاز کرنے کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ ذوقِ قرآن اہلِ قلم و فن میں حسن کار بننے کا داعیہ پیدا کرنے اور ان کی تخلیقی فعلیت کو جمالیاتی بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ دراصل حسنِ الفاظ و معنی کا ذوقِ عظیم ہے۔ بالفاظِ دیگر، ذوقِ قرآنی ذوقِ بلاغتِ کلام ہے۔

علاوہ بریں، آیاتِ قرآنی میں جمالیاتی تاثیر ہوتی ہے، جو حسنِ قرأت سے افزوں ہو جاتی ہے اور اس سے قلب میں جمالیاتی سوز پیدا ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آیاتِ الٰہی میں جمالیاتی۔ نفیاتی لمحہ مضمر ہوتا ہے جس طرح سحاب میں برق پنہاں ہوتی ہے اور حسنِ تصادم سے اپنا جلوہ پیدا کرتی ہے، اسی طرح حسنِ قرأت سے قاری کے قلب میں جمالیاتی۔ نفیاتی لمحہ کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ان اور دیگر فوائد کی بنا پر آیاتِ الٰہیہ قرآن حکیم کے نصابِ تعلیم کا ایک لازمی حصّہ ہے اور اسے اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

آیاتِ الٰہیہ کے متذکرۂ بالا معانی و مطالب کی روشنی میں ہم درجہ وار اس کی کتبِ نصاب تیار کر سکتے ہیں اور اسے ابتدائی تعلیم سے یونیورسٹی کی تعلیم تک لازمی مضمون قرار دینا ہوگا۔

الغرض، آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت طلباء کو ابتداء ہی سے قرآنِ مجید سے روشناس کرانے اور ان میں الہامی زبان کے حسن اور تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے مسلمانوں کو جو نصابِ تعلیم دیا ہے اس میں اس کو اوّلیت کا درجہ عطا کر کے اس کی غیر معمولی اہمیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت از بس فکر انگیز ہے کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بنی نوعِ انسان کے معلّمِ آخر حضرت محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے لیے جو دُعا مانگی تھی اور جسے ربِّ جلیل نے انسان کی رشد و ہدایت کے لیے قرآنِ مجید میں محفوظ کر لیا ہے، اس میں بھی آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت کو اپنے مجوّزہ نصابِ تعلیم میں اوّلیت

کا مقام دیا گیا ہے۔

۲۔ تزکیہ: قرآنِ حکیم کے نصاب تعلیم کا دوسرا مضمون تزکیہ ہے؛ اور اس سے مراد انسان کی باطنی زندگی کی تطہیر بغرضِ نشوو ارتقاء ہے۔ باطنی زندگی اجزائے ثلاثہ سے مرکب ہے، جن کے اپنے اپنے نظام ہیں اور انھیں حواس، قلب اور نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تینوں نظام علیحدہ و منفرد اور خود مختار و خود کار ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے لاینفک طور سے مربوط اور ہم کار و معاون ہیں، نیز ایک دوسرے کے لیے عامل و معمول کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، لہٰذا ان کے لیے ہم نے حِسّی۔ قلبی۔ نفسی نظام کی تعبیر اختیار کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے تزکیہ کے مفہوم کی صراحت کر دی جاتی ہے۔

تزکیہ قرآنِ حکیم کی اساسی مُصطلحات میں سے ہے۔ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور پہلودار ہے، جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے معانی ہیں: اوّلاً، تصفیہ و تطہیر کے ذریعے قلب کی تحسین و تنویر اور احیاء کرنا تاکہ اس کے نور کا ارتقاء و اتمام ہو سکے۔ اس جگہ اس لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے اِرتقائے خودی، اِرتقائے اِنسانی، ارتقائے نفس یا اِرتقائے روحانی کا مطلب اِرتقائے نورِ قلب ہے، جس کے لیے ہم نے جمالیاتی ارتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ثانیاً، خُلق کی تحسین کرنا، جس کا مطلب اپنے خُلق کو حسین و عظیم بنانا یا بالفاظِ دیگر محاسنِ اخلاق یا مکارمِ اخلاق کی تکمیل و اِتمام کرنا ہے۔

قرآنِ مجید نے اپنے اعجازِ بلاغت سے تزکیہ کو علم و حکمت پر مقدّم کر کے نہ صرف اس کی غیر معمولی اہمیّت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی، بلکہ اس کی متعدد اہم اقدار کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی متذکرۂ بالا دُعا میں تزکیہ کو تلاوتِ آیاتِ الٰہیہ، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت کے بعد چوتھے درجے پر رکھا تھا، لیکن حکمتِ الٰہی نے اسے اپنے نصابِ تعلیم میں دوسرے درجے پر رکھا ہے۔ اس تقدیم سے ہم مندرجۂ ذیل نکات کا استنباط کر سکتے ہیں:

اوّل: تزکیہ حصولِ علم و حکمت کی پیش شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم کو نفسیاتی لحاظ سے حصولِ علم و حکمت کے قابل بنانے کے لیے اُس کے خُلق کو موزوں اور حسین بنانا لازمی ہے۔

دوم، انسان میں مضمر استعدادِ علمی کو قوت سے فعل میں لانے اور اس میں علم کی طلب و جستجو پیدا کرنے میں تزکیۂ نفس ناگزیر ہے۔

سوم، تزکیہ سے قلب میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے، جس کے ثمرات سعادت و فضیلت، خود آگاہی و خدا آگاہی، توازنِ شخصیت و صالحیت اور آرزوئے حُسن و حیات کا احیاء ہے۔

چہارم، اس سے جمالیاتی حِس زندہ و حرکی اور جمالیاتی ذوق میں لطافت و وسعت پیدا ہوتی ہے۔

الغرض، جس طرح طبابت حذاقت کے بغیر اور شاعری موزونیٔ طبع کے بغیر بیکار ہے، اُسی طرح تزکیہ کے بغیر نہ تو علم نافع اور نہ حکمت خیرِ کثیر ہی ثابت ہوتی ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تزکیہ سے مراد محض نظری اخلاقی تعلیم نہیں، بلکہ حِسّی۔قلبی۔نفسی قوتوں کے مطالعہ و تحقیق اور ان سے احسن طریق سے کام لینے کی نظری۔عملی تعلیم ہے۔ اس کی مثال سائنس یا طبیعیات کی ہے جس میں نظری تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے، اس لیے کہ مشاہدہ، تجربہ اور عمل کے بغیر نہ تو نظری تعلیم کی تکمیل اور نہ وہ سود مند ہی ہو سکتی ہے۔ بہر حال، قرآنِ مجید نے حصولِ علم کے تین بڑے موضوعی ذرائع بتائے ہیں: سمع، بصر اور قلب۔ لہٰذا طلبا کو سمعی، بصری اور قلبی قوتوں سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانا بھی کافی نہ ہوگا، جب تک کہ انھیں زمانے کی مقتضیات کے مطابق ان قوتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا فن نہ سکھایا جائے گا، اور اس مقصد کے لیے جدید ترین قسم کی تجربہ گاہوں کا انتظام نہ کیا جائے گا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو قوم فنِ سمع سے ناآشنا اور ذوقِ سمع سے محروم ہوتی ہے وہ بہری اور گونگی ہوتی ہے، لہٰذا وہ حُسن و حق کی بات سُن سکتی، نہ کہہ ہی سکتی ہے۔ ایسی ہی قوم اور افراد کو قرآنِ حکیم حیوان اور اسفل سافلین سے تعبیر کرتا اور ان کا انجام ذلّت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی بتاتا ہے۔

اسی طرح جو افراد یا اقوام فنِ دید سے ناآشنا اور ذوقِ نظر سے محروم ہوتی ہیں، وہ آیاتِ الٰہیہ کو دیکھ نہیں سکتیں اور قرآنِ حکیم کی نظر میں اندھی ہیں، لہٰذا وہ حُسن و قبح، خیر و شر، سود و زیاں اور کامیابی و ناکامی میں امتیاز نہیں کر سکتیں اور ذلّت و مسکنت کی وادیوں میں ٹھوکریں کھانا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ سمع و بصر یا سننے اور دیکھنے کا فن انفرادی و اجتماعی زندگی میں از بس اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا اسے سکھانے کا انتظام چھوٹے بڑے جملہ تعلیمی اداروں میں ہونا چاہیے اور احسن و اکمل اور ارتقائی ہونا چاہیے۔

اب رہا مسئلۂ قلب، جس سے مراد دل و دماغ کا نظام ہے، یہ نفسیات و عملی نفسیات کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر جماعت کے طلباء کی ذہنی استعداد کے مطابق قرآنِ حکیم اور احادیثِ طیبہ کی روشنی میں اس مضمون کے نظری، عملی نصاب تیار کیے جائیں اور ان کے لیے عملی نفسیات کے مشاہدہ و تجربے کا مقتضیاتِ وقت کے مطابق انتظام و انصرام کرنا لازمی ہے۔ یہ انتظام سائنٹیفک بنیادوں پر ہونا چاہیے؛ نیز تحقیق و تفتیش اور مشاہدہ و تجربے کو کماحقہٗ اہمیت دینا ناگزیر ہے۔

۲۔ تعلیم الکتاب

تعلیم الکتاب سے مراد اصل کے اعتبار سے قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے۔ ایک طرف ہمارا دعوٰی ہے کہ قرآنِ حکیم رہنمائے دین ہے اور دین کُل زندگی پر حاوی ہے۔ کُل زندگی سے مراد انفرادی و اجتماعی، دُنیوی و اُخروی اور مادّی و روحانی زندگی ہے؛ نیز یہ مکمّل ضابطۂ حیات ہے اور دوسری جانب ہمارے ہاں "دینی" مدارس، "دینی" علوم اور علمائے "دین" ایسی ثنویت آمیز اصطلاحات مروّج ہیں۔ یہ اصطلاحات ملوکیت کی سرپرستی میں آزریت کے تسمیہ بالباطل سے معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت "دینی" مدارس ہیں، جن پر قرآن، سائنس و ٹیکنالوجی سمیت جملہ علومِ جدیدہ کے دروازے بند ہیں۔ ہمارے ظُلم و جَہل اور کفرانِ نعمت کی اِنتہا یہ ہے کہ ہم نے ان "دینی" مدارس میں "قلم" کو شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے، اور یہ اس جرمِ ملّی کی سزا ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ ذلّت و مسکنت، پس ماندگی و درماندگی، خوف و حزن اور محکومی و غلامی کے عذاب میں مبتلا ہے؛ نیز حرمین شریفین سمیت، ہمارے جُملہ مقدس مقامات اور امصار و ممالک اغیار کے ایٹمی میزائلوں اور بموں کی زد میں اور ان کے رحم و کرم پر ہیں۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ملوکیت نے فرعونی کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ اُس نے رعایا کو ربّ کریم کی

دو عظیم و بے مثال نعمتوں "علم بالقرآن" اور "علم بالقلم" سے محروم رکھنے کی خاطر آزریت یا علمائے سُوء کو پیدا کیا اور ان کے ذریعے مُعلّمِ انسانیت حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مکتبِ قرآنی کی جگہ "بے قلم و قرآن" مدرسے کی طرحِ نو ڈالی اور مسلمانوں کو جمایاتی فریب دینے کے لیے اس کا نام "دینی مدرسہ" رکھا۔ ملوکیت نے ہر جگہ اس "بے قلم و قرآن" مدرسے کی سرپرستی کی اور کسی فرد یا جماعت کو قرآنی مدرسہ یعنی ایسا مدرسہ جس کے نصاب میں اللہ تعالیٰ کی حُکم کردہ "تعلیم بالقرآن" اور "تعلیم بالقلم" شامل ہو، قائم کرنے کی اجازت نہ دی۔ جیسا کہ آمرانہ ملوکیت یا فرعونیت کا شیوہ ہے، اس نے ہامانی تشہیر اور آزری تسمیہ بالباطل کے ذریعے اُمّتِ مُسلمہ کو قرآنِ حکیم کے نظام و نصابِ تعلیم سے بیگانہ کر دیا اور اس پر علومِ جدیدہ اور ٹیکنالوجی کے دروازے بند کر دیئے۔

ملوکیت اس رازِ حقیقت سے آشنا تھی اور ہے کہ قرآنِ مجید سے آگاہ قوم فرعونی ملوکیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ احکامِ قرآن کے بجائے غیر اللہ کے احکام ہی تسلیم کر سکتی ہے؛ نیز اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان رکھنے والے غیر اللہ کی حاکمیت تسلیم نہیں کر سکتے۔ علاوہ بریں، اسلامی ملک کا حکمران خلیفہ ہوتا ہے، فرعون نہیں ہوتا، اور اس میں ہامانی، قارونی اور آزری طبقے نہیں ہوتے، جو نوعِ انسانی کے سرطان ہیں، نیز اس میں حکم صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے اور متنازع امور میں "حَکَم" قرآنِ مجید ہوتا ہے جو الفرقان و قولِ فصیل اور نور و ہدایت ہے، لہٰذا ملوکیت نے عیاری و چابکدستی سے دین یا ترقی کے نام پر مسلم ممالک میں قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم قائم کرنے، نہ اس میں نصابِ قرآن رائج ہی کرنے دیا۔ اس کے نتیجے میں علماء سمیت عام مسلمان قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم و نصاب یکسر بھول گئے اور اس سے ناآشنا ہو گئے۔

حکمران میں مطلق العنانی یا ملوکیت کی طلب و جستجو پیدا ہو جائے تو ہیئتِ اجتماعیہ کے اہل و موزوں نمائندوں کی جگہ وہ اپنی مرضی کے ہامانوں کو اپنے مُشیر بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہامانیت کے بغیر مطلق العنان ملوکیت یا فرعونیت قائم نہیں رہ سکتی۔ فرعونیت کی دو بنیادیں اور ہیں، اور وہ ہیں قارونیت اور آزریت۔ قارونیت ایسا نظامِ سرمایہ داری ہے، جس کی بنیاد ظلم و استحصال، اکتناز و

اِحتکار، سود و تکاثر اور بخل و حرام خوری پر قائم ہوتی ہے۔ ایسا نظامِ سرمایہ کاری چلانے کے لیے اِنفاق بالعفو اور عدل و احسان کے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ناگزیر ہو جاتی ہے؛ لہٰذا اوامر و نواہی کی خلاف ورزی کا جواز فراہم کرنے کی خاطر قارون و فرعون اور ہامان سب کو آزریت کی حاجت ہوتی ہے تاکہ وہ تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے ان کے اعمال کو رعایا کی نظر میں جائز اور مزین کر کے دکھائے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قرآنِ حکیم کے نظامِ تعلیم کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں "دینی" و دُنیوی مدارس کی تفریق اور تعلیم کی ثنویت کو طوعاً و کرہاً ختم اور قرآنِ حکیم کا نصابِ تعلیم رائج کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے سرطانی طبقے اپنی بقا اور مفادات کی خاطر اسلام کے نام پر ایسا نہیں کرنے دیں گے، اور سادہ دل مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایسی ہر کوشش کی مزاحمت اور اسے ناکام بنانے کی مقدور بھر کوشش کریں گے، لہٰذا خلیفہ، اس کی حکومت اور صالح و متقی اور مجاہد مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ایسی کوشش کرنے والے سرطانی طبقات کا قلع قمع کر دیں اور اسلام کا نظامِ تعلیم قائم کریں، اس لیے کہ انقلابی اقدام اُمّتِ مسلمہ کی قوت و سطوت، ترقی و خوشحالی امن و سلامتی اور آزادی و وقار کے لیے لابدی ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم ایک شجرِ طیبہ ہے، جس کی فروع بے شمار ہیں اور اللہ جلّ شانہٗ کی تخلیقی نمو کے ساتھ پیدا ہوتی اور برگ و بار لاتی رہتی ہیں۔ ان تازہ اور نو بنو فروع میں جدید سائنس و ٹیکنالوجی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قرآنِ حکیم علم کا سرچشمہ ہے۔ علم اگر شجرِ طیبہ ہے تو قرآنِ حکیم اس کی اصل ہے، لہٰذا تعلیم الکتاب کا مطلب علم کا پڑھانا اور سکھانا ہے، اور علم میں دین و دُنیا، قدیم و جدید اور نظری و عملی کی تفریق، جو آفریدۂ آزریت ہے، باطل و حرام ہے۔ ٹیکنالوجی بھی علم ہی کی ایک نامیاتی فرع ہے، جس میں نشوو ارتقاٗ کے لامحدود امکانات مضمر ہیں۔

جہاں تک ہمارے سیکولر نظامِ تعلیم کا تعلق ہے، یہ ہمیں انگریزوں کے محکوم و غلام اباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے، لیکن یہ ہماری غلامانہ ذہنیت اور کفرانِ نعمت کی سزا ہے کہ آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ

ملنے کے باوجود ہم اسے عزیز ترین متاعِ حیات سمجھتے ہیں اور اس میں قرآنِ حکیم کا نصاب رائج کرنے سے اس طرح ترساں وگریزاں ہیں، جیسے (حاکم بدہن) اس میں ہمارے لیے زندگی نہیں، موت ہے، شفا نہیں ہلاکت ہے، نور نہیں ظلمت ہے، حُسن وحسنہ نہیں، قُبح وسیئہ ہے، ہدایت وکامیابی نہیں، ضلالت وناکامی ہے اور امن وطمانیت نہیں خوف وحزن ہے۔ بہرحال، یہ اصل ہمیشہ اربابِ اقتدار، اہلِ علم ونظر اور خاص کر مؤلفینِ نصاب کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ قرآنِ حکیم کے بغیر کوئی "مسلمان" اسلام پر زندہ رہ سکتا نہ مر سکتا ہے؛ نیز قرآن مجید سے مجبوری ودُوری مسلمان کے لیے پیامِ موت اور اس کی ذلّت و مسکنت، پس ماندگی وضلالت اور محرومی ونامرادی کی وجہِ حقیقی ہے۔

ہمیں کسی صورت میں بھی اس اصل سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ علم وحکمت کسی زبان میں ہو اور جہاں سے ملے، اس کی تحصیل اپنے شجرِ علم کے نشو وارتقاء کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے کہ اس سے اس کا تغذیہ ہوتا ہے۔ علم کے نو بنو اور تازہ بتازہ افکار ونظریات اور ایجادات واکتشافات سے علم کا چشمہ جاری وساری رہتا ہے، ورنہ وہ بند پانی کا جوہڑ بن جاتا ہے، جس میں فساد وتعفّن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال ہمارے موجودہ علم کی ہے۔ بہرکیف، اہلِ علم ونظر پر لازم ہے کہ ہر درجہ نصاب کی کتابیں ایک تو قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم کے مطابق تیار کریں؛ دوسرے ان کا مواد حسین وطیّب، ایمان افزا وبصیرت افروز اور فکر انگیز ونور افزا ہو، جس کا احسن واکمل نمونہ خود قرآن مجید ہے۔ کتبِ نصاب کی غایتِ حقیقی طلباء کے دلوں میں علم وحکمت، جمال وجلال اور حیات وارتقاء کی آرزو کو زندہ وحرکی کرنا اور ان کے نورِ قلب کا اہتمام کرنا ہے۔

یہ اصل ہمارے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ علم وحکمت کسی زبان میں اور کہیں ہو، اس کی تحصیل اپنے شجرِ علم کے نشو وارتقاء کے لیے ناگزیر ہے، اس لیے کہ اس سے اس کا تغذیہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، علم کے چشمے کو جاری وساری رکھنے کے لیے جدتِ افکار، ندرتِ نظریات اور حُسنِ اجتہاد کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بغیر علم کا چشمہ بند پانی کا تنگ ومتعفّن جوہڑ بن جاتا ہے۔ ایسا علم قوم کے لیے مادّی ونفسیاتی لحاظ سے مضرت رساں ہوتا ہے اور اس کی مادّی ترقی اور

جمالیاتی اِرتقاء میں جمود و تعطّل پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت یہ صورتِ حال اُمّتِ مسلمہ کے چشمۂ علم کی ہے اور اس کے ذمے دار معاشرتی سرطان بالخصوص آزر ہیں۔ جہاں تک آزروں کا تعلق ہے ان کے مذہب میں جدّتِ فکر و نظر، ندرتِ افکار و نظریات، علمِ نو، خاص کر سائنس اور ٹیکنالوجی حرام ہیں اور اجتہاد و قلم شجرِ ممنوعہ ہیں۔ اس سے تین نتائج مستنبط ہوتے ہیں: اوّلاً، ہمارے علم کی یہ صورتِ حال بے حد تشویشناک و خطرناک اور ہماری ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ ثانیاً، یہ ہماری قومی و ملّی پس ماندگی و ضعیفی، ذلّت و مسکنت اور محتاجی و دست نگری کا بنیادی سبب ہے، جس کا مداوا بلا تاخیر ہونا چاہیے؛ اور ثالثاً انقلاب بالقرآن کے ذریعے ہونا چاہیے۔ انقلاب بالقرآن سے مراد یہ ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں دین و دُنیا کی ثنویت کو ختم کر کے اس میں وحدت پیدا کی جائے، اس کی تاسیس قرآنِ حکیم پہ کی جائے اور اس میں قرآنِ حکیم کا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے اور سائنس و ٹیکنالوجی کو خاص طور سے لازمی مضامین قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں، علم و حکمت کی اشاعت، ادب و فن کے فروغ اور جہالت و ناخواندگی کا قلع قمع کرنے کی خاطر مردوں، عورتوں اور بچوں میں کتب بینی کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے اور ان کے لیے شہر شہر اور گاؤں گاؤں مقیم و گشتی کُتب خانے قائم کیے جائیں۔ مصنفین و محققین کے لیے جدید ترین سہولتیں مہیا کی جائیں اور ان کی کفالتِ کُلّی کا معقول بندوبست کیا جائے تاکہ وہ طمانیتِ قلب کے ساتھ بطریقِ احسن اپنا کام کر سکیں اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر سکیں۔

اس ضمن میں اس بات پر زور دینا بجا نہ ہوگا کہ اہلِ علم و قلم پر لازم ہے کہ ہر درجے کی کتبِ نصاب ایک تو قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم کے مطابق تیار کریں؛ دوسرے ان کا مواد حسین و طیب، ایمان افزا و بصیرت افروز اور فکر انگیز و نور افزا ہو۔ بالفاظِ دیگر، وہ مادّی و جمالیاتی اِرتقاء کے لیے مفید ہو۔ ایسے ہی علم کو معلّمِ اِنسانیت و پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "علمِ نافع" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس قسم کی نصابی تعلیم تالیف و تصنیف کرنے کے لیے اہلِ علم و قلم کا آزاد و مطمئن اور معاشرتی سرطانوں کے اثر و نفوذ، جبر و اکراہ اور خوف و طمع سے آزاد ہونا ناگزیر ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ تعلیم کے مقاصد مفصّلۂ ذیل ہیں: اوّل، تزکیہ۔ اس کا مطلب دل و دماغ کی

تطہیر و تنویر کرنا ہے تاکہ چشمِ قلب بینا ہو جائے اور اس کے نور کی تکمیل ہو جائے، نیز انسان میں قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ امکانی استعدادیں قوت سے فعل میں آ کر نشو و ارتقاء کرنے لگیں، اور اس کے نتیجے میں وہ مردِ کامل، مثالی انسان، صاحبِ حُسن و سرور یا قرآن حکیم کی زبان میں صدّیق، شہید اور صالح بن جائے۔ دوم، طلباء میں علم و حکمت کی قوت و توانائی اور صلاحیت پیدا کر کے انھیں "اہلِ سلطان" بنانا ہے تاکہ وہ کائنات کی تسخیر کرنے کے قابل بن سکیں۔ سوم، ان میں حُسن و زندگی، دُنیوی و اُخروی حسنہ اور مادّی و جمالیاتی ارتقاء کی آرزو کو زندہ و فعّال کرنا اور اس کی تکمیل کی قابلیت پیدا کرنا ہے۔ چہارم، انھیں حقیقی تلامیذ القرآن بنانا ہے۔ پنجم، انھیں خود شناس و خدا شناس بنانا ہے تاکہ باہمی رشتے کی معرفت سے ان میں محبتِ الٰہی کی شمع فروزاں ہو جائے اور اس کی لو تیز سے تیز تر ہوتی جائے۔ ششم ان میں اسلام کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کا فہم و ادراک پیدا کرنا، نیز انھیں ان عقائد کو اپنے اندر جذب کر کے ان کے مطابق زندگی کرنے کے قابل بنانا ہے۔

الغرض، قرآنِ حکیم کی رُو سے تعلیم کی غایت الغایات طلباء کو اولوا الالباب، عباد الرحمٰن، نفوسِ مطمئنہ، اولیاء اللہ اور انعام یافتہ بندے بنانا ہے، جن کو قرآن مجید صدّیقین، شہداء، اور صالحین سے تعبیر کرتا ہے۔

۴۔ تعلیم الحکمت

حکمت کو قرآن حکیم نے کثیر المعانی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ علم کی قوّت و توانائی (= سلطان) اور نور و ہدایت کو احسن طریق سے کام میں لانے اور ان سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کے ملکے سے عبارت ہے۔ علاوہ بریں، اس میں شعور و ہوش، تجربہ و دانش مندی، نظری و عملی عقلِ سلیم اور علمی افادیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں فتنہ و فساد، جدال و قتال اور دیگر معاشرتی برائیوں کو دُور کرنے اور صلح و آشتی، خیر سگالی و رواداری اور امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر قرآن نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے۔ یہ رسول اللہ صلّی اللہ

علیہ وسلم کی سنّتِ حسنہ ہے جو کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے، اور کلامِ الٰہی علم وہدایت کا سرچشمہ ہے، جس کے آبِ حیات میں امراضِ قلب کو شفا دینے اور اس کا تزکیہ و احیاء کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

ربِ کریم کی جمالیاتی۔تخلیقی فعلیت یا کلمۂ کُن کے اعجاز سے زندگی سدا جمالیاتی تغیر میں رہتی ہے۔ اس جمالیاتی تغیرِ مدام سے دُنیا میں نو بنو مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کو حل کرنا اقوامِ عالم کے مادّی و جمالیاتی ارتقاء کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ان مسائل کو بطریقِ احسن حل کرنے کے لیے اجتہاد لازم ہے اور اجتہاد کو حکمت متلزم ہے۔ اس اعتبار سے حکمت و اجتہاد لازم و ملزوم ہوئے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ مجتہد کے لیے عالم و حکیم ہونا لابدی ہے۔ بالفاظِ دیگر علم و حکمت کے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا سزاوار ہے نہ مجاز۔

حکمت انسان کو حسین زندگی بسر کرنے کا چلن سکھاتی ہے۔ حسین زندگی سے مراد خوف و حزن سے منزہ، مطمئن و مطہر اور خوشحال و مسرور زندگی ہے، جس کا جمالیاتی ارتقاء جاری ہو۔ اس سے یہ استنباط کرنا مستبعد نہ ہوگا کہ حکیم شخص صالح، صاحبِ حُسن و سرور اور کامیاب انسان ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی دنیوی و اُخروی "حسنہ" کا حصول اور عذاب النّار سے محفوظ رہنا ہے (البقرہ ۲:۱،۲۰)۔ حسنہ جامع و مانع اصطلاحِ قرآنی ہے اور یہ ہر اُس مادّی و روحانی نعمت پر دلالت کرتی ہے جو انسان کے لیے وجہِ طمانیت و مسرت ہو۔ حسنہ کی ضد اور نقیض سیئہ ہے، جس کا خاصہ قلب میں خوف و حزن کی آگ لگانا ہے، جس کے عذابِ مقیم کی شدت سے خدا کی پناہ۔ حکمت حسنہ کے حصول اور سیئہ کے عذاب النار سے محفوظ و مصؤن رہنے کا ذریعہ ہے۔ اس کی حکمت کی غیر معمولی و بے قیاس اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی توجیہہ بھی ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اسے قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم میں شامل کیا ہے۔ اُمتِ مُسلمہ کی پسماندگی و ضعیفی اور ذلت و مسکنت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کے "دینی" اور سیکولر تعلیمی نظاموں میں "حکمت" کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نہ یہ ان کے نصابوں میں شامل ہے۔ کیا ہمارے تعلیمی نظاموں کی یہ صورتِ حال، جو قرآنِ حکیم کے واضح احکام کی کُھلم کُھلا خلاف ورزی ہے، حسنِ انقلاب کی متقاضی نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر ہمیں اپنے تعلیمی نظاموں کو فوری طور

سے بدلنا، ان میں ثنویت کو دُور کرنا، اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس کی تشکیلِ نو کرنا ہو گی، جس میں تعلیم الحکمت کو لازمی قرار دینا ہو گا۔

۵۔علومِ نو کی تعلیم

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (البقرہ ۲: ۱۵۱؛ اور وہ تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے) یہ حکیمانہ نکتہ مضمر ہے کہ مُعلّمِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم علم و حکمت کی طلب و جستجو رکھنے والوں کو علم و حکمت کی ایسی نئی سے نئی باتیں یا علومِ نو سکھاتے تھے، جن سے وہ بے خبر ہوتے تھے۔ تاریخِ علوم شاہد ہے کہ علم و حکمت کے نئے نکات و اُصول ہی علومِ نو کی اساس بنا کرتے ہیں۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ علم مثلِ شجرِ طیبہ ہے جو سدا برگ و بار لاتا رہتا ہے اور ارتقائے سرمدی اس کا خاصہ ہے، اس لیے کہ اس کا رابطہ ربِ علیم و حکیم کی شان یعنی جمالیاتی۔ تخلیقی فعلیت سے استوار ہے، جس میں وہ ہر آن اپنی نمودِ نو رکھتا ہے؛ اس کے نتیجے میں زندگی کے نئے سے نئے مسائل پیدا ہوتے اور اپنے حل کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ اہلِ علم و نظر کو علم کی طلب و جستجو سدا بے قرار رکھتی ہے؛ لہٰذا وہ زندگی کے مسائلِ نو بنو پر نظر رکھتے اور انھیں حل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں علومِ نو جنم لیتے ہیں، جنھیں دوسروں کو منتقل کرنا تعلیم کے مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے۔

یہاں اس فکر انگیز نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ جو قومیں نو بنو مسائلِ حیات پر نظر رکھتی اور انھیں حل کرتی رہتی ہیں، وہی ترقی کی راہ پر گامزن رہتی اور دیگر اقوام کی قیادت کرتی ہیں۔ بخلاف اس کے جو قومیں ان مسائل سے صرفِ نظر کرتی ہیں وہ پس ماندہ رہ جاتی ہیں اور ان کی پس ماندگی ان کے ضعف و درماندگی، محرومی و نامرادی، ذلت و مسکنت اور محتاجی و دست نگری کا سبب بن جاتی ہے۔ مسلم اقوام کی زبوں حالی و ضعیفی کا بھی یہی بنیادی سبب ہے۔ اس کا علاج "اجتہادِ مدام" ہے، جو مسائلِ حیات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن اُمّتِ مسلمہ کی بدنصیبی یہ ہے کہ ملوکیت کے

جبر و استبداد سے مرعوب اور مراعاتِ خسروانہ کے لالچ میں آکر آزریت نے صدیوں سے اجتہاد کو شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے۔ اجتہاد کے دروازے جو دورِ ملوکیت سے بند ہیں، ان کو کھولنے کا ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے:

حُسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا استیصال

شجرِ علم کا تغذیہ خونِ جگر سے ہوتا ہے اور جب اُسے موزوں غذا ملتی ہے تو اُس کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور وہ برگ و بار لاتا ہے، جنھیں نظریاتِ نو، افکارِ تازہ اور علومِ نو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُسے خونِ جگر پانچ قسم کی جمالیاتی تخلیقی فعلیتوں کے ذریعے دینا پڑتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) سمع (۲) بصر (۳) تفکر (۴) تحقیق اور (۵) تجربہ۔ یہ فعلیتیں دراصل ایک ہی سلسلے کی ہی پانچ کڑیاں ہیں جو (ا) آرزوئے حسنِ زندگی (ب) طلب و جستجوئے علم و حکمت (ج) محنتِ پیہم و صبرِ جمیل (د) اخلاص و حُسنِ نیّت اور (ہ) تدبرِ پیہم و مدام کو چاہتی ہیں۔ اب ان جمالیاتی تخلیقی فعلیتوں کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ سمع سے مراد سمع بالحق ہے، یعنی استفادہ و تفکّر کی خاطر دل و دماغ کو تعصب و نفرت سے پاک و صاف کر کے گوشِ حق نیوش کے ساتھ علم و حکمت اور حسن و حق کی باتیں سُننا۔

۲۔ بصر کا مطلب مشاہدہ و مطالعہ بالحق ہے، جو دیدۂ عبرت نگاہ اور حکیمانہ انداز سے کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود بھی علم و حکمت اور عبرت کا حصول ہے۔

۳۔ تفکّر سے مراد جمالیاتی تخلیقی تدبرِ پیہم و مدام ہے۔ اس کا آغاز تجسس و طلبِ حق اور انجام ادراکِ حقیقت ہوتا ہے۔

۴۔ تحقیق کا مقصد تلاشِ حق ہے۔ یہ بھی اخلاص و حُسنِ نیّت چاہتی ہے۔ اس کا آغاز تشکیک اور انجام تحقق ہوتا ہے۔

۵۔ تجربہ: اس کا آغاز مشق و مزاولت اور انجام اِتمام و کمال اور ایجاد و اختراع چاہتا ہے۔

اگر سائنس و ٹیکنالوجی سمیت علوم و فنون میں مغربی اقوام کی حیرت انگیز ترقی کے عوامل و محرکات میں سے ایک علومِ نو کی طلب و جستجو ہے تو پاکستان سمیت جملہ مسلم اقوام کی پس ماندگی و درماندگی کا

ایک بنیادی سبب علومِ نو کی آرزو کا فقدان ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ اگر ہم اپنی بقا و سلامتی اور آزادی و خوشحالی کی آرزو رکھتے ہیں تو ہمیں ایک تو طلباء میں علومِ نو کی طلب و جستجو پیدا کرنا ہوگی، اور دوسرے انھیں مطالعہ و مشاہدہ اور تحقیق و تجربہ کے لیے جدید ترین قسم کی تجربہ گاہیں، کتب خانے اور لٹریچر، نیز ضروری سہولتیں فراہم کرنا ہوں گی۔ چونکہ تحقیق و تجربے کا کام قلب و جان کو اس کی نذر کیے بغیر نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسے اہلِ شوق و تجسس کی طمانیتِ قلب و فارغ البالی کا اہتمام کرنا حکومت کے فرائضِ منصبی میں سے ہے۔

اب ہم ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں جو شروع میں اٹھائے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے "دینی" مدارس کا نصابِ تعلیم وہی ہے جو قرآن مجید نے متعین کیا ہے اور جس کی نشاندہی اوپر کر دی گئی ہے؟ نیز جس کی تعلیم دینے کے لیے مُعلّمِ نوعِ انسانی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اور جس کی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دعا کی تھی؟ اس کا صاف سیدھا اور سچا جواب جو انتہائی تلخ اور عبرت انگیز ہے، نفی میں ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ ہمارے "دینی" مدارس میں قرآن مجید کے نصاب کا کوئی ایک مضمون بھی صحیح معنوں میں پڑھایا نہیں جاتا۔ اکثر مضامین سے تو یہ "مدرسہ" آشنا تک نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مدرسۂ نظامیہ میں قرآنِ مجید کے صرف اڑھائی پاروں کو پڑھایا جاتا ہے اور وہ بھی عقل و فکر کی مدد سے نہیں بلکہ کسی تفسیر کی کورانہ تقلید کے ذریعے۔ وجہ یہ ہے کہ "مدرسے" میں عقل و فکر شجرِ ممنوعہ ہے؛ حالانکہ قرآنِ حکیم عقل و فکر سے کام لینے کی ازبس تاکید کرتا ہے اور تاریخ کے حوالے سے ہمیں تنبیہ کرتا ہے کہ جو قوم اپنے حواس اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتی وہ ہلاک و برباد ہو جاتی ہے، اور اس کا آخری ٹھکانہ دوزخ ہوتا ہے؟ قرآنِ حکیم نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ عباد الرّحمٰن یعنی ربِ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو آیاتِ الٰہی اور قرآنِ حکیم پر غور و فکر کرتے[1] اور عقل سے کام لیتے ہیں اور جب ان پر آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر ٹوٹ نہیں پڑتے، بلکہ ان پر تدبّر کرتے ہیں[2]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قبولِ حق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے، لیکن "دینی" "مدرسے میں" "سوچنا" گناہ ہے۔ علاوہ بریں، قرآنِ حکیم کے نزدیک آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرنا اور اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے اور پہلو بدلتے تدبّر کرنا اربابِ عقلِ سلیم کا شیوۂ حیات

ہے۔[۱۲] عقل چونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے، لہٰذا جو افراد یا اقوام اس سے کام نہیں لیتیں، محض کورانہ تقلید پر گزارہ کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو نجاست میں غرق کر دیتا ہے۔[۱۳] دوسرے لفظوں میں وہ کفرانِ نعمت کی پاداش میں مسلوب العقل ہو کر نجاست خور چوپاؤں کی طرح ہو جاتی ہیں۔[۱۴]

اصل یہ ہے جو قومیں حواس اور عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہیں اور اپنے اوپر اجتہاد کے دروازے بند کر لیتی ہیں تو اس کے نتیجے میں اُن پر علم و حکمت اور سائنس و ٹیکنالوجی سمیت علوم نو کے دروازے مسدود ہو جاتے ہیں اور ان کے چشمۂ علم میں افکارِ تازہ اور علومِ نو کا آبِ حیوان آنا بند ہو جاتا ہے، لہٰذا اس میں فساد و تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ حکیمانہ فکر انگیز و بصیرت افروز ہے کہ آبِ رواں حلال ہے"،[۱۵] اور سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ آبِ رواں صحت بخش اور بند پانی مضرِ صحت ہوتا ہے، اس لیے کہ پانی اپنی روانی سے آبحیات بنتا ہے۔ بخلاف اس کے بند پانی اپنے فقدانِ روانی کے سبب متعفن اور صحت کے لیے مضرت رساں ہوتا ہے؛ بعینہٖ ہمارے چشمۂ علم کی صورتِ حال ہے۔

ہمارے "دینی" مدرسے کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کے مندرجۂ ذیل ذرائع اور ثمرات "شجرِ ممنوعہ" ہیں: سمع و بصر، عقل و فکر، قلم و مداد، تحقیق و تجربہ، سائنس و ٹیکنالوجی، علومِ نو و افکارِ تازہ اور کتب و جرائد و رسائل۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا استعمال اساتذہ کرتے ہیں نہ طلبا ہی کو ان کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ جو طلبا ان "بے قرآن و قلم" مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہ مسلوب النعم ہو کر نکلتے ہیں اور پھر یہی فارغ التحصیل طلبا، قلم ناآشنا مدارس اور مسلوب النعم تلامذہ کے اساتذہ اور اندھے بہرے اور مسلوب العقل متبعین کے پیشوا و خطیب اور پیر و شیخ بنتے ہیں۔ یہاں اس بصیرت افروز و فکر انگیز نکتے پر زور دینا تحصیلِ حاصل ہوگا کہ جو قوم ربِ ذوالجلال والاکرام کی کسی نعمت یا نعمتوں کی قدر نہیں کرتی، یعنی ان کا استعمال نہیں کرتی تو قدرت ان نعمتوں کو سلب کر لیتی ہے۔ یہ اس کا قانونِ کفرانِ نعمت ہے۔[۱۶] اُمتِ مسلمہ کا یہ حشر دَورِ ملوکیت سے ہو رہا ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے حواس مسدود و معطل ہو جائیں اور قلب پر مہر لگ جائے یا بالفاظِ دیگر، کفرانِ نعمت کی پاداش میں

حسّی وقلبی قوتیں جو انسان کی امتیازی خصوصیات ہیں، مسلوب ہو جائیں تو آدمی خلقی طور سے تو بشر رہتا ہے، لیکن خُلقی لحاظ سے انسان نہیں رہتا۔ اس پر سُکرانِ جہل کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اِلٰہ ورب کے ساتھ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے؛ نیز اُسے اپنے سود وزیاں کا احساس وشعور نہیں رہتا۔ ایسے ہی لوگوں کو قرآن مجید نے "اسفل سافلین" سے تعبیر کیا ہے۔[۱۱۸]

اس عبرت ناک صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ ودرماندہ اور ذلیل وخوار ہیں، اور ترقی یافتہ اقوام کے دست نگر اور مقلّد ہیں، نیز اپنی بقا وسلامتی کے لیے اس طرح ان کے رحم وکرم پر ہیں، جیسے بھیڑوں کے ریوڑ بھیڑیوں کے نرغے میں ہوں۔ ہماری اس زبوں حالی کی ذمے داری "بے قرآن وقلم" مدرسے پر عائد ہوتی ہے، جس کے اربابِ حلّ وعقد اُمّتِ مُسلمہ کو فرقوں میں تقسیم کر کے اور مذہبی رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑ کر سادہ دل مسلمانوں کا اس طرح استحصال کر رہے ہیں، جس طرح سود خور قارونی۔ سرطانی طبقے مزارعوں اور محنت کشوں کا استحصال کرتے اور ان کی عرق ریزی وخون فشانی کے حاصل سے اپنی نشوونما کرتے ہیں۔ جس طرح قارون یعنی جاگیردار، بڑے بڑے زمیندار، سردار اور صنعت کار اپنے مزارعین اور محنت کشوں کو اَن پڑھ، جاہل اور مسلوب العقل رکھنے کی خاطر اپنی جاگیروں اور علاقوں میں سکولوں اور کالجوں کا قیام برداشت نہیں کرتے، اسی طرح مسلوب النعم علمائے "دین" اپنے مدارس میں عقل وفکر، لوح وقلم، علم وہنر، سائنس وٹیکنالوجی اور علومِ جدیدہ یا نصابِ قرآن کو داخل کرنا گوارا نہیں کرتے۔

مسلوب النعم اکثریت کی اور بات ہے جو جانتی تو ہے پر مانتی نہیں، ورنہ کون نہیں جانتا اور مانتا کہ یہ پتھر اور دھات کا زمانہ نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دَور ہے، جس میں انسان برق نمط رفتار سے ترقی اور زمان ومکان کی تسخیر کر رہا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ سائنس ٹیکنالوجی میں ترقی کیے بغیر کوئی قوم اپنی جغرافیائی وثقافتی سرحدوں کا تحفظ نہیں کر سکتی اور نہ ترقی ہی کر سکتی ہے، نیز نہ وہ ذلّت ومسکنت کی دلدل ہی سے نکل سکتی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا کیوں اپنے "بے قرآن وقلم" مدارس میں سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا اہتمام نہیں

کرتے؟ کیوں انھیں ان کی غیر معمولی اہمیت وافادیت کا شعور نہیں؟ کیا انھیں معلّمِ نوعِ انسانی کی اس دُعا کا علم نہیں کہ "بارِ الٰہا! مجھے علمِ نافع عطا فرما"؟ کیا سائنس علمِ نافع نہیں؟ کیا انھیں قرآنِ مجید کی اس اہم ترین دُعا کے مفہوم سے آگاہی نہیں کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ ۲: ۲۰۱؛ اے ہمارے پروردگار وآقا! ہمیں دُنیا میں بھی حسنہ عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنہ عطا فرمانا اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیو!)۔ کیا وہ اس رمزِ قرآنی سے آشنا نہیں کہ کیوں ربِ علیم وحکیم نے اس دُعا میں دُنیوی حسنہ کو اُخروی حسنہ پر مقدم رکھا ہے؟ اصل یہ ہے کہ علمائے سوء آزری۔ سرطانی طبقہ ہے جو اس وقت تک لوگوں کا استحصال کرسکتا ہے جب تک وہ اَن پڑھ جاہل اور مسلوب النعم ہوں اور ان کی کورانہ تقلید میں اپنی نجات سمجھتے ہوں۔ ایسا سمجھنا قرآنِ مجید کے نزدیک عالموں اور راہبوں یعنی پیران ومشائخ کو اپنا رب بنانا ہے[18]۔ اس سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیوں آزری طبقہ سائنس وٹیکنالوجی سمیت نصابِ قرآن کو اپنے "بے قرآن وقلم" مدرسے میں داخل نہیں کرتا، بلکہ داخل کرنے سے لرزاں وترساں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قوم سے جہالت گئی تو اس کی آنکھ کھلتے ہی طلسمِ آزری پاش پاش ہوجائے گا۔

اب اس اہم سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ کیوں دَورِ ملوکیت میں "دینی" مدارس میں قرآنِ حکیم کے نصابِ تعلیم کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا نصابِ تعلیم داخل اور رائج کیا گیا؟ نیز اس کے ذمے دار کون تھے اور اس سے ان کی غرض وغایت کیا تھی؟ غور کریں تو اسی سوال میں جواب مضمر ہے لیکن اسے وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت پر ملوکیت کا زنگ چڑھنا شروع ہوا تو آمرانہ ملوکیت (جس کی انتہائی صورت عبارت ہے فرعونیت سے)، کے بطن سے مضر ترین معاشرتی سرطانوں کا ظہور ہوا، جنھیں اصطلاحِ قرآنی میں ہامان، قارون اور آزر کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید، کتبِ احادیث اور تاریخ شاہد ہیں کہ عہدِ رسالت مآب ﷺ اور دَورِ خلافتِ راشدہ میں ملائیت یا آزریت تھی نہ ہامانیت و قارونیت اس لیے کہ خلافت یا حکومتِ الٰہیہ کا اوّلین فرضِ منصبی اللہ تعالیٰ کے تخلیقی شاہکاروں

اور اس کے بندوں کو خون آشام معاشرتی سرطانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانا اور معاشرے کو ان کے وجود سے پاک و صاف رکھنا تھا تاکہ وہ صالح رہے اور فطری انداز میں نشوونما پاتا اور ارتقا کرتا رہے۔ بخلاف اس کے آمرانہ ملوکیت کا اوّلین مقصد اپنی صیانت و مداومت ہوتا ہے۔ مطلق العنان حکمرانوں یا بادشاہوں کو چونکہ اپنے تخت و تاج یا اس دَور کی اصطلاح میں اپنی کرسی و حکومت کے تحفظ کی فکر دامن گیر رہتی ہے، لہٰذا انھیں ایک تو اپنی مرضی سے کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے ہامانوں کی حاجت ہوتی ہے جو ملوکیت کے مفاد کی خاطر ملک و قوم اور دین و ملّت کی بھی پروا نہ کریں اور حکمرانوں کی مدح سرائی و تشہیر بالباطل کرتے اور ان کی خواہشات و احکام کے مطابق حکمرانی کرتے رہیں، چاہے انھیں رعایا کا استحصال اور اس پر جبر و تشدّد ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ فرعونی حکمرانوں کے ایسے ابن الوقت اور طالع آزما اور خود غرض و مفاد پرست مشیروں، وزیروں، امیروں، منصب داروں، والیوں اور حاکموں وغیرہ وغیرہ کے لیے قرآنِ مجید نے تاریخ کے حوالے سے "ہامان" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

خلافت جب حجرے اور مسجد سے نکل کر قصر و ایوان میں داخل ہوئی تو سادگی و قناعت کی جگہ شان و شوکت اور تکاثر نے لے لی تو اُسے زیادہ سے زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ چونکہ مال و دولت کا حصول استحصال کے بغیر اور استحصال نظامِ سرمایہ داری کے بغیر ممکن نہ تھا، لہٰذا ملوکیت کو اسلام کے معاشی نظام کے بجائے نظامِ سرمایہ داری قائم کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں جاگیرداروں، سرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا استحصالی سرطانی طبقہ پیدا ہو گیا، جس نے دولت کو محجوب و مجہول اور گردشِ دولت کو غیر متوازن اور محدود کر دیا اور سود کاری کی راہ ہموار کر دی، اس طرح اکتناز و احتکار، اسراف و تبذیر اور بخل و تکاثر زمانے کا دستور بن گیا اور تقوے کے بجائے دولت و امارت عزّت و تکریم کا معیار قرار پایا۔ اس سرمایہ دار استحصالی سرطانی طبقے کے لیے قرآنِ حکیم نے "قارون" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

چونکہ فرعونی، ہامانی نظامِ حکومت اور قارونی نظامِ معیشت غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن نظام

تھے، لہٰذا ان کے قیام کا شرعی جواز پیدا کرنے کی خاطر فرعونی ملوکیت نے "آزریت" کو پیدا کیا۔ آزریت عبارت ہے علمائے سوء کے ادارے سے؛ اور پھر اس آزری ادارے کی عامۃ الناس میں اہمیت ومقبولیت اور اثر ونفوذ کے خوف سے اُسے مختلف مذاہب یا فرقوں میں منقسم کر دیا تاکہ وہ آپس میں دست وگریباں رہیں، ایک دوسرے کی تکذیب وتکفیر کرتے رہیں اور متحد نہ ہو سکیں؛ نیز اس کے نتیجے میں عامۃ الناس بھی مختلف فرقوں میں بٹ جائیں اور ان میں تشتت وافتراق پیدا ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں وہ حکومت کے خلاف متحدہ محاذ نہ بنا سکیں۔ ملوکیت آزری فرقوں کے اختلافات کو ہوا دیتی اور ان کی سرپرستی بھی کرتی رہی، حکومت کی امداد و سرپرستی کے عوض آزریت نے اپنی وفاداری اور کارگذاری کے ثبوت کے طور پر تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے اسلام دُشمن فرعونی وہامانی اور قارونی وآزری نظاموں کو جائز قرار دے دیا۔ ساتھ ہی ہامان تشہیر بالباطل کے ذریعے مسلمانوں کو باور کرانے میں ناکام نہ رہے کہ یہ سرطانی نظام نظریۂ ضرورت (جو آزریت کی ایجاد ہے) کے اعتبار سے غیر اسلامی نہیں، بلکہ زندگی کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

زمانہ گزرتا گیا اور امتدادِ وقت کے ساتھ مسلمانوں کے ذہن سے اسلامی حکومت ومعیشت اور ثقافت کا نقشہ مٹتے مٹتے اس طرح محو ہو گیا کہ وہ سرطانی نظاموں ہی کو اسلامی نظام سمجھنے لگے اور اب تک سمجھ رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہی اُمتِ مسلمہ کا سب سے بڑا المیہ اور اس کی ذلت ومسکنت اور پسماندگی وضلالت کا ایک بنیادی سبب ہے۔ تاریخ اس عبرتناک واقعیت کی شاہد ہے کہ جب بھی کسی اللہ کے شیر نے فرعونی نظامِ حکومت کے خلاف آواز اُٹھائی اور اس کی جگہ پیغمبرِ اعظم وآخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نظامِ اسلام کا نعرہ بلند کیا تو آزریت نے فوراً اُس کے خلاف کُفر کے فتوے داغ دیے اور ملوکیت نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے اور دوسروں کو دہشت زدہ کرنے کی خاطر کبھی اُسے دار پر تو کبھی اُس کا سر نیزے پر چڑھایا، کبھی اُسے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا تو کبھی اُسے تیر وتفنگ کا نشانہ بنایا؛ کبھی اُسے زنداں میں مر مر کر جینے کے لیے ڈال دیا تو کبھی اُسے

سنگسار و تہ تیغ کر دیا۔ فرعونی حکومت کی نمایاں نشانی یہ ہے کہ اس میں ہامانی، قارونی اور آزری نظام ہوتے ہیں اور وہ ان نظاموں کے استیصال سے گریزاں و ترساں رہتی ہے، اس لیے کہ ان کے بغیر وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اس کا نظامِ تعلیم مردم گر نہیں مردم کُش ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ غیر فطری یا غیر قرآنی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نصابِ تعلیم ایسا نہیں ہوتا جو طلباء میں تقویٰ یا آرزوئے حسن و حیات کا احیاء و ارتقاء کرے، ان کی خداداد استعدادوں کو قوت سے فعل میں لائے، ان کا تزکیۂ قلب اور نور کا اہتمام کرے، یعنی ان کا جمالیاتی ارتقا کرے، نیز انھیں حکمت سکھلائے اور ان کے اخلاق کی تحسین و مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرے یا بالفاظِ دیگر، انھیں اولی الالباب، اربابِ ذوق و نظر، اہلِ حسن و سرور یا قرآنِ حکیم کی زبان میں صالحین، شہداء اور صدیقین بنائے۔

ہماری محرومی و شقاوت کی ایک وجہ یہ ہے ہمارے ہاں دو قسم کے نظامِ تعلیم رائج ہیں اور دونوں مردم گر نہیں بلکہ مردم کُش ہیں۔ ان میں سے بے قرآن "دینی" نظامِ تعلیم سے گفتگو ہو چکی ہے، اب بے قرآن سیکولر نظامِ تعلیم سے کلام کیا جاتا ہے۔

ہمارا سیکولر نظامِ تعلیم

سیکولر نظامِ تعلیم ہمارا محبوب ورثۂ غلامی اور برطانوی استعماریت کی یادگار ہے۔ انگریزوں کی سیاسی بصیرت نے مسلمانانِ ہند کو مردہ و خوگرِ غلامی بنانے کی خاطر بے قرآن سیکولر نظامِ تعلیم کی اساس رکھی، لیکن اس نے "بے قلم و بے قرآن دینی" مدرسے یا نظامِ تعلیم سے تعرض نہ کیا۔ انگریز کی اس حکمتِ عملی میں ایک عبرت انگیز و بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریز ایسی دانا و بینا حکمران قوم کی نظرِ جہان بین میں ہمارے "بے قرآن و قلم" دینی نظامِ تعلیم یا مدرسے کی قطعاً کوئی اہمیت و وقعت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے اس اصل کا علم ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم نصابِ قرآنی کے فقدان کے سبب مردہ و کار از رفتہ، نیز اس کے زوال کے عوامل میں سے ہے؛ لہٰذا ایسا "بے قرآن و قلم" اور علومِ جدیدہ سے ناآشنا نظامِ تعلیم اس کی استعماریت کے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ

اس کے سیکولر نظامِ تعلیم کا ممد و معاون ثابت ہوگا۔ چنانچہ مستقبل نے ثابت کر دیا کہ انگریز کی بصیرت نے صحیح فیصلہ دیا تھا۔ یہ ہماری بے بصری و کج اندیشی اور جہل و خود ظلمی ہے کہ ہمیں آزاد ہوئے ساڑھے تین عشرے گزر چکے ہیں، لیکن ہم نے ابھی تک اپنے ان دونوں تعلیمی نظاموں کی اصلاح کی ہے نہ ان کی ثنویت ہی دُور کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ ان میں قرآنِ حکیم کا نصابِ تعلیم ہی رائج کیا ہے؛ حالانکہ اس مدت میں زمانہ ثقافت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اور سائنس و ٹیکنالوجی میں تاریخ ساز و عہد آفرین انقلابات دیکھ چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے یہ دونوں تعلیمی نظام غارت گرِ حُسن و زندگی اور رہزنِ عقل و فکر ہیں؛ نیز یہ ہماری پس ماندگی و درماندگی، محکومی و محتاجی اور مفلوک الحالی و تنگیٔ زیست کے عوامل میں سے ہیں۔

ہمارے سیکولر نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص بھی یہ ہے کہ اس کا نصاب بھی قرآنی نہیں ہے، بلکہ اس کے ہیولے میں کفر و شرک، فسق و فجور اور فحشاء و منکر کی صورتیں مضمر ہیں، جو قلب کے فطری نور کو سلب کر لیتی ہیں اور انسان کو حُسن کور و کور ذوق، بہرا اندھا اور گونگا بنا دیتی ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم کا دوسرا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں علومِ مستعار بصورتِ ناتمام پڑھائے جاتے ہیں۔ تعلیم طیب و کامل اور عقائدِ جلیلہ و محترکہ اور قومی روایات کے مطابق نہ ہو، بلکہ ادھوری اور مقلدانہ ہو تو فارغ التحصیل طلباء کا ذہنی و علمی لحاظ سے نامکمل و ناپختہ رہ جانا فطری امر ہے۔ زمانے کے جدید تقاضوں کے لحاظ سے ہمارے نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا انتہائی ناقص بندوبست ہے۔ ایک تو ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب فرسودہ، نامکمل، ناموزوں اور ازوقت رفتہ (Out of date) ہوتے ہیں اور دوسرے تجربہ گاہیں تحقیق و تجربات کے لیے ناموزوں اور ضروری آلات و سامان سے لیس نہیں ہیں؛ نیز ان میں تحقیق و تجربہ کے لیے ضروری سہولتیں بھی میسر نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ جوہرِ قابل کی سرپرستی بھی نہیں ہوتی کہ وہ فارغ البال ہو کر اطمینانِ قلب سے کام کر سکیں۔ علاوہ بریں، ایجاد و اختراع کی حوصلہ افزائی تو کجا، اسے نصاب میں جگہ تک نہیں دی گئی، جیسے یہ شجرِ ممنوعہ ہو۔ مقتضیاتِ زمانہ کے لحاظ سے یہ ہماری پسماندگی و ذہنی غلامی اور فنی و

علمی احتیاج و دست نگری کا بنیادی سبب ہے، لہٰذا جب تک ہم اسے رفع نہیں کریں گے، ہم سائنس و ٹیکنالوجی میں نہ ترقی اور نہ کوئی ایجاد و اختراع ہی کر سکیں گے، نتیجۃً اِتباعِ اغیار، ذہنی محکومی و مرعوبیت اور پسماندگی و ضعیفی، نیز ذلّت و مسکنت اور احتیاج و دست نگری ہماری قسمت کا لکھا بنا رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اقوامِ مغرب نے سائنس و ٹیکنالوجی میں قابلِ ستائش و حیرت انگیز ترقی کی ہے اور قیامت خیز قوت و توانائی حاصل کرنے کا راز دریافت کر لیا ہے اور قرآنِ حکیم کے اس دعوے کی عملاً تصدیق کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے لیے مسخّر کر دیا ہے، یعنی تسخیرِ کائنات انسان کے مقدور میں ہے اور کائنات کا مسخر ہونا، اس کا مقدّر ہے؛ نیز انسان علم کی قوّت (= سلطان) کے ذریعے افلاک میں نفوذ کر سکتا ہے[۱۹]، لیکن جہاں تک دیگر خصوصاً عمرانی علوم کا تعلق ہے، ان میں عقل کو عیار و مصلحت کیش اور انسان کو اپنی نفسیاتی خواہشات کا غلام، حسن کور[۲۰] دکور ذوق، سرکش و گمراہ بنانے، نیز اسے خدا و خودی سے بیگانہ اور رہینِ خوف و حزن بنانے کی غایت درجہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بشمول پاکستان مسلم ممالک شرک و الحاد، ظلم و استحصال، فحشاء و منکر، فتنہ و فساد، تشتّت و افتراق، اسراف و تبذیر، بُخل و تکاثر اور تخریبی ہنگاموں کی جولان گاہ ہیں۔

علاوہ بریں، ان میں قحط الرّجال کا یہ حال ہے کہ ہر اہلِ نظر کی صدا لئے حال یہ ہے:

ازدحام ددو ملولم وانسانم آرزو لیست

میرے نزدیک اس انتہائی بھیانک اور عبرت ناک صورتِ حال کا علاج ضربتِ کلیمیؑ و رحمۃٌ للعالمینیؐ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مزید تاخیر کیے بغیر اپنے "بے قرآن دینی" اور سیکولر تعلیمی نظاموں کی جگہ صرف قرآنِ حکیم کا نظامِ تعلیم قائم کریں اور اس میں از ابتدا تا انتہا مفصّلہ بالا قرآنی نصاب رائج کریں؛ نیز ہر جماعت کے طلباء کی ذہنی استعداد کے مطابق اُسے تیّار کریں اور امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اس میں بمقتضائے وقت موزوں تغیر و تبدّل کرتے رہیں۔ علاوہ بریں جُملہ علوم کے نصاب قرآنِ حکیم کے حوالے سے تیّار کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاب میں ایسی باتیں نہ ہوں جو قرآنی تعلیمات کے متناقض و منافی ہوں،

مثلاً اس میں نہ تو کافرانہ، مشرکانہ اور ملحدانہ نظریات ہوں اور نہ فحشاء و منکر، فسق و فجور اور فتنہ و فساد کی باتیں ہوں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسری اقوام کی علمیّت و حکمت، ادب و فن، مشاہدات و تجربات، افکار و نظریات اور سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادہ نہ کریں؛ بلکہ ان سے استفادہ کریں، بالفرور و بالالتزام اور کماحقّہ، کریں اور ان کی مدد سے خود بھی نئے نئے تجربات کرتے رہیں اور تحقیق و تفتیش اور ایجاد و اختراع میں ان پر سبقت لے جانے کی بھرپور سعی و جہد کرتے رہیں۔

علم کے بارے میں یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ربِّ علیم و حکیم نے انسان کو جو علم عطا کیا ہے اس کی حیثیت علمِ الٰہی کے مقابلے میں ایسی ہے جیسی قطرے کی بحرِ بیکراں کے مقابلے میں۔ علاوہ بریں، انسان کا علم ارتقائی ہے اور یہ حقیقت اس کی ناتمامی و نقص کی دلیل ہے۔ پھر بشر منزّہ عن الخطا بھی نہیں، لہٰذا علم انسانی کو ہر حال میں وحی و تنزیلِ آخر کے تابع ہی رہنا چاہیے اور اس کی روشنی ہی میں اُسے اپنا نشو و ارتقاء کرنا چاہیے۔ وحی و تنزیلِ آخر یا قرآنِ مجید کی شرط لگنے میں یہ اصل مضمر ہے کہ کتبِ سماوی میں سے صرف یہی کتاب اس وقت تحریفِ لفظی و معنوی سے محفوظ و مصئون ہے اور اس کی حفاظت و صیانت کی ذمے داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔[۲۱]

آخر میں علم و حکمت کی تعلیم و تعلّم کے سلسلے میں یہ اصل الاصول ہمیشہ اربابِ اختیار (= اولی الامر) کے پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اظہارِ ابلاغ کی آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اُسے بالضرور ملنا چاہیے؛ نیز یہ آزادی علم و حکمت کے نشو و ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ علاوہ ازیں، تخلیقی فکر کا خاصّہ ہی نو بنو افکار و نظریات کی تخلیق ہے جن سے گلستانِ علم و حکمت اور چمنِ ادب و فن کی آراستگی و تزئین ہوتی ہے۔ زباں بندی فرعونی و ہامانی اور آزری و قارونی سرطانوں کا شیوہ ہے، لہٰذا جس معاشرے میں اظہار و ابلاغ کی مکمل آزادی نہ ہو، وہ یقیناً سرطان زدہ و محکوم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ زباں بندی علامت ہے سرطانی معاشرے کی۔ یہ کتنی عبرت ناک حقیقت ہے کہ قریب قریب سب مسلم ممالک سرطان زدہ ہیں اور زباں بندی سب کا دستور ہے۔ چونکہ زباں بندی و سرطان زدگی لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا سرطانی طبقوں کا قلع قمع کیے بغیر مظلوم انسان کا آزادیِ اظہار و ابلاغ سے محروم رہنا لابدی ہے۔ اس

محرومی سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کا واحد علاج معاشرتی سرطانوں کا استیصال بذریعہ حُسنِ انقلاب ہے۔

حواشی

۱۔ ثقافتی اِنقلاب: (Aesthetic revolution)

۲۔ دیکھیے الاعراف ۷: ۱۵۷۔

۳۔ دیکھیے مصنّف کی کتاب پیغمبر اعظم و آخرؐ، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۲ء۔

۴۔ اَلْعِلْمُ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ

۵۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَھْدِ اِلَی اللَّحْدِ

۶۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۳۵: ۲۸)۔

۷۔ سلطان: الرحمٰن ۵۵: ۳۳۔

۸۔ حکمت خیرِ کثیر ہے: البقرہ ۲: ۲۶۹۔

۹۔ الملک ۶۷: ۱۰؛ نیز دیکھیے الانبیآء ۲۱: ۱۰؛ الانفال ۸: ۲۲ و بمواضع کثیرہ۔

۱۰۔ آلِ عمران ۳: ۱۹۱۔

۱۱۔ الفرقان ۲۵: ۷۳؛ الاسراء ۱۷: ۱۰۷۔

۱۲۔ آلِ عمران ۳: ۱۹۰؛ الرّعد ۱۳: ۱۹؛ اِبراہیم ۱۴: ۵۲۔

۱۳۔ یونس ۱۰: ۱۰۰۔

۱۴۔ الانفال ۸: ۲۲۔

۱۵۔ حلّتِ ابدِ رواں: اِرشادِ نبویؐ۔

۱۶۔ قانونِ کفرانِ نعمت: الانفال ۸: ۵۳؛ الرّعد ۱۳: ۱۱۔

۱۷۔ التّین ۹۵: ۵؛ نیز دیکھیے الصافات ۳۷: ۹۸؛ فصلت ۴۱: ۲۹۔

۱۸۔ التّوبہ ۹:۳۱۔

۱۹۔ الرّحمٰن ۵۵:۳۳۔

۲۰۔ حسن کور: (Beauty blind)

۲۱۔ الحجر ۱۵:۹۔

باب (۷)

عورت کی حیثیت اور فرائض

یہ سوال مشہور بھی ہے اور متنازع فیہ بھی کہ معاشرے میں عورت کی حیثیت اور فرائض کیا ہیں؟ اس مسئلے کو ہم پہلے جمالیاتی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کی تخلیقی فعلیت جمالیاتی، تنزویجی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز تخلیق کرتا ہے، ایک تو اُسے حسین اور دوسرے اس کا جوڑا بنا کر پیدا کرتا ہے چنانچہ قدرت کی ہر مخلوق زوجین ہوتی ہے اور ان میں سے ایک صنفِ جلیلہ یا نر اور دوسری صنفِ جمیلہ یا مادہ ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر چیز کا زوج ہوتا ہے اور جلال کا زوج جمال ہے اور یہ دونوں حُسن کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

مرد و زن دونوں اللہ تعالیٰ کی حسین تخلیقات ہیں، اور صنفِ جلیلہ کے مقابلے میں عورت صنفِ جمیلہ ہے۔ صنفِ جلیلہ اگر قوت و توانائی، ہیبت و جبروت، عظمت و رفعت، شان و شکوہ، سطوت و رعب اور مردانگی و شجاعت کا مظہر ہوتی ہے تو صنفِ جمیلہ لطافت و نزاکت، محجوبیت و گل اندامی اور حیا و محجوبیت کی آئینہ دار۔ غور کریں تو یہ تفاوت ہی دونوں میں مابہ الامتیاز ہے اور مرد کے مقابلے میں عورت کی حیثیت اور فرائض کی تعیین کرنے میں معیار کا کام دے سکتا ہے۔

فاطرِ ہستی نے قرآنِ مجید میں عورت کی حیثیت و فرائض کو ایک ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز مثال سے واضح کیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ عورت کی مثال مزرع یا کھیتی کی سی ہے! جس طرح عالمِ نباتات میں کھیتی وسیلۂ پیداوار ہے اور اس میں پیداواری استعداد بالقوہ ودیعت ہوتی ہے جسے قوّت سے فعل میں لانے کی خاطر آدمی اس میں بیج ڈالتا، پھر اس کا تغذیہ و تزکیہ اور دیکھ بھال کرتا ہے، اسی

طرح عالمِ حیاتیات میں عورت بھی وسیلۂ پیداوار ہے اور اپنی حیاتیاتی تخلیقی استعداد کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے مرد کی محتاج ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عورت بھی مرد کی طرح انسان، اشرف المخلوقات اور صاحبِ ارادہ و اختیار ہے، اور اس میں علم و حکمت، صنعت و حرفت، ہنر و فن کے اکتساب کی استعداد بالقوہ ودیعت ہوتی ہے۔ نیز وہ صاحبِ سمع و بصر، صاحبِ عقل و شعور اور صاحبِ جذبات و احساسات ہے اور اپنا ایک منفرد وجود و تشخص رکھتی ہے۔ علاوہ بریں، اس میں جمالیاتی، تخلیقی صلاحیتیں بھی ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ حقائق عورت کی معاشرتی حیثیت و فرائض کی تعیین کرنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن مجید کا "اصولِ تکلّف" بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے اور وہ ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط (البقرۃ ۲، ۲۸۶): اللہ کسی نفس کو اسی اور اتنی ہی بات کا مکلّف کرتا ہے، جس کی اور جتنی اس میں طاقتِ عمل یا قوتِ برداشت ہو۔

چنانچہ قرآنِ مجید کے اس اصولِ تکلّف کے مطابق عورت پر معاشرتی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، لہٰذا اُسے معاشرے کے نشو و ارتقا میں وہ سب کچھ کرنا چاہیے، جو وہ کر سکتی ہے، اس لیے کہ عورت کو قدرت کی طرف سے جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان سے کام لینا عورت پر لازم ہے، جس طرح مرد پر لازم ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ ایسا نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے، جس سے زوالِ نعمت لازم آتا ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی کوئی تخلیق عبث و بے مقصد یا لایعنی نہیں، بلکہ بامقصد اور افادی قدروں کی حامل ہوتی ہے؛ لہٰذا عورت جو اللہ تعالیٰ کی جمیل ترین مخلوق ہے، اُسے قدرت کی طرف سے جو قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی قوت بھی تخلیق باباطل نہیں ہو سکتی، لہٰذا انھیں بروئے کار لانا اور ان سے اپنی اور اجتماعی زندگی کا نشو و ارتقاء کرنا مقتضائے فطرتِ انسانی اور منشائے قدرت ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ اگر کوئی فرد یا معاشرہ عورت کو اس کی خداداد استعدادوں کو قوت سے فعل میں لانے یا بروئے کار لانے کی اجازت نہیں دیتا، وہ انسانی آزادی کے حقوق کو پامال کرتا، عورت کو اللہ تعالیٰ کی نہیں اپنی مملوکہ سمجھتا، نیز قدرت کی تخلیقی فعلیت کی نفی اور اس کی نعمتوں کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ فعل ایسا ہے جیسے کوئی شقی القلب شخص پھولوں بھری کھیتی کو پامال و

برباد کر دے۔ ظاہر ہے ایسا فعل قدرت کے نزدیک گناہِ کبیرہ اور سنگین قسم کا جرم ہے۔

آزادیِ نسواں

اگر یہ حقیقت ہے کہ عورت انسان ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی ودیعت کی ہے، جس کے سبب وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے تو پھر عورت کو صاحبِ ارادہ و اختیار نہ سمجھنا اور اس کی آزادی کا احترام نہ کرنا اور اس پر بھی اُسے قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا سزاوار سمجھنا، منطقی تضاد اور ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ تاریخی عمل شاہد ہے کہ مسلم اقوام کی پسماندگی و مفلوک الحالی کا ایک سبب یہ ہے کہ انھوں نے صدیوں سے عورت کو فطری حقوق و آزادی سے بہت حد تک محروم کر رکھا ہے۔

قدرت نے مرد کی طرح عورت میں بھی گوناگوں استعدادیں بالقوہ ودیعت کی ہیں تاکہ وہ ان کو قوت سے فعل میں لا کر اپنا جمالیاتی ارتقاء اور اپنی ذات کی تکمیل کرے؛ نیز ان سے بنی نوع انسان اور دیگر مخلوقات کو فائدہ پہنچائے اور اس طرح باعثِ رحمتِ عوالم بنے کہ یہ سنّتِ پیغمبریؐ ہے۔ کسی معاشرے کا عورت کو ایسا کرنے نہ دینا ظلم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح وہ معاشرہ قدرت کے جمالیاتی تخلیقی شہکار کی ذات اور صلاحیتوں کی نفی کرتا اور عالمِ انسانی کو بالخصوص اور دیگر عوالم کو بالعموم نقصان پہنچاتا اور انسان کی مادی و جمالیاتی ارتقاء میں مانع آتا ہے۔ اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے، اس لیے کہ اسے جھٹلانے کی کوئی وجہ جواز نہیں کہ عورت بھی مرد کی طرح صاحبِ ارادہ و اختیار، اہلِ عقل و شعور اور تخلیق بالحق ہے تو پھر یہ بھی درست ہے کہ اُسے اکتسابِ علم و ہنر اور فکر و عمل کی آزادی ہونی چاہیے؛ نیز اللہ تعالیٰ کے قانون لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا اطلاق مرد کی طرح اس پر بھی ہوتا ہے۔

تحدیدِ آزادی کا اُصول

یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انسان (۱: مرد و زن) معاشرتی بشر ہے، لہٰذا وہ اپنے حقوق اور حدودِ آزادی کے تحفظ کی خاطر دوسروں کے انسانی حقوق اور حدودِ آزادی کا احترام کرنے پر مجبور ہے، اور یہ مجبوری فطری ہے اور اس سے "تحدیدِ آزادی" کا اُصول متخرج ہوتا ہے۔ آزادیٔ نسواں کی حدود کی تعیین میں یہ اصل ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ عورت مرد کا ہم جنس زوج اور معروضِ جمال و جنس ہے، اور اس کی یہ جمالیاتی خوبی ہی اس کی ایسی فطری کمزوری ہے، جو اس کی ذات کے لیے مستقل خطرہ ہے۔ چنانچہ اس کے بچاؤ کے لیے قدرت نے عورت کی فطرت میں حیا بدرجۂ اتم ودیعت کر دی ہے۔ حیا عورت کا موضوعی حُسنِ حجاب ہے جو معروضی حُسنِ حجاب کا متقاضی ہے۔ علاوہ ازیں تقویٰ بھی موضوعی حُسنِ حجاب ہے۔ معروضی حُسنِ حجاب سے مراد ایسا پردہ ہے جو صنفِ جمیلہ کے گلہائے شباب اور آرائشِ جمال کو مرد کے حواس پر اپنا جلوہ نہ پیدا کرنے دے۔ جہاں تک موضوعی حُسنِ حجاب کا تعلق ہے، وہ اصل میں آواز و نظر کا پردہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنفِ جمیلہ جس وقت غیر محرم سے ہمکلام ہو، اس کی آواز و نظر میں "جلالِ حیا" ہو، دوسرے، دونوں کی آواز و نظر کے درمیان حجابِ تقویٰ ہو، اور تیسرے عورت اپنی نظر مرد کی نظر سے نہ ملائے اور ملائے بھی تو اس جلالِ حیا کے ساتھ کہ دونوں میں جمالیاتی۔ جنسی تصادم کا خدشہ و امکان نہ رہے۔ اس سے عورت کی تحدیدِ آزادی کا یہ اُصول مستنبط ہوا کہ "اُسے اپنے موضوعی۔ معروضی حسن حجاب کے ساتھ "اکتساب" (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کی آزادی ہونی چاہیے جو صالح ہو، طالح نہ ہو"۔ ایسی صالح آزادی کیلئے ہم "حسنِ آزادی" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہم اس وقت موجودہ غیر اسلامی۔ سرطانی معاشرے کی بات نہیں، بلکہ مستقبل کے اسلامی معاشرے کی بات کر رہے ہیں، جو سود خورد ظالم معاشرتی سرطانوں اور ان کے مفاسد و مظالم سے پاک و صاف اور صالح افراد پر مشتمل

ہوگا؛ نیز اس میں آئینِ قرآن نافذ ہوگا۔ ایسے معاشرے میں اوّل تو جنسی جرائم کے مواقع بہت کم ہوں گے اور پھر ان سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی عقوبت کا خطرہ جنسی لذت کی بہ نسبت اس قدر زیادہ ہوگا کہ ایسی جسارت شاذ و نادر ہی کوئی کر سکے گا۔ اس کی ایک مثال دورِ حاضر کے "بے خدا" چینی معاشرے میں ملتی ہے، جہاں مرد و زن ہر شعبۂ زندگی میں اکٹھے کام کرتے ہیں، لیکن جنسی جرم کی واردات شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں جس کے افراد مؤمن و متقی اور صالح ہوں گے اور انھیں شرعی تعزیر اور معاشرتی تذلیل و تحقیر کے علاوہ اُخروی زندگی کے عذاب کا بھی خوف ہوگا، جنسی جرائم کے ارتکاب کا احتمال نسبتاً بہت کم ہوگا۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام کے صالح معاشرے میں عورت کو اپنے موضوعی۔ معروضی حُسنِ حجاب کے ساتھ اسلام کی تحریکِ رحمتہ للعالمینی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) یا قوم و ملت کے نشو و ارتقاء اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں فعّال کردار ادا کرنے کی آزادی دینا جائز بلکہ ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اُسے روزی کمانے، خرید و فروخت کرنے اور زندگی کی دیگر ضروریات پوری کرنے کی خاطر، نیز زندگی کے دیگر شعبوں میں اپنا تعمیری و مثبت کردار ادا کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ الغرض، عورت اپنے فطری معروضی موضوعی حُسنِ حجاب کے اندر رہ کر زندگی کے ان تمام امور میں حصہ لے سکتی ہے، جن کے کرنے کی اس میں استعداد و صلاحیت ہو اور جہاں کام کرنے کا ماحول اس کے لیے سازگار ہو۔ یہ بات ہمیں حتمی طور سے تسلیم کر لینی چاہیے کہ اسلامی معاشرے میں جو صالح افراد پر مشتمل ہوگا، عورت کو اپنی تعمیری و تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے مواقع کثرت سے ملیں گے اور وہ قوم و ملت کے ارتقا میں بھرپور حصہ لے سکے گی، اس لیے بھی کہ ماحول صالح، موزوں اور سازگار ہوگا۔ اس کے نتیجے میں قوم و امتِ مسلمہ ایک تو زیانِ مسلسل سے بچ جائے گی، جو محکومیِ زن کے باعث وہ اُٹھا رہی ہے؛ دوسرے اس کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا، اور تیسرے اس کی نشو و ارتقاء کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی۔

عورت اور ریاست

ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ جس طرح اسلام میں علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے، اُسی طرح علوم کی ترقی اور زمانے کے نو بنو تقاضوں، نیز قرآنِ مجید کے نصابِ تعلیم کے مطابق جملہ افرادِ قوم کی تعلیم و تربیت کا معقول اہتمام و انصرام کرنا اسلامی حکومت کی اوّلین ذمے داریوں میں سے ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں قوم کا ہر فرد چاہے مرد ہو یا عورت، لکھا پڑھا اور باشعور ہوگا۔ اس کے نتیجے میں وہ حکومت اور رعایا کے ملکی فرائض اور ذمے داریوں سے باخبر ہوگا۔ چونکہ عورت بھی معاشرے کی باشعور و ذمے دار فرد ہوگی، لہٰذا اُسے مرد کی طرح اسلامی ریاست کے حکمران کے انتخاب، نیز اس کے مشیروں کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔ علاوہ ازیں اگر کوئی عورت علمی و ذہنی اعتبار سے مجلس شوریٰ کی رُکن بننے کی قرآنی اہلیت رکھتی ہو گی، تو وہ رُکن بننے کی بھی حقدار ہو گی۔

الغرض، عورت اگر مرد کی طرح صاحبِ ارادہ و اختیار ہے اور اُسے حسی و قلبی قوتیں ودیعت ہوئی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ اپنی ان خداداد نعمتوں، نیز اپنے اعمال اور ذمے داریوں کے لیے ربّ العالمین کے سامنے جوابدہ ہے اور قدرت کے قانونِ مجازات کی متوجب بھی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُسے اپنے قومی و ملّی فرائض ادا کرنے، اپنی ذات کی نشوونما کرنے اور اپنے مقاصدِ تخلیق کو پورا کرنے کی آزادی نہ دی جائے۔ آزادی، بہرحال، صنفِ جمیلہ کے وجودی فطری حجاب کے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیے، جس کے لیے ہم "حسنِ آزادی" کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں۔

نکاحِ باطل

اسلام میں نکاح کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نکاح سے خاندان کی اور خاندان

سے معاشرے کی تکمیل و تعمیر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ خاندان سازی کا ازبس اہم و مقدس ادارہ ہے، جس سے معاشرے کی شیرازہ بندی اور اس کے افراد میں قومیت پیدا ہوتی ہے۔ غور کریں تو نکاح کا مقصد اللہ تعالیٰ اور معاشرے کے سامنے میثاقِ محکم کے ذریعے مرد و زن کی رفاقتِ دائمی ہے تاکہ وہ احسن الخالقین کے منشا کے مطابق اس کی تخلیقی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لیں اور اپنے اشتراکِ عمل سے عائلی و قومی زندگی کی تشکیل و تعمیر اور نشو و ارتقاء کریں۔ اس سے یہ منطقی نتیجہ متخرج ہوا کہ جو نکاح اِس حُسنِ نیّت سے نہیں کیا جاتا یا اپنے مقصد کو پورا نہیں کرتا، وہ جھوٹا ہوتا ہے، لہٰذا اسے "نکاحِ باطل" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

نکاحِ باطل کی مثال ہمیں مسلم معاشروں میں ملتی ہے، خاص کر جہاں تیل کی دولت کی فراوانی ہے۔ ان سرطانی معاشروں میں مرفہ الحال لوگ حدِّ شرعی سے بچنے کی خاطر رکھتے تو چار بیویاں ہیں، لیکن تازہ بتازہ اور نو بنو جنسی معروضات کی ہوس میں مسلسل نکاح کیے اور طلاق دیے جاتے ہیں۔ اُن کے آئے دن نکاح کرنے اور طلاق دینے کا مقصدِ وحید نئے سے نئے جنسی معروض سے جنسی تلذذ اور نکاح تو کا شرعی جواز پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس حیلے سے وہ بظاہر شرعی حدود کے اندر رہتے ہیں، لیکن حقیقت میں نکاح کے مقدس و اہم ادارے کی تضحیک ہی نہیں اس کا استیصال بالحیل بھی کرتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو نکاحِ باطل دراصل بردہ فروشی ہی کی ایک شکل ہے۔ مرد نکاحِ باطل کے ذریعے عورت کو اس کی قیمتِ خرید ادا کر کے حاصل کرتا ہے، بیوی یا شریکِ حیات بنانے کے لیے نہیں، بلکہ وقتی جنسی معروض کے طور پر، اور اس قیمتِ خرید کو وہ "مَہر" سے تعبیر کرتا ہے، جس طرح تسمیہ بالباطل کے ذریعے سود کو نفع سے موسوم کرتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ اسلامی میں کنیز داری اور بردہ فروشی کی طرح نکاحِ باطل قانوناً ممنوع اور قابلِ تعزیر ہوگا۔

کنیز داری ملوکیت کی ایجاد ہے!

مسلم معاشرے میں کنیز داری کو جائز قرار دینے اور اس کا ادارہ قائم کرنے والی ملوکیت تھی۔ ملوکیت بھی فرعونیت کی ایک صورت ہے، جس کے ہیولے میں معاشرتی سرطان مضمر ہوتے ہیں۔ سرطانی طبقوں نے اپنی قوت و سطوت، جبر و اکراہ اور مال و دولت کے ذریعے کنیز داری کے ادارے کو شرعاً جائز قرار دینے کی خاطر علمائے سوء اور فقیہانِ آزادی سے فتوے حاصل کر لیے اور اس کے نتیجے میں سادہ لوح مسلمانوں نے کنیز داری کو شرعاً تسلیم کر لیا۔ غضب یہ ہے کہ آج کے دور میں جب اقوامِ عالم نے غلامی کو انسانیت سوز جرم قرار دیا ہے اور اس کے خلاف جہاد کر رہے ہیں، بعض مسلمان فقیہانِ آزادیٔ "کنیز داری" کے جواز کے فتوے صادر فرما رہے ہیں۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

یہ انتہائی شرمناک و عبرت ناک حقیقت ہے کہ بعض عرب ممالک میں جہاں ملوکیت کا دور دورہ ہے، کنیز داری کا ادارہ قائم ہے اور عورتیں بکتی ہیں اور محلّات و ایوان کنیزوں سے معمور ہیں۔ عرب معاشرتی سرطانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کو بدنام ہی نہیں کیا، اس کی تحریک اور اشاعت و ترقی کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

بہرحال، اسلامی معاشرے میں کنیز داری بھی بردہ فروشی کی طرح قانوناً ممنوع ہو گی اور اُسے قابلِ تعزیر جرمِ سنگین قرار دیا جائے گا۔

جہیز

یوں تو قریب قریب سبھی آزری و قارونی رسومات سرطانی ہوتی ہیں، لیکن ان میں سے ایک دُور رس منفی نتائج کی حامل جہیز کی رسم ہے جو "استحصال بالزواج" کی عبرت ناک مثال ہے۔ یہ سود خور ہندو قارونوں یا مہاجنوں کی عقلِ عیار کی ایجاد ہے۔ اس سرطانی رسم نے کروڑوں بلکہ اربوں دوشیزاؤں

کو ازدواجی زندگی کی لذت و برکات سے محروم کیا اور انھیں گھل گھل کر مرنے یا خودکشی کرنے یا بیسوا بننے پر مجبور کیا ہے۔ برِصغیر کے مسلمانوں کو یہ انسانیت سوز قارونی رسم بھی متعدد دیگر طاغوتی رسوم کی طرح ہندو معاشرے سے ورثے میں ملی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، یہ رسمِ جہیز ان کی قرآنِ حکیم سے مہجوری و دُوری کی غماز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام نے نکاح کو مہر سے مشروط کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر کے بغیر نکاح ناجائز ہے، اس لیے کہ اپنی منکوحہ کو مہر دینا مرد پر فرض ہے۔ لیکن مسلم قارونی طبقے نے ہندو قارونوں کی دیکھا دیکھی نکاح کو جہیز سے مشروط کر کے مہر کو غیر مؤثر اور محض رسمی کارروائی بنا دیا ہے۔ چنانچہ اب مہر کی جگہ جہیز نے لے لی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مردوں پر اپنی ازواج کو مہر دینا رواجاً اور عملاً لازم نہیں رہا؛ بخلاف اس کے عورتوں پر جہیز لانا لازم ہو گیا۔ اب مرد تو عورت سے جہیز کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن عورت اپنے مہر کا مطالبہ کرنے کی مجاز نہیں۔ یہ عورت کے ساتھ سخت ناانصافی اور اس کی حق تلفی، نیز فرمانِ الٰہی کی عملاً تکفیر ہے۔ برِصغیر کا مسلمان یہ حقیقت جانتا ہے، لیکن اس کی شقاوت و محرومی اور کج اندیشی و کجروی کے عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ

جانتا ہے پر مانتا نہیں

فلسفۂ مہر پر غور کرنے سے ہمیں صنفِ جمیلہ کی معاشرتی حیثیت کی تعیین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسلام نے عورت کو مہر کا حق دے کر اور مرد کو اس حق کی ادائی کا مکلّف بنا کر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ صنفِ جمیلہ اصل میں مرد کی ناظورۂ حیات اور معروضِ طلب و آرزو ہے، لہٰذا معاشرے کو اسے ایسا ہی سمجھنا اور اس کی اس حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھنا؛ نیز مرد کو ہر حال میں اس کا طالب و مشتری ہی رہنا چاہیے۔ نکاح بالمہر میں یہ لطیف نکتہ مضمر ہے کہ مرد پر اپنی منکوحہ کے وصال اور رفاقتِ دائمی کے عزم و شوق کے ثبوت میں ایثار بالمال کرنا لازم ہے؛ نیز صنفِ جمیلہ ہر حال میں مطلوبہ و محبوبہ اور صنفِ جلیلہ طالب و محب ہے اور دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے اور مرد اس کے لیے ہمیشہ ایثار بالمال کرتا رہے گا۔ بخلاف اس کے قارونی صفت

طبقات نے نکاح کو جہیز سے مشروط کر کے اس کی روح کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے لیے ہم نے "نکاح بالجہیز" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

نکاح بالجہیز نے عورت کی جمالیاتی و معاشرتی حیثیت کو اس طرح بدل دیا ہے کہ اُسے مطلوب سے طالب اور معروضِ جمال و طلب سے مشتری بنا دیا ہے، جو اس کی فطرت یا فطری حیا کے منافی ہے۔ علاوہ بریں، روزمرّہ مشاہدے کی بات ہے کہ برِصغیر کے مُسلم معاشروں میں مہر باندھتے تو ہیں، مگر رسمی طور سے اور محض دکھاوے کے لیے، مگر منکوحہ کو دینے کے لیے نہیں۔ بالفاظِ دیگر، مہر باندھا تو جاتا ہے، لیکن عورت کو دیا نہیں جاتا۔ یہ صریحاً حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی ہے، مگر نام نہاد واعظین و مصلحین اور سیاسی رہنماؤں کی زبانیں گنگ ہیں؛ وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرتے اور نہ حکومت کوئی کارروائی ہی کرتی ہے۔ سرطانی ظلم و جہل کا نتیجہ ہے کہ عورت اپنے مہر کا مطالبہ کرنے کی بھی مجاز نہیں۔ عورت کا یہ مطالبہ مرد سننے کی تاب نہیں رکھتے اور اس کے جواب میں طلاق کی دھمکی دی جاتی ہے، لہٰذا عورت مہر کا نام اپنی زبان پر لانے کا تصوّر تک نہیں کر سکتی۔ اس معاملے میں عورت کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ خود عورتیں مردوں سے زیادہ مطالبۂ مہر کی مخالفت کرتی ہیں اور مہر کو اپنے لیے "شجرِ ممنوعہ" سمجھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی عورت ارشادِ الٰہی کی بنا پر اپنے حقِ مہر کا مطالبہ کرنے کی جسارت کرتی ہے تو معاشرہ اس کا مخالف ہو جاتا ہے اور اسے باغی، بیوفا اور گردن زدنی سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ نکاح بالجہیز اور "نکاح بے مہر" کو ہمارے معاشرے نے صدیوں سے روا رکھا ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسے در پردہ آزریت و قارونیت کی حمایت حاصل ہے۔ اسی طرح یہ بھی جاہل آزریت کے ایما پر مشہور ہو گیا ہے کہ مہر کی رقم شرعاً بتیس ۳۲ روپے ہے، حالانکہ یہ قطعاً بے بنیاد بات ہے، بلکہ یہ سُنّتِ حسنہ کے خلاف[۷] ہے؛ نیز یہ عورت کے ساتھ ناانصافی، اس کی حق تلفی اور اس کی جمالیاتی حیثیت اور معاشرتی مرتبت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ مہر کی رقم کی تعیین کا اصل الاُصول یہ ہے کہ "مہر بالاستطاعت" ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنی مالی مقدرت کے مطابق مہر باندھنا چاہیے۔ بعض فقہا کے نزدیک

مہر کی رقم کی تعیین میں عورت کی جا یا یاتی و معاشرتی حیثیت کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں جہیز کی قارونی۔سرطانی رسم کا اِستیصال کیسے کر سکتے ہیں؟ نیز نکاح بالجہیز کے بجائے نکاح بالمہر کو کیسے رائج کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس سرطانی مرض کا علاج وعظ و نصیحت ہے نہ موجودہ قانونِ جہیز۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک معاشرہ سرطان زدہ ہے، اور اس میں سرمایہ دارانہ قارونی نظام قائم ہے، لڑکے والے جہیز کے مطالبے سے، چاہے وہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سرطانی مرض بڑھ جائے تو وہ علاج سے اور بڑھتا ہے اور اس پر یہ قول صادق آتا ہے: مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

لٰہذا اس سرطانی مرض کا اب ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے:

قارونی، سرطانی نظامِ جاگیرداری و سرمایہ داری کا اِستیصال بذریعہ حُسنِ انقلاب!

ثقافتی تضادات

دیگر مُسلم معاشروں کی طرح ہمارا پاکستانی معاشرہ بھی ثقافتی تضادات کا شکار ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری اکثر ثقافتی سرگرمیاں ایسی ہیں جنھیں ہم شرعًا ناجائز سمجھتے ہیں یا مذہبی پیشوائیت اُنھیں ناجائز و حرام کہتی ہے، اگرچہ ان کے خلاف جہاد نہیں کرتی؛ بلکہ وہ خود بھی ایسی سرگرمیوں میں بلا واسطہ یا بالواسطہ طور سے ملوّث ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو ہمارا قومی تشخص تشکیل نہیں پاسکا؛ دوسرے ہماری فکر و نظر اور رویۂ زندگی میں اختلاف و تضاد نے راہ پالی ہے۔ تیسرے ہمارا معاشرہ عصبیت کا شکار ہے، جس کے سبب اس کو تشتّت و افتراق گھُن کی طرح کھائے جارہا ہے؛ اور چوتھے، ہم اس خلشِ احساس کے ساتھ زندگی گزر رہے ہیں جیسے مسلسل گناہ کیے جارہے ہوں۔ یہ صورتِ حال، جو انتہائی مہلک و دُور رس نتائج کی حامل ہے، ہماری سلامتی و بقا اور آزادی و وقار کے لیے اس سے بہت زیادہ خطرناک ہے جتنی کہ عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

ثقافتی تضادات کے عوامل و محرکات تو متعدد ہیں، لیکن میرے نزدیک ان میں سے اہم ترین ہماری فکر و نظر اور قوّتِ فیصلہ کا جمود و تعطّل ہے، جسے اصطلاحاً فقدانِ اجتہاد سے تعبیر کرتے ہیں. حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے نو بنو اور تازہ بتازہ تقاضوں کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ اجتہاد ہے. اجتہاد زندگی کو مستلزم ہے. وجہ یہ ہے کہ زندگی قدرت کا عملِ کُن و فیکون یا جمالیاتی تخلیقی فعلیت ہے، جس کا ثبات و دوام رنگ و تغیر و تنوع سے مزیّن ہے، جس کے نتیجے میں زندگی کے ہنگامے پرورش پاتے اور نو بنو مسائل ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں. ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وحیٔ تنزیل کے نور و فرقان کے علاوہ حیات، عقل و فکر اور علم و حکمت ایسی نورانی قوتوں سے نوازا ہے. چنانچہ ان قوتوں کی مدد سے زندگی کے مسائل نو بنو حل کرنے کی سعیِ بالحق کو اصطلاحاً "اجتہاد" سے تعبیر کرتے ہیں. اس اعتبار سے اجتہاد ہر قوم کی ضرورتِ مدام اور اس کے نشو و ارتقاء کی پیش شرط ہے. تاریخ بتاتی ہے کہ جو قوم اجتہاد کو ترک کر دیتی ہے، اس کی زندگی میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ اس کی پس ماندگی و محکومی، اضمحلال و انحطاط، ذلّت و مسکنت اور تضاداتِ فکری و نظری کی صورت میں نکلتا ہے. مسلم اقوام سمیت پاکستانی قوم اسی صورتِ حال سے دوچار ہے، لیکن قوم مسلوب النعم اور آرزوئے حسن و زندگی سے محروم ہے، اس لیے وہ اجتہاد کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھتی اور اس سے ترساں و گریزاں ہے. باوجود اس کے ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جو قوم حقیقت سے آنکھ چراتی ہے، زندگی اس سے آنکھ چرا لیتی ہے. چنانچہ اگر ہم نے آزاد اور زندہ رہنا ہے تو ہمارے لیے اپنے درپیش مسائلِ حیات کو بلا تاخیر حل کرنا ناگزیر ہے، اس لیے کہ ایسے امورِ ضروریہ میں بلا وجہ تاخیر ہلاکت و بربادی کا موجب بن سکتی ہے.

اگرچہ ہمارے متنازع و حل طلب ثقافتی مسائل کثیر التعداد ہیں، لیکن ان میں سے فوری حل طلب مسائل مفصلہ ذیل ہیں:

(۱) فنونِ جمیلہ: (۱) موسیقی (۲) رقص (۳) مصوّری اور فوٹوگرافی (۴) مجسمہ سازی (۵) ڈرامہ.

(ب) ثقافتی ایجادات و اختراعات (ج) آزادیِ نطق و قلم (د) آزادیِ نسواں۔

ان متنازع فیہ اور فوری حل طلب مسائل سے گفتگو کرنے سے پہلے اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ قرآن و سُنّہ کی رُو سے ان کی حلت و حرمت کے متعلق اجتہاد کرنے کا مجاز فقط خلیفہ فی الشوریٰ ہے، لٰہذا میری معروضات کی نوعیت محض تجویز و مشورت کی ہے۔ اب ان مسائل سے فرداً فرداً گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۔ موسیقی: یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے انسان کو حسّی، قلبی، نفسی قوتیں ودیعت کی ہیں، جو اس کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اس موہبتِ الٰہی کا مقصود یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعے علم و حکمت اور ہنر و فن سیکھے اور حُسنِ حیات و کائنات سے جمالیاتی حظ و طرب، جمالیاتی درد و سوز، مسرّت و طمانیت اور کیف و سُرور یا جمالیاتی مسرّت حاصل کرے؛ لٰہذا ہر شخص (فرد ہو یا قوم) اپنی کسی قوّت یا قوتوں سے کام نہیں لیتا اور ان کے ذریعے جمالیاتی ثروت اور دیگر فوائد حاصل نہیں کرتا، وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے اور یہ اسلام کے نزدیک گناہِ کبیرہ ہے، جس کی پاداش میں وہ نعمت یا نعمتیں سلب کر لی جاتی ہیں۔ اس قانونِ قدرت کے پیشِ نظر پاکستانی قوم سمیت جملہ مسلم اقوام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ سامعہ اور جمالیاتی ذوق کے ذریعے حُسنِ آواز و آہنگ سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا ایسا نہ کرنا کفرانِ نعمت تو نہیں؟ علاوہ بریں، فیصلہ کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ربِّ جمیل و کریم نے ایک طرف کرۂ ارضی کو انواع و اقسام کی حسین و دلکش صداؤں، آوازوں اور آہنگوں سے معمور کر کے فردوسِ گوش بنا دیا ہے اور دوسری طرف انسان کو ان سے جمالیاتی ثروت (جمالیاتی حظ و لذت، جمالیاتی درد و سوز، طمانیت و مسرّت، طرب و مستی اور کیف و سُرور) حاصل کرنے کے لیے سامعہ اور جمالیاتی ذوق ودیعت کیا ہے؛ نیز اُسے سُر، لے اور تال کا علم و ہنر سکھایا ہے۔ کیا (نعوذ باللہ) ربِّ حکیم کی یہ جمالیاتی، تخلیقی فعلیت اور نعمتوں کی ارزانی بے مقصد ہے؟ کیا کوئی اہلِ ایمان ایسا سوچ سکتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں حُسنِ آواز سے مقدور بھر جمالیاتی ثروت

حاصل کرنی چاہیے، اور کفرانِ نعمت سے بچنا چاہیے۔ علاوہ ازیں، ہمیں حسین مخلوقات اور ان کے حسنِ آواز و آہنگ سے محبّت کرنی چاہیے۔ یہ سوزِ محبت ہے جو غمِ روزگار کا مداوا اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے؛ نیز اس سے شمعِ دل فروزاں اور اس کے نور کی تکمیل ہوتی ہے۔

اگر طیور کے نغموں اور اشجار کے سازینوں کا سُننا اور ان سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنا جائز و حرام نہیں؟ اگر آبِ رواں کے مدھم سُروں، آبشاروں کی بلند بانگ تال و لے اور چوپاؤں کی تانوں کا سُننا اور ان سے لُطف اندوز ہونا حرام و ناجائز نہیں تو پھر اشرف المخلوقات کے حُسنِ آواز و ساز کا سُننا اور ان سے جمالیاتی سرور و سوز حاصل کرنا کیسے ناجائز و حرام ہو سکتا ہے؟ اگر ربِّ جمیل و جمال پسند کی نظر میں موسیقی حرام ہوتی تو قرآنِ مجید، جو مکمل ضابطۂ حیات اور دین کا آئینہ دار اور ہر شے کی تفصیل ہے، اس کا برملا اظہار کرتا، جیسا کہ اس کی سنّت ہے۔ جملہ ادیانِ عالم میں موسیقی کا جائز ہونا اور قرآنِ مجید کا اسے حرام یا ناجائز قرار نہ دینا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ موسیقی حرام ہے نہ ناجائز، بلکہ یہ نعمتِ حُسنیٰ ہے، جسے ربِّ جلیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا کی تھی اور اپنی کُتبِ مقدسہ زبور اور قرآنِ مجید میں خصوصیّت سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زبور میں واضح طور سے آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مزامیر یا سازوں کے ساتھ ربِّ جلیل کی حمد و ثنا کے گیت گایا کرتے تھے۔ آپؑ گاتے گاتے رقص کرنے لگتے تو انسان تو انسان، طیور و اشجار اور کوہ و کمر بھی وجد میں آجاتے تھے۔ اس مرحلے پر ذہن میں چند ایک ایسے سوال اُبھرتے ہیں، جن کے جواب میں میرے نزدیک موسیقی کی حلّت و حرمت کا فیصلہ کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے، اور وہ یہ ہیں! کیا اشجار و آبشار قدرت کے ارغنوں یا ساز نہیں؟ کیا ان سے سُر، تال اور لے کی موجیں نہیں اُبھرتیں اور جمالیاتی حِس کی تسکین نہیں کرتیں؟ کیا جمالیاتی حس ربِّ جمیل کی نعمتِ عظمیٰ نہیں ہے؟ کیا جمالیاتی ثروت نعمتِ حسنیٰ نہیں ہے؟ اگر ان سوالوں کا جواب اِثبات میں ہے اور یقیناً ہے تو پھر ان مزامیر یا سازوں سے جمالیاتی ثروت حاصل کرنا کیسے حرام یا ناجائز ہو سکتا ہے جو انسان نے اپنے ربِّ ذوالجلال و الاکرام کے عطا کردہ علم و ہنر کے ذریعے بنائے ہیں؟ ساز ہر حال میں ساز ہے چاہے قدرت نے خود

بنایا ہو یا اس کی ہدایت و نصرت سے اس کے جمالیاتی۔ تخلیقی شاہکار انسان کا بنایا ہوا ہو۔ اسی طرح نغمہ ہر حال میں نغمہ ہے، چاہے طیور اور چوپاؤں کا ہو یا نباتات و جمادات کا یا انسان کا؛ لہٰذا اگر قدرت کی تخلیقات میں سے کسی مخلوق کا نغمہ سُننا حرام ہے نہ ناجائز تو پھر انسان کے حسنِ آواز و ساز کا سُننا عقلِ سلیم کی رُو سے کیسے حرام یا ناجائز ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے میں صنفِ جمیلہ کے حسنِ آواز کا مسئلہ واقعی ازبس دقیق، غور طلب اور خصوصی طور سے خلیفہ فی الشوریٰ کے اِجتہاد کا متقاضی ہے۔ اس مسئلے کی تین اہم ترین شقیں مفصلہ ذیل ہیں:

(۱) سمع بالمشافہ (۲) سمع بالتصویر اور (۳) سمع بالغیب۔

۱۔ سمع بالمشافہ کا مطلب ہے، مغنیہ کا گانا رو برو یا محفل میں سُننا۔

۲۔ سمع بالتصویر سے مراد مغنیہ کا گانا جدید سائنسی ایجادات، ٹیلی وژن، وی، سی، آر، سینما وغیرہ وغیرہ کے ذریعے سُننا۔

۳۔ سمع بالغیب کا مطلب ہے مغنیہ کے نغمات کو ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر یا گراموفون وغیرہ وغیرہ کے ذریعے سننا۔

اب ان سے فرداً فرداً گفتگو کی جاتی ہے:

۱۔ سمع بالمشافہ: جہاں تک مغنیہ کا گانا بالمشافہ سُننے کا تعلق ہے اس سے اس کے جمال و شباب، بناؤ سنگار، ناز و ادا اور غمزہ و ادا کے غارتگرِ ایمان و آگہی نظارے کے سبب جنسی و سفلی جذبات میں ہیجان پیدا ہونے اور جنسی۔ نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری کا ہر وقت امکان رہتا ہے، لہٰذا میرے نزدیک سمع بالمشافہ ناجائز ہے اور اسے قانوناً ممنوع قرار دے دینا چاہیے۔ بُرائی سے اغماض کرنا بذاتِ خود بُرائی ہے، لہٰذا برائی کو قانوناً بند کرنا اسلامی حکومت یا خلافت کی اہم ذمے داری ہے؛ البتہ اپنی بیوی سے گانا بجانا سُننا جائز ہے۔ میرے نزدیک شادی بیاہ کے موقعوں پر عورتوں کو گیت گانے اور ڈھولک بجانے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔

۲۔ سمع بالتصویر: اس سائنسی دَور میں ٹیلی وژن اور ریڈیو کی غیر معمولی اہمیت سے متعلق دو

وہ ایسی نہیں ہو سکتیں، اس لیے کہ یہ تشہیر و ابلاغ اور تعلیم و تربیت کے از بس مؤثر ذرائع ہیں؛ لہٰذا ان کے جواز کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ٹیلی وژن پر جو پروگرام دکھلائے جاتے ہیں، وہ تصویری و صوتی ہوتے ہیں؛ دوسرے ان میں سے اکثر پروگراموں میں عورت کی اداکاری و صداکاری اور گلوکاری بھی ہوتی ہے اور یہ پروگرام محض تفریحی نہیں، بلکہ تعلیمی و تربیتی اور تشہیری و ابلاغی بھی ہوتے ہیں، لہٰذا زمان و مکان کی تسخیر اور تشہیر و ابلاغ کے دور میں زمانے کے نو بنو تقاضوں اور ہر دم متغیر احوال و ظروف کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرنا ہوگا کہ ایسے پروگراموں کو جائز قرار دینا، قوم و ملت کے حق میں مفید ہوگا یا نقصان دہ؟ ایسے پروگراموں کو ناجائز و ممنوع قرار دینے سے پہلے، مجتہدین (یعنی خلیفہ اور مجلسِ شوریٰ کے ارکان) کو ہزار بار سوچنا ہوگا کہ کیا ان کا نعم البدل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ نیز ان پروگراموں کو بند کر دینے سے ٹیلی وژن میں ناظرین کی دلچسپی، نیز ان کی افادیت ختم ہو جانے کے نتیجے میں قوم و ملت کو جو نقصان پہنچے گا اس کے مداوا کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی یا نہیں؟ خلیفہ بالشوریٰ کو اس معاملے میں انتہائی غور و خوض کرنے اور قوم کو احسن طریق سے اعتماد میں لینے کے بعد جراْت مندانہ اور دو ٹوک فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ یاد رہے کہ فیصلہ جو بھی ہو، ادھورا، مبہم اور ذو معنی نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ ایسے فیصلوں سے قوم کے فکر و نظر اور کردار و رویۂ زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ فیصلہ اور جراْتِ اقدام کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اس کی عبرت ناک مثال مسلم اقوام میں ملتی ہے۔

میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایک تو پروگرام صوری و معنوی لحاظ سے پاکیزہ و حسین، نیز افادی اور جمالیاتی۔ اخلاقی قدروں کے حامل ہونے چاہئیں۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ پروگرام اخلاقی نقطۂ نظر سے بالخصوص قابلِ اعتراض نہیں ہونے چاہئیں۔ دوسرے، ان میں عورت کو بمقتضائے ضرورت اس طرح پیش کیا جائے کہ اس سے نہ تو سفلی جذبات کو تحریک ہو اور نہ قلب و نظر سفلی انداز میں متاثر ہوں۔ اس ضمن میں پردے کا مسئلہ پیدا ہوگا، جس سے الگ گفتگو کی گئی ہے۔ بہر حال، عکسی فلم کے حوالے سے اس مسئلے کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے؛ لہٰذا ہمیں اس عہد کی

مقتضیات کی رعایت سے عکسی پردے سے متعلق اجتہاد اور فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ ازبس اہم نکتہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ اگر ہم نے پردے کی بنا پر ٹیلی وژن اور ریڈیو میں عورت کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تو ناظرین اپنے ملک کا ٹیلی وژن دیکھنے اور ریڈیو سننے کے بجائے دوسرے ملک کا ٹیلی وژن دیکھنا اور ریڈیو سننا شروع کر دیں گے، اس کے نتیجے میں ہماری۔ ثقافتی، اخلاقی اور مذہبی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہونے کے امکانات کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا؛ نیز ہمیں وی سی آر کی مقبولیت و اہمیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ علاوہ بریں، سائنس نے زمان و مکان کو مسخر کر کے سفر کو سہل اور مختصر ہی نہیں بلکہ ناگزیر ضرورت بنا دیا ہے اور بیرونی ممالک میں سفر کے لیے پاسپورٹ پر فوٹو کا ہونا ناگزیر ہے، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ آزاد دُنیا اور بے پردہ معاشرتی ماحول میں ہمارا مرّوجہ پردہ دعوتِ نظارہ دینا اور محجوب خواتین کے لیے باعثِ استہزاد و شماتت بن جاتا ہے، لہٰذا پردے اور فوٹو کے متعلق اجتہاد کرتے اور فیصلہ دیتے وقت ان باتوں پر مخلصانہ غور کرنا بھی مجتہدین کی ازبس اہم ذمے داری ہے۔

(۸) سمع بالغیب سے متعلق اجتہاد کرتے اور فیصلہ دیتے وقت یہ واقعیت خلیفہ فی الشوریٰ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹرانسسٹر، وی سی آر۔ ایسے سائنسی آلات کی ایجاد سے انسان گھر بیٹھے دُنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں اور گلوکاروں کی موسیقی سُن سکتا ہے۔ لہٰذا اگر حکومت نے اپنے ملکی نشریاتی اداروں سے نسوانی آواز میں موسیقی کی نشریات بند کر دیں تو سامعین اپنے نشریاتی اداروں کے پروگرام سننا بند کر دیں گے اور دوسرے ملکوں کے ریڈیو اور کیسٹوں سے نسوانی آواز میں موسیقی سننا شروع کر دیں گے۔ اس کے نتیجے میں ملک کے نشریاتی اداروں کی مقصدیت ہی فوت ہو جائے گی اور یہ ایسا ضیاع ہے جس کا متحمل اس دَورِ تشہیر و ابلاغ میں کوئی ملک نہیں ہو سکتا۔

میرے نزدیک سمع بالغیب کی افادی اقدار اس کی منفی اقدار سے زیادہ ہیں، لہٰذا قرآنِ مجید کے "اصولِ انفع" کی بنا پر اسے جائز قرار دے دینا چاہیے۔ قدرت نے ہر شخص کو ذوقِ غناء ودیعت

کیا ہے اور وہ اس کی تسکین کی، نیز جمالیاتی طرب وحظ اور سوز و ساز حاصل کرنے کی فطری آرزو رکھتا ہے اور موسیقی سننے پر اضطراری طور سے مجبور ہے، بجز اُن کے جو بے ذوق و حُسن کور ہیں، لہٰذا اُنھیں احساسِ گناہ کی خلش کے ساتھ حسنِ آواز سُننے پر کیوں مجبور کیا جائے؟ کیوں نہ ان کے دلوں سے احساسِ گناہ کے تیرِ نیمکش کو نکال دیا جائے؟ اس سلسلے میں قابلِ غور بات نغموں کے بولوں کی ہے، جنھیں ہر حال میں حسین اور صاف ستھرے ہونا چاہیئے۔ اس کی ضد یہ ہوئی کہ بول قبیح و مکروہ اور مخربِ الاخلاق نہیں ہونے چاہئیں۔ قرآنِ مجید کی رُو سے فحشآء و منکر سلبی اخلاقی قدریں ہیں جن سے ہمارا ادب اور جملہ فنونِ جمیلہ منزہ ہونے چاہئیں۔ یہ اُصول جس کے لیے ہم نے "جمالیاتی۔ اخلاقی اُصول" کی تعبیر اختیار کی ہے، ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

۲۔ رقص: طاؤس ہی نہیں ہر زندہ چیز اپنے حال و انداز میں رقص کرتی ہے، اس لیے کہ عالمِ کیف و طرب میں وجد و حال میں آنا، تھرکنا، جھومنا اور ناچنا زندگی کا خاصہ ہے۔ رقص موزونِ حرکات و سکنات سے عبارت ہے اور موزونیِ آواز و طبع کی طرح یہ بھی موہبتِ رحمانی ہے۔ ہر فن کی طرح رقص بھی وہبی۔ اکتسابی فن ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے، لہٰذا انسان کو جبلّتِ رقص عطا کرنے اور یہ فن سکھانے میں یقیناً کوئی حکمت ہوگی؛ لہٰذا اسے یکسر حرام و ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں اس کی حکمت پر تدبّر بالحق کرنا اور پھر کسی نتیجے پر پہنچنا ہوگا۔

یہ روزمرّہ کے مشاہدے کی بات ہے کہ گانا ہو رہا ہو یا ساز بج رہے ہوں تو ننھے مُنّے معصوم بچے بھی از خود اضطراری طور سے تھرکنے، جھومنے اور رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس سے اہلِ نظر صوفیہ اور علمائے نفسیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جبلّتِ گریہ و خندہ کی طرح رقص و سرود بھی جبلّتِ انسانی ہے، اسے قدرت ہر بچے کو ودیعت کر کے دُنیا میں بھیجتی ہے۔ یہ واقعیت بھی طلب گارِ تفکّر بالحق ہے کہ اکثر ادیانِ عالم میں رقص و سرود مناسکِ عبادت میں سے ہیں۔ توراتِ مقدس کی کتاب زبور میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وجد آفرین لحن میں مزامیر کے ساتھ ربِ جلیل کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تو عالمِ کیف و مستی میں رقص بھی فرماتے اور آپؑ کے ساتھ انسان تو انسان طیور و

اشجار اور کوہ و کمر بھی وجد و حال میں آجاتے، جو رقص ہی کا ایک انداز و رنگ ہے۔

رقص جو عبارت ہے حُسنِ حرکات و سکنات سے، اپنی جمالیاتی قدر اور موہبتِ رحمانی کے باعث قبیح و مکروہ یا ناجائز و حرام نہیں ہو سکتا؛ البتہ یہ رقصِ رقّاصہ ہے، جو اس کے اعضا و جوارح کے ہیجان خیز و شہوت انگیز جنسی مظاہر کے سبب قابلِ اعتراض ہے، اور خلیفہ فی الشّوریٰ کو اس کی حلّت و حرمت سے متعلق اجتہاد کرنے اور دوٹوک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اصل بہر حال پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ رقص اب بالمشافہ ہی نہیں رہا بلکہ رقص بالقلم بھی بن چکا ہے، لہٰذا اُسے ٹیلی وژن اور سینما کے پردے پر بھی دیکھا جا سکتا ہے؛ نیز ریڈیو اور ٹرانسسٹر کے ذریعے اس کا صوتی مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں رقص بالقلم کا مسئلہ نسبتاً زیادہ دقیق و پیچیدہ ہے، لہٰذا خصوصی تفکّر و تدبّر اور وسعتِ قلب و نظر اور احتیاط کا مقتضی ہے۔

۳۔ مصوّری: اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہہ کر انسان کی توجہ اس بصیرت افروز حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ وہ خود بھی خالق ہے۔ انسان بلاشبہ خالق ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرح حقیقی ہے نہ خالق بالذّات ہی ہے، بلکہ اس کی حسّی و تعلیمی قوتوں اور علم و حکمت کی طرح موزونیِ طبع اور تخلیقی استعداد بھی موہبتِ رحمانی ہے۔ اس نعمتِ الٰہی کا شکر کرنا انسان پر فرض اور شکرِ نعمت کا مطلب ربِّ ذوالجلال والاکرام کے لیے حمد و ثنا اور جذباتِ مومنیّت کے ساتھ اس نعمت کو احسن طریق سے استعمال کرنا اور اس سے استفادہ کرنا ہے۔ مصوّر بھی خالق ہوتا ہے اور اس کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کی استعداد بھی موہبتِ رحمانی ہوتی ہے، لہٰذا اس سے کام لینا اور مستفید ہونا، مقصدِ نعمت و منشائے الٰہی بھی ہے اور شکرِ نعمت بھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصوّری کا فن عبث نہیں، اس لیے کہ اللہ جلّ شانہٗ سبحان و صمد ہے، لہٰذا اس کا کوئی فعل حکمت و مقصدیت اور افادی و جمالیاتی اقدار سے خالی نہیں ہوتا۔ لحنِ داؤدی یا موسیقی کی طرح قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے باب میں تصویر کشی یا مصوّری کو بھی فضلِ رحمانی سے تعبیر کیا ہے[۲۲] اور اس طرح اُس نے مصوّری کی افادیت و اہمیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ علاوہ بریں،

قرآنِ حکیم نے، جو مکمل ضابطۂ حیات ہے، مصوّری کو حرام یا ناجائز قرار نہیں دیا، اس سے بھی اس کی حلّت ثابت ہوتی ہے۔ یہ امرِ واقعی بھی مصوّری کے حق میں جاتا ہے کہ قریب قریب جملہ ادیانِ عالم میں مصوّری کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں ایک مکتبِ فکر کے نزدیک مصوّری اپنی مطلق حیثیت میں حرام ہے نہ ناجائز، البتّہ جاندار چیزوں کی تصویر کشی ناجائز ہے۔ اس کی یہ رائے ایسی روایات پر مبنی ہے، جن کی نوعیت مُطلق نہیں، اضافی و زمانی ہے؛ دوسرے اہلِ نقد و جرح کی نظر میں ان روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے اور ان کی صحت محلِّ نظر ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی تحریکِ توحید کے آغاز کے وقت مصوّری کا فن آزروں کا غلام تھا، جو اس سے شرک و بُت پرستی کا کام لیتے تھے؛ نیز شبیہ پرستی اور مورتی پوجا کا عام رواج تھا، لہٰذا اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں تازہ واردانِ بساطِ توحید میں مصوّری کے ذریعے پھر شرک و بُت پرستی راہ نہ پا جائے ائمۂ کرامؒ نے اُسے جزوی طور سے ناجائز قرار دے دیا، یعنی جاندار اشیاء کی تصویر کشی کی حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا، اگرچہ آج بھی بیشتر ادیان میں بُت پرستی اور مورتی پوجا کا رواج ہے، لیکن فنِ مصوّری آزروں کی غلامی سے بہت حد تک آزاد ہو چکا ہے اور اس کی حیثیت جمالیاتی۔ لادینی ہو گئی ہے؛ نیز یہ زمانے کی ضرورت بن گیا ہے، لہٰذا میری رائے میں مصوّری اور فوٹوگرافی دونوں کو جائز قرار دے دینا چاہیے اور خلیفہ فی الشوریٰ کا اجتہادی فیصلہ ہر صورت میں غیر مبہم اور دو ٹوک ہونا چاہیے۔

یہ یاد رہے کہ حکومت کے مبہم اور ادھورے فیصلے قوم میں التباسِ ذہنی پیدا کرنے اور اُسے کج اندیش و کج رو بنانے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں؛ لہٰذا اُسے فیصلے کرنے کے بجائے ہر حال میں غیر مبہم، واضح اور مکمّل فیصلے کرنے چاہییں۔

تصویر کشی کے سلسلے میں یہ اصل ازبس اہمیت رکھتی ہے کہ تصویر و شبیہ آج بھی اکثر اقوامِ عالم میں اکابر پرستی کا ذریعہ اور علامت ہے اور یہ شرک ہے جو ناقابلِ عفو جرم ہے؛ لہٰذا اسلامی مملکت میں اکابر کو نذرانۂ عقیدت و ممنونیت پیش کرنے یا ان کی عظمت و تقدیس اور خدماتِ قومی و ملّی کے اعتراف کے طور پر ان کی تصویروں یا شبیہوں کو گھروں، دفتروں، کارخانوں اور کاروباری اداروں، نیز سرکاری د

نیم سرکاری تقریبات میں آویزاں کرنے کو ممنوع قرار دینا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ مورتی پوجا کا آغاز دنیا میں اسی طرح ہوا تھا۔ مورتی پوجا شبیہ پرستی یا اصنام پرستی اصل میں اکابر پرستی ہے، جو ان کی بزرگی و تقدس کے اعتراف اور ان سے اپنی عقیدت و محبت بدرجہ پرستاری کی دلیل ہے۔

۴۔ مجسمہ سازی کو آزری۔ یادگاری فن صورت گری سے تعبیر کرسکتے ہیں، اس لیے کہ یہ اکابر پرستی کی علامت ہے، جو شرک ہے اور شرک ظلم عظیم اور ناقابل عفو گناہ ہے۔ اگرچہ یہ فن اس دور میں بہت حد تک جمالیاتی اور سیکولر نوعیت اختیار کرگیا ہے، لیکن پھر بھی یہ بنیادی طور سے شرک و بت پرستی کے کام آتا ہے۔ چنانچہ یہ اسلامی ثقافت کی روح۔ توحید کے منافی ہے، لہٰذا میری رائے میں خلیفہ فی الشوریٰ کو اسے فنون جمیلہ (Fine arts) کے نصاب سے خارج کرکے ممنوع قرار دے دینا چاہیے۔

۵۔ ڈرامہ: اس کی تین بڑی قسمیں: (ا) فلمی (ب) تیاتری اور (ج) ریڈیائی۔

(ا) فلمی ڈرامہ: یہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک سینمائی، جسے متحرک فلم یا موڈی کہتے ہیں اور دوسرا ٹیلی وژنی، جسے ٹیلی وژن ڈرامہ کہتے ہیں۔ ڈرامہ کسی نوعیت کا ہو اس میں ساز و آواز کے ساتھ اصناف جمیلہ و جلیلہ کی اداکاری ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک صنف جمیلہ کی گلوکاری، صداکاری اور اداکاری کا تعلق ہے، یہ متنازع فیہ مسئلہ ہے جو اجتہاد کا متقاضی ہے۔ اجتہاد کے وقت یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ڈرامے کا مقصد محض تفنن طبع و تفریح ہی نہیں ہوتا، اصلاح فرد و معاشرہ بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے مقاصد جلیلہ میں تعلیم و تربیت دینا اور سائنسی، تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی اور نفسیاتی معلومات بہم پہنچانا بھی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ڈرامے کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ متحرک فلمیں جو محض جلب منفعت کے لیے بنائی جاتی ہیں، عموماً ثقافتی لحاظ سے معیاری نہیں ہوتیں، بلکہ قابل اعتراض ہوتی ہیں۔ اس کے عوامل و محرکات میں ایک مغربی فلموں کی تقلید ہے۔ چونکہ جنسی عریانی و نمائش اور فحاشی و منکرات مغربی ثقافت کے لوازمات بن چکے ہیں، لہٰذا ان ممالک کی فلمیں عموماً حیا سوز و اخلاق برانداز مناظر سے مزین ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک ایسی فلموں کی نمائش ممنوع قرار دینی چاہیے اور ایسی فلمیں بنانے اور ان میں حصہ

فلمیں اور انھیں دیکھنے پر پابندی لگا دینی چاہیے اور انھیں شرعاً ناجائز و حرام قرار دے دینا چاہیے؛ لیکن یہ فتوٰی صرف خلیفہ فی الشورٰی ہی دینے کا مجاز ہے۔

جہاں تک مطلق فلم سازی کا تعلق ہے، صالح فلمیں اور ڈرامے تیار کرنے کی اجازت ہونی چاہیے؛ نیز ضروری جنسی و اخلاقی قیود کے ساتھ عورت کو صداکاری، گلوکاری اور اداکاری کرنے کی رخصت ہونی چاہیے، اور خلافت باشورٰی کو اس کے جواز کا شرعی فتوٰی دینا ضروری ہے۔

(ب) تیاتری ڈرامہ یا تھیئٹر کا ڈرامہ: چونکہ اس قسم کے ڈراموں میں بالمشافہ اداکاری و گلوکاری اور صداکاری کی جاتی ہے، لہٰذا یہ نسبتاً زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ مجھے تیاتری طرب و حظ اور تفریح و تفنّنِ طبع کی اہمیت سے انکار نہیں اور نہ ہی اس حقیقت سے انکار ہے کہ غیر مسلم اور بعض مسلم ممالک میں بھی تھیئٹر کو اہمیت و مقبولیت حاصل ہے، نیز اسے محاسنِ ثقافت میں شمار کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے اکثر دانشور اور اہلِ فن تھیئٹر کی اہمیت و جواز کے قائل ہیں، لیکن اس کے باوجود میں تھیئٹر کی رولیات و لوازمات اور اپنی حسین و صالح ثقافت پر اس کے متوقع قبیح و منفی اثرات کی بنا پر اس کے جواز کے حق میں نہیں ہوں۔ یہاں پھر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اخلاقی، جنسی قیود و شرائط کے ساتھ تھیئٹر کو جائز قرار دیا جا سکتا یا نہیں؟ یہ مسئلہ اجتہاد چاہتا ہے اور اس کا فیصلہ کرنا خلیفہ فی الشورٰی کا منصب ہے، لیکن میری رائے میں تھیئٹر سے جو تفریحی و جمالیاتی فوائد حاصل ہوں گے وہ ان نقصانات سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں جو اس سے حسین و صالح ثقافت پر قبیح و منفی اثرات مرتب ہونے سے قوم کو اٹھانا پڑیں گے۔ بہرحال، یہ ضرور ہے کہ تھیئٹر کی حلّت و حرمت کا فیصلہ غیر معمولی تدبّر و تفکّر، فراست و عزیمت، وسعتِ قلب و نظر، نورِ بصیرت اور جراَتِ رندانہ چاہتا ہے۔

(ج) ریڈیائی ڈرامہ: اس میں فقط آواز سے اداکاری کی جاتی ہے، جسے صداکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر اسے تفریح و تفنّنِ طبع کے علاوہ اصلاحی، تعلیمی و تربیتی اور اخلاقی و جمالیاتی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جائے تو اس کے مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ میرے نزدیک ڈرامے کی

کہانی، مکالمے اور نفسِ مضمون قابلِ اعتراض نہ ہوں تو ڈرامے کو جائز قرار دینے میں چنداں مضائقہ نہیں؛ لیکن خلافت فی الشوریٰ کو اس کے جواز و عدم جواز سے متعلق غیر مبہم فتویٰ جاری کرنا ہوگا۔

(ب) **ثقافتی ایجادات و اختراعات:** اس سائنسی دَور میں جو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی اور تسخیر زمان و مکان کر رہا ہے، سائنسی ایجادات و اختراعات کی غیر معمولی اہمیت و افادیت سے عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتی، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی افادیت ان کے صحیح استعمال پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر بندوق ایک مفید سائنسی ایجاد ہے۔ یہ ہتھیار شکار کرنے، اپنے تحفظ و دفاع اور دشمن سے مقابلہ کرنے کے کام آتا ہے، اور یہی اس کا حقیقی مقصد ہے؛ لیکن یہی مفید ہتھیار ظالم و جاہل لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو ہلاکت آفرین بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے وہ بے گناہ لوگوں کا قتل و غارت کرتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ثقافتی ایجادات و اختراعات (مثلاً مووی کیمرا، سینما، ٹیلی وژن، ریڈیو، وی سی آر، ٹرانسسٹر وغیرہ وغیرہ) کی نوعیت ایسی ہی ہے، لہٰذا ان کا استعمال ہر حال میں درست اور مقاصدِ جلیلہ کے لیے ہونا چاہیے۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اسلام کے مقاصدِ جلیلہ میں دُنیوی حسنات کے ساتھ اُخروی حسنات شامل ہوتی ہیں، اور دُنیوی حسنات سے مادّی و روحانی حسنات مراد ہیں۔ اسلام کے نزدیک انسان کے دو جہان ہیں: دُنیا اور الحیوان یا دارالآخرت۔ فرق یہ ہے کہ دُنیا دارالعمل اور الحیوان دارالجزا ہے۔ دوسرے، دُنیوی زندگی آنی و فانی اور اُخروی زندگی جاودانی و لافانی ہے۔ اسلام دُنیوی حسنات کو توفیق اس لیے دیتا ہے کہ ان کے صلے میں انسان کو اُخروی حسنات میسر آئیں گی، اور حسنات کے معانی میں خیر و سعادت، حُسن و سُرور، فراخی و کشادگی زیست، طمانیتِ قلب و نفس اور آرزو دے حُسنِ حیات کا مفہوم شامل ہے۔

سائنسی ایجادات و اختراعات نہ صرف عسکری و معاشی بلکہ ثقافتی (یعنی علم و ہنر، ادب و فنونِ جمیلہ اور ٹیکنالوجی) ترقی کے لیے ناگزیر ہیں لہٰذا انھیں ضروری تحفظات کے ساتھ جائز قرار دے دینا چاہیے؛ مثال کے طور پر فلموں، ڈراموں اور موسیقی وغیرہ کے پروگراموں کو فحاشی و منکرات سے منزہ

ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اجتہادی فیصلے غیر مبہم اور کامل ہونے چاہییں؛ ادھورے اور مبہم نہیں ہونے چاہئیں۔ بعض مسلم ممالک میں سینما بنانا اور دیکھنا ممنوع ہے؛ لیکن ریڈیو سننے، ٹیلی وژن اور وی سی آر کے ذریعے فلمیں دیکھنے کی آزادی ہے۔ اسی طرح ان ممالک میں شراب پر پابندی ہے، لیکن امراء کے عشرت کدوں میں میخانے آباد ہیں۔ ایسی منافقانہ روش قوم کو منافق بنا دیتی ہے اور منافقت غارتگرِ وحدتِ فکر و نظر ہے۔ قوم و ملت کی اس بیماری کا اب ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے ایسے مسائل کی حلّت و حرمت سے متعلق خلافت فی الشوریٰ کا غیر مبہم اور دو ٹوک اجتہادی فیصلہ، اور اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنانا۔

حاصلِ کلام یہ کہ خلیفہ فی الشوریٰ کو واضح الفاظ میں یہ فیصلہ دینا ہو گا کہ سینما، ٹیلی وژن، وی سی آر اور تھیٹر کا دیکھنا اور ریڈیو اور ٹرانسسٹر کا سننا اور کیمرے کا استعمال شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو مذہبی پیشوائیت کو ان کی حرمت و عدمِ جواز کے فتوے دینے سے باز رکھنا ہو گا؛ اور اگر ناجائز ہے تو جملہ اداروں کو کلّیۃً بند کر دینا ہو گا اور کیمرے پر پابندی لگا دینی ہو گی؛ نیز غیر ملکی ٹیلی وژن دیکھنا اور ریڈیو سُننا اور ایسے تمام آلات کا رکھنا بھی ممنوع قرار دینا ہو گا۔

(ج) آزادیِ نُطق و قلم: انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اُسے نُطق و قلم ودیعت کیے ہیں۔ آدمی بہرہ ہو تو وہ گونگا بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ جو سُنتا ہے بولتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، نطق سے کام لینے کے لیے سامعہ کا ہونا اور اس سے کام لینا ناگزیر ہے۔ نطق کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اظہار و ابلاغ کا حسین، دلکش اور زندہ و مؤثر ذریعہ ہے اور انسان اپنے عواطف و امیال، جذبات احساسات، افکار و خیالات، عقائد و نظریات، علم و حکمت اور فنون و ٹیکنالوجی سے دوسروں کو آگاہ کرتا اور اس طرح ان کے دلوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ بلاشبہ نُطق ربِّ کریم کی نعمتِ عظمیٰ ہے، جو انسان اور دیگر مخلوقات میں مابہ الامتیاز خصوصیات میں سے ہے، لیکن جہاں تک علم سیکھنے اور سکھانے کا تعلق ہے، قلم کی غیر معمولی افادیت و اہمیت اور فوقیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ نکتہ اس آیۂ جمیلہ میں مضمر ہے: اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق ۹۶:۴)؛ یعنی اس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ علم کی ترقی اور ترویج

اشاعت نطق سے کہیں زیادہ قلم کی مرہونِ منّت ہے تو یہ مبالغہ نہیں، حقیقت کا اظہار ہوگا۔

بلاشبہ، یہ نطق و قلم ہیں جنھوں نے انسان کو خدا آگاہ و خود آگاہ اور معزز و مکرم بنایا؛ اسے علم و حکمت اور فن و ہنر سکھایا، نیز اسے عالم انفس و آفاق کو مسخر کرنے کی قوت بخشی ہے. لیکن یہ یاد رہے کہ نطق و قلم کے یہ عظیم کارنامے ان کی "آزادی" کے مرہونِ منت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو یہ عظیم کارنامے سرانجام نہ دے سکتے. غور سے دیکھیں تو ترقی یافتہ اقوام کی قوت و عظمت اور ترقی و سطوت کے عوامل میں آزادیِ نطق و قلم کو نمایاں حیثیت حاصل ہے. اصل یہ ہے کہ آزادیِ نطق و قلم انسان کا فطری حق ہے. اُسے اپنے اس حق سے محروم کرنے کا مطلب اس کا حق غصب کرنا اور اس پر ظلم کرنا ہے؛ نیز قوم کو گونگا، بہرا اور ناکارہ بنانا، ربِ جلیل کی نعمت کو ضائع کرنا، نیز انسان کو اپنا محکوم و غلام سمجھنا اور حیوان بنانا ہے. یہ معاشرتی سرطانوں کا شیوہ ہے. پاکستان سمیت مسلم اقوام کا یہ مطالبہ کہ انھیں نطق و قلم کی آزادی ملنی چاہیے، دیرینہ اور سچا ہے، لیکن بے سود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمتِ عظمیٰ نہ کبھی معاشرتی سرطانوں نے دی ہے اور نہ وہ دیں گے، اس لیے کہ وہ اپنے ظلم و عدوان، فتنہ و فساد اور سلب و نہب کے خلاف کوئی بات سُن ہی نہیں سکتے. تاریخ شاہد ہے کہ جس معاشرے میں معاشرتی سرطان ہوں، وہاں اس آزادی کو حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ہے:

معاشرتی سرطانوں کا استیصال بذریعہ حسنِ انقلاب

حسنِ انقلاب عشقِ ابراہیمیؑ سے بھی آتا ہے اور ضربتِ کلیمیؑ سے بھی؛ نفسِ مسیحائیؑ سے بھی آتا ہے اور ضربتِ رحمۃ للعالمینؐ سے بھی، لیکن احسن و اکمل انقلاب لانے کے لیے ضربتِ رحمۃ للعالمینؐ کا طریقِ انقلاب بہترین ہے۔

(د) آزادیِ نسواں: اسلامی ثقافت میں آزادیِ نسواں کا مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر متنازع فیہ بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قوم و ملت صدیوں سے اسلامی حکومت سے ناآشنا اور اس کے فیوض و برکات سے محروم ہے. حسنِ انقلاب کے بعد خلافت فی الشوریٰ کو یہ مسئلہ ترجیحی بنیادوں پر حل کرنا ہوگا. اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اسے صحیح طور سے حل کرنے کی خاطر خلیفہ فی الشوریٰ کے لیے زندگی کے جدید عمرانی، سیاسی، معاشی، عسکری اور ثقافتی (مثلاً تعلیم و تربیت، علم و حکمت، ادب و فن، سائنس و ٹیکنالوجی،

سیر و سیاحت وغیرہ وغیرہ کے) تقاضوں کے علاوہ ترقی یافتہ اقوام کی ترقی و قوت اور خوشحالی کے اسباب و عوامل کو بھی پیش نظر رکھنا لابدی ہے. عصرِ حاضر بین الاقوامی مسابقت کا سائنسی دَور ہے، لہٰذا ہمیں وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس میں عورت کی آزادیِ فکر و عمل سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

اگر یہ سچ ہے کہ مشرق و مغرب کی ترقی یافتہ اقوام کی حیرت انگیز ترقی میں عورت نے اہم کردار ادا کیا ہے اور کر رہی ہے تو پھر ہمیں اس کی آزادی کے مسئلے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا ہوگا کہ اگر ہم ذلّت و مسکنت کی دلدل سے نکلنا، ترقی کرنا اور عظیم قوتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو کیا ہم عورت کو کسب و عمل کی آزادی دیے بغیر ایسا کر سکتے ہیں؟ عقل و بصیرت شاہد ہیں کہ اس سائنسی و تکنیکی دَور میں کوئی قوم بھی عورت کو محکوم و غلام بنا کر اور اپنی نصف آبادی کی خداداد صلاحیتوں کو بے کار و معطّل کر کے نہ تو ان اقوام ایسی ترقی اور نہ ان کا مقابلہ ہی کر سکتی ہے جو بشمولِ عورت کُل آبادی کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرتی ہیں. عورت کو اس زمانے میں زندانی خانہ بنا کر اُسے اس کے فطری حقوقِ آزادی سے محروم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ فاطرِ ہستی نے اُسے صاحبِ ارادہ و اختیار نہیں بنایا ہے؛ دوسرے وہ اپنی خداداد استعدادوں کو قوّت سے فعل میں لانے اور ان سے خود مستفید ہونے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی مکلّف نہیں ہے. تیسرے وہ کریکٹر کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں؛ اور مرد کے مقابلے میں آزادی کا استعمال صحیح طور پر کرنے کی اہل نہیں. غور کریں تو یہ تینوں مفروضے خلافِ عقل و مشاہدہ ہیں.

اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ عورت بھی مرد کی طرح صاحبِ ارادہ و اختیار، قدرت کے قانون مکافاتِ عمل کی مکلّف اور اپنے اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ اور جزا و سزا کی مستوجب ہے، تو پھر اُسے اکتسابِ علم و ہنر سے محروم رکھنا اور ربِّ کریم کی ودیعت کردہ نعمتوں سے کماحقہٗ استفادہ کرنے، ملک و قوم کی ترقی اور قومی پیداوار کی افزائش کے منصوبوں میں حصہ لینے سے باز رکھنا، ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہ ظلم ہے اور یقیناً ہے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ہماری پسماندگی و مفلوک الحالی ہمارے اس ظلم کا نتیجہ ہے. عورت حیوان نہیں کہ اُسے محکوم و غلام بنا کر رکھا جائے؛ وہ انسان ہے آزادی اس کا فطری حق ہے اور اس حق سے اُسے محروم رکھنے والا (فرد ہو یا قوم) ظالم و

غاصب اور جاہل ہے۔ مرد کا فرضِ منصبی عورت کو آزادی سے محروم رکھنا نہیں، بلکہ اس کی آزادی کا احترام و تحفظ کرنا ہے؛ اُسے ایسے مواقع فراہم کرنا ہے کہ وہ اپنی وہبی و اکتسابی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قوم و ملت اور انسانیت کی خدمت کرے اور ان کے لیے باعثِ رحمت بنے، اور اس کے نتیجے میں اپنی ذات کا نشو و ارتقاء کرے۔

یہاں اس اہم نکتے کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ عورت صنفِ جمیلہ ہے، لہٰذا وہ حسنِ آزادی کی سزاوار ہے۔ حسنِ آزادی سے مراد تقدیری آزادی ہے؛ یعنی ایسی آزادی جو اس کی جسمانی و دماغی صلاحیت، طبعی و صنفی تقاضے اور ذوق کے مطابق، نیز شخصیت کے شایانِ شان ہو۔ عورت باوجود اپنی فطری حیا و تقویٰ، پاسِ عفت و عصمت اور احساسِ عزتِ نفس کے اپنے اندر جنسی جذب کا اور اس کا زوج مرد جنسی انجذاب کا شدید داعیہ رکھتا ہے، لہٰذا عورت کی "تقدیری آزادی" ایسے احوال و ظروف کو چاہتی ہے، جن میں وہ بے خوف و خطر جلالی انداز میں اپنے وظائف و فرائض سر انجام دے سکے اور کوئی مرد اپنی جان کے خوف سے اس کے ظاہری و باطنی تقدس کو پامال کرنے کی جسارت نہ کر سکے، حکومت اسلامی، حکمران عادل و صالح، عدلیہ آزاد و مؤثر اور انتظامیہ پولیس سمیت فعّال و ذمے دار اور دیانتدار ہو، نیز معاشرہ بھی صالح ہو تو عورت کو ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی کے لیے اپنی وہبی و اکتسابی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے اور اس طرح اپنی معاشرتی ذمے داریوں سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کے لیے حسین احوال و ظروف میسّر آ سکتے ہیں، جنھیں پیدا کرنا حکومت کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ ایسے صالح معاشرے ہی میں ناجائز جنسی اختلاط یا زنا کی سزا بڑی سے بڑی مقرر کی جا سکتی ہے۔ غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی قوانین کے مطابق سزا دینا عدل نہیں ظُلم ہے اور عصرِ حاضر میں اسلامی معاشرہ عنقا ہے۔

اسلام میں عورت بھی مرد کی طرح ایمان لانے اور اعمالِ صالحہ کرنے کی مکلّف ہے اور اپنے عقائد و اعمال کے لیے اللّٰہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ اور قانونِ مجازات کی مستوجب ہے۔ عمل صالح از بس اہم اصطلاحِ قرآنی ہے، جس کا مطلب ہے ہر وہ حسنِ عمل جس سے دُنیوی و اُخروی "حسنہ"

حاصل ہوتی ہو۔ حسنہ بھی اہم ترین مصطلحاتِ قرآنی میں سے ہے اور اس نے اسے خوشحالی و فراخیِ زیست، طمانیت و مسرت، عزت و وقار، قناعت و سکینت، راحت و آرام، رحمت و رضوانِ الٰہی اور انعام و اکرام اور قرۃ العین اور سلبی انداز میں فقدانِ خوف و حزن کے معانی میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ عورت کو ایسے تمام امور میں حصہ لینے کی آزادی ہونی چاہیے، جن سے دُنیوی و آخروی حسنہ حاصل ہوتی ہو۔ ان تمام امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے خلیفہ فی الشّورٰی کو اجتہاد کرنا ہوگا کہ عورت حُسنِ آزادی کی مستحق ہے یا نہیں؟ آزادیِ نسواں کا ایک اہم ضمنی مسئلہ عورت کی آرائش و زیبائش اور نمائش کا ہے، جس سے اب گفتگو کی جاتی ہے۔

۲۱۔ آرائش و زیبائش، مثلاً بال تراشی، زیبائشِ گیسو و آبرو، تلوینِ ناخن، تصویر یا فوٹو کھچوانا۔ سادگی کے محاسن اپنی جگہ، لیکن جمال آرائی صنفِ جمیلہ کا طبعی خاصہ بھی ہے اور حاجت بھی؛ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم اور احادیثِ جلیلہ کی رُو سے عورت کو آراستگی و تزئین کرنے کی رُخصت ہے؛ لیکن نام نہاد مذہبی پیشوائیت سادہ دل مسلمانوں کی جذباتی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنی پرہیزگاری کا چرچا کرنے کی خاطر مندرجۂ بالا آرائش و زیبائش کو ناجائز قرار دیتی ہے، حالانکہ معاشرے میں ان کا عام رواج ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے عورت کو برسرِ عام اپنی اشیائے زیب و زینت کی نمائش کی اجازت نہیں، لیکن گھروں میں اُنھیں ایسا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے جو دلِ معاشرہ میں بترِ نیمکش کی طرح خلش پیدا کر رہا ہے، جسے اجتہاد کے ذریعے نکالنا، خلیفہ فی الشّورٰی کے فرائضِ منصبی میں سے ہے۔

۲۲۔ میدانی کھیل، عورت کی تعلیم و تربیت اور فکر و عمل کی آزادی کے مطالبے میں میدانی کھیل کھیلنے کی آزادی کا مطالبہ بھی شامل ہے۔ اس مطالبے کے حق میں جو دلائل دیے جا سکتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے، میدانی کھیل عورت کو تندرست و صحت مند، مضبوط و حوصلہ مند بناتے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں اور ایسی عورت ہی اپنی طرح تندرست و توانا اور جرأت مند و خود اعتماد بچے پیدا کر سکتی اور ان کی بطریقِ احسن تربیت کر سکتی ہے۔ چونکہ تندرست و توانا جسم میں صحت مند و حرکی و فعال

دماغ ہوتا ہے اور انسان اپنی وہبی۔ اکتسابی صلاحیتوں کو احسن طریق سے بروئے کار لا سکتا ہے،
لہٰذا اس اعتبار سے عورت کے باب میں میدانی کھیلوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن
جہاں تک کھیلوں کی نمائش کا تعلق ہے، یہ سوال عورت کے حُسنِ آزادی کے مسئلے سے وابستہ ہے،
مگر پھر بھی اپنے لیے خلیفہ فی الشوریٰ کے الگ فیصلے کا طلب گار ہے۔

اصل یہ ہے کہ زندگی بذاتِ خود انتہائی اہم ہے، لہٰذا اس کا ہر مسئلہ، چاہے بادی النظر میں
چھوٹا ہو یا بڑا، اہم اور طلبگارِ حل ہوتا ہے۔ چونکہ حل طلب مسائل قوم میں شکوک و شبہات اور نظری و
عملی تضادات پیدا کرتے ہیں، لہٰذا انھیں اجتہاد بالشوریٰ کے ذریعے حل کرنا اسلامی حکومت کے سربراہ
کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ اس کی اہم ترین ذمے داریوں میں سے ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خلافت جب ملوکیت میں تبدیل ہوئی اور ملوک نے سیاسی مصالح کی بنا پر
اجتہاد بالشوریٰ کی ذمے داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو انھوں نے ابلیسی سیاست کے مؤثر و کامیاب
اصول "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کو اپنا کر اجتہاد کی ذمے داری مذہبی پیشوائیت کو تفویض کر دی
اور اس طرح اسلامی معاشرے میں تشتّت و افتراق کا بیج بو دیا اور
انتہائی سادگی سے کھا گیا "مملوک" مات

اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں مختلف مذاہب یا فرقوں کا ظہور ہوا؛ دین کی اصل
سے شریعت و طریقت کی بکثرت شاخیں پھوٹیں اور اختلافات و تضادات کے دبیز پردوں میں
دین کی اصل ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور اسلامی زندگی ایک محور کے بجائے ان گنت مداروں پر
گردش کرنے لگی۔ دین میں وحدتِ فکر و نظر رہی نہ اتحاد و یگانگت؛ قرآن رہا، لیکن آئینِ قرآن نہ رہا؛
دینِ اسلام دینِ ملوک بن گیا اور اسلامی معاشرہ مختلف "مسلم" معاشروں میں منقسم اور تبدیل ہو گیا۔
صدیوں سے اُمّتِ مسلمہ کی یہ صورتِ حال ہے۔ پوچھتے ہیں!

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

میرے نزدیک اس کا اب ایک ہی علاج رہ گیا ہے اور وہ ہے،

ملوکیت وہامانیت اور آزریت وقارونیت کا اِستیصال بہ ضربت حُسنِ انقلاب

حواشی

۱۔ البقرۃ ۲ : ۲۲۳۔

۲۔ مہر، کتبِ حدیث و سیرت طیبہ سے ثابت ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عموماً چار سو دینار مہر باندھتے تھے، دیکھیے مصنف کی کتاب پیغمبرِ اعظم و آخرؐ، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔

۳۔ اصولِ انفع البقرہ ۲ : ۲۱۹؛ الرّعد ۱۳ : ۱۷

۴۔ سلبی اخلاقی قدریں : (Negative ethical values)

۵۔ جمالیاتی۔اخلاقی اُصول : (Aesthetic–ethical principles)

۶۔ سبا ۳۴ : ۱۳۔

باب (۸)

حرفِ آخر

اگر دین اسلام کی اساس توحید ہے اور یقیناً ہے، اس لیے کہ اس پر خود اللہ تعالیٰ کا کلامِ آخر قرآنِ حکیم اور اس کے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا اسوۂ حسنہ شاہد ہے تو پھر ہمیں اپنے موجودہ غیر اسلامی و سرطانی معاشرے کی بیخ کنی کر کے اس کی تعمیرِ نو اساسِ توحید پر استوار کرنا ہوگی۔ اس کا طریق کار یہ ہوگا کہ ہمیں کلمۂ توحید کے منفی و مثبت اجزائے "لا" اور "الا" پر ایک ساتھ عمل کرنا ہوگا۔ یہ انقلاب انگیز عمل اپنی نوعیت میں اجتہادی۔ جہادی اور تخریبی۔ تعمیری ہوگا۔ چونکہ تعمیرِ نو سے پہلے تعمیرِ کہنہ کا استیصال ناگزیر ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں پہلے کلمہ "لا" پر عمل کرنا ہوگا، جو جگہ غیر اسلامی و سرطانی نظاموں کے بطلان و استیصال چاہتا ہے۔ چونکہ ہماری ہیئتِ اجتماعیہ بنیادی طور سے غیر اسلامی و سرطانی ہے، لہٰذا حسنِ انقلاب کی متقاضی ہے، اور ہمیں اسے بدلنے اور اس کی جگہ قرآنی نظامِ زندگی قائم کرنے کی خاطر اس کا استیصال کُلّی بلا تاخیر کرنا ہوگا۔ ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کے اہم ترین اجزائے لاینفک جو سرطان زدہ ہیں اور فوری تخریب و بیخ کنی، نیز اپنا اپنا نعم البدل چاہتے ہیں، مفصلاً ذیل ہیں:

۱۔ فرعونی۔ ہامانی یا غیر قرآنی سیاسی نظام۔

۲۔ قارونی یا غیر قرآنی معاشی نظام۔

۳۔ آزری نظامِ پیشوائیت۔

۴۔ غیر قرآنی یا سرطانی ثقافتی نظام۔

اگرچہ ان نظاموں سے بحث کی جاچکی ہے، لیکن ان کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر تکملہ کے طور پر ان سے مزید گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۔ غیر قرآنی سیاسی نظام: اس سے مراد ایسا سیاسی نظامِ حکومت ہے جس میں قوت وسطوت اور اقتدار وحکومت مستبد ومطلق العنان معاشرتی سرطانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور ملک میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بجائے اُن کا حکم چلتا ہے۔ حکمران موروثی، غاصب، خود ساختہ یا غیر منتخب ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، وہ اپنے احکام کو مختلف ناموں سے موسوم کر کے ملک میں نافذ کر کے رعایا پر بالجبر حکومت کرتا ہے، لیکن اُسے مطمئن رکھنے کی خاطر قارونوں، آزروں اور ضمیر فروش اہلِ نطق وقلم کو مراعات وانعامات، اعزازات وخطابات اور مالی امداد وسیاسی رشوت دیتا اور ان کی حمایت ومعاونت حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ جب وہ تختِ حکومت پر مضبوطی سے اپنے پاؤں جما لیتا ہے تو دولت وشہرت کے حریص وضمیر فروش اہلِ نطق وقلم کی اپنی شان میں قصیدہ خوانی ومدح سرائی اور ذرائع ابلاغ کی تشہیر باباطل سے متأثر ہو کر اپنے آپ کو نہ صرف جائز وشرعی حکمران بلکہ قوم کا رہبر ونجات دہندہ، ملک ودین کا واحد وناگزیر محافظ اور بطلِ عظیم سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس میں تکبّر وغرور کے جراثیم نشو ونما پانے لگتے ہیں، جو بالآخر حکمران کو فرعون بنا دیتے ہیں۔ علاوہ بریں، وہ خوشامد پسند ومنافق بن جاتا ہے اور "جُھکنا نہ کرنا" اس کی حکمتِ عملی کا جزوِ اعظم بن جاتا ہے؛ نیز اپنے جھوٹ کی پردہ پوشی وتوجیہ باباطل کی خاطر دروغ گوئی اس کی ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ اس کے مشیر ہامان اور معاونین قارون وآزر ہوتے ہیں، جو اپنی جماباتی فریب کاری ووسوسہ اندازی سے اُسے رعایا کے احساسات وجذبات اور ملک کے احوال وظروف سے بے خبر رکھتے اور تصویر کا صرف ایک رُخ اور بھی مزیّن کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح اسے نشۂ حکومت میں سرشار رکھتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی نشاندہی کی جاتی ہے:

۱۔ معاشرے میں استحصالی وسرطانی طبقات پیدا ہوتے ہیں، جن کے باعث وہ فساد زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ فحشا ومنکرات، جرم وگناہ، بیئہ وشر، تشتت وافتراق، عصبیت وناآہنگی اور ظلم وجہل کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

۲۔ عدل غریبوں اور مظلوموں کے لیے کمیاب وگراں بہا ہوتا ہے اور قانون کی گرفت مفلوک الحال

لوگوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

۳۔ امن و سلامتی کی جگہ خوف و حزن لے لیتے ہیں اور اہلِ حُسن و سرور کا اس قدر قحط پڑ جاتا ہے کہ اہلِ دل یہ فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

غضب ہے کہ اس زمانے میں

ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں (علامہ اقبال)

۴۔ آزادیٔ نطق و قلم مشروط و محدود ہو جاتی ہے۔

۴۔ کفالتِ قومی کی ذمے داری سے حکومت بے نیاز ہو جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں رعایا بیکاری و بے روزگاری، احتیاج و دست نگری، اور مفلوک الحالی و بے بسی کا شکار ہو جاتی ہے۔

۵۔ معاشی نظام کی بنیاد ظُلم و استحصال اور رسود پر استوار ہوتی ہے، مزارعت و مضاربت، کرایہ کاری و دستار گیری، اکتناز و احتکار اور بخل و تکاثر، نیز اسراف و تبذیر کو روا رکھا جاتا ہے۔

۶۔ فسق و فجور اور جنسی بے رہروی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

۷۔ معاشرے میں قرآن مجید کے احکام کے مطابق صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام قائم نہیں ہوتے اور نہ ان کی ضرورت ہی محسوس کی جاتی ہے، نیز انفاق بالعفو کے فرمانِ الٰہی اور سُنّتِ حسنہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی ہے اور اسے گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔

۷۔ عزّت و تکریم کا معیار تقوٰی کے بجائے مال و دولت بن جاتا ہے۔

۸۔ قومی دولت کی گردش کا دائرہ مالدار طبقے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

۹۔ محنت کش طبقات کو ذلیل و حقیر سمجھا جاتا ہے۔

۱۰۔ رشوت اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ ناگزیر ضرورت کے طور پر جائز سمجھ لی جاتی ہے۔

۱۱۔ قوم خود اعتماد رہتی ہے نہ خود دار، مجاہد رہتی ہے نہ شجاع۔

۱۲۔ شرک و اصنام پرستی (مثلاً اکابر و پیر پرستی، مزار و شبیہ پرستی اور خواہش پرستی وغیرہ وغیرہ) قوم کا شعارِ زندگی بن جاتا ہے۔

۱۳۔ قوم طبقات، مذاہب اور فرقوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور اس میں تشتّت وافتراق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی ہوا جاتی رہتی ہے۔

۱۴۔ قوم پس ماندہ و بدکردار اور تقلید پسند ہو جاتی ہے؛ نیز وہ اجتہاد و جہاد سے ڈرنے لگتی ہے۔

۱۵۔ بُخل و تکاثُر کی بیماری عام ہو کر وبا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

۱۶۔ تشہیر بالباطل کو بہترین حکمتِ عملی سمجھا جاتا ہے۔

۱۷۔ عورت حسنِ آزادی سمیت اپنے فطری حقوق سے محروم ہوتی ہے اور اسے کنیز سمجھا جاتا ہے اور کنیز داری کو روا رکھا جاتا ہے۔

الغرض، فرعونی۔ ہامانی نظامِ حکومت میں اوّل تو صلوٰۃ و زکوٰۃ، تبلیغ واخلاق اور نصاب قرآن کے مطابق تعلیم کے نظام ہوتے نہیں، اگر ہوتے بھی ہیں تو ناقص صورت میں اور قرآن و اُسوۂ حسنہ کے مطابق انھیں چلایا نہیں جاتا۔ اس کے نتیجے میں قوم جمود و تعطّل کا شکار ہو کر مردہ ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ اس میں آرزوئے حسن و حیات بھی بے جان ہو جاتی ہے۔

۲۔ قارونی یا غیر قرآنی معاشی نظام: اس سے مراد غیر قرآنی سودی۔ استحصالی نظامِ معیشت ہے۔ اس کی خون آشام خاصیّت کی بنا پر ہم نے اس کے لیے "سرطانی" نظام کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ نظام آفریدۂ ملوکیت ہے اور اس کے زیرِ عاطفت ہی نشو و ارتقاء کرتا ہے۔ اس کے نتائج و عواقب کی فہرست طویل ہے، اس میں سے اہم ترین کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔

۱۔ وسائلِ دولت سود خور سرمایہ داروں کے قبضے میں آجاتے ہیں اور قومی دولت ان کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے، جس کے نتیجے میں دیگر افرادِ معاشرہ اپنے حصّے سے محروم رہتے ہیں۔ دولت کی حیثیت وجودِ معاشرہ کے لیے وہی ہوتی ہے جو کسی فرد کے وجود کے لیے خون کی ہوتی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی فرد کے وجود میں خون کی گردش متوازن نہ رہے یا اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو جن اعضاء میں خون ان کی ضرورت کے مطابق پوری مقدار میں نہیں پہنچتا، وہ سقیم و مفلوج اور ناکارہ ہو جاتے ہیں اور اس سے سارا وجود متاثر ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال وجودِ معاشرہ

کی ہے۔ چنانچہ جب اس میں دولت کی گردش متوازن نہیں رہتی اور جن حصوں میں وہ گردش نہیں کرتی تو وہ سقیم و مفلوج اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ کمزور و نحیف، پس ماندہ و درماندہ اور گوناگوں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں، وہ ادنیٰ و اعلیٰ طبقات میں منقسم ہو کر تضادات کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح ان میں بدگمانی و ناآہنگی اور مناقشت و مخاصمت کے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں۔ یہ صورتِ حال، معاشرے میں فتنہ و فساد اور خانہ جنگی کا پیش خیمہ بن جایا کرتی ہے۔

۲۔ سود کو تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ذریعے "نفع" کے نام سے موسوم کر کے ناگزیر کاروباری ضرورت سمجھ کر جائز سمجھ لیا جاتا ہے اور سودکاری کو سرمایہ کاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مضاربت، مضارعت، کرایہ کاری، دستارگیری، تجارتی اداروں کے حصص، سرکاری تمسکات، بانڈوں، سیونگ سرٹیفکیٹوں وغیرہ وغیرہ کی خریداری کو جائز و حلال سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ ان کا "منافع" سود ہے۔ یہ یاد رہے کہ تسمیہ بالباطل، تاویل بالباطل اور تشہیر بالباطل کے ذریعے حرام کو حلال قرار دینا اس نظام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

۳۔ محنت، جو شرفِ انسانیت اور انسان کی تقدیر ہے، بیکار و حرام خور استحصالی طبقوں کے ہاتھوں اپنے شرف و وقار سے محروم ہو جاتی ہے اور محنت کش طبقات ذلیل و حقیر سمجھے جاتے ہیں۔

۴۔ دولت تکریمِ انسانی کا معیار بن جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں قوم طرح طرح کی معاشرتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے، مثلاً بخل و تکاثر، اسراف و تبذیر، رشوت و جعلسازی، قماربازی و حرام خوری، احتکار و اکتناز، سمگلنگ، چوربازاری، تجارتی بددیانتی و بدکرداری، فحشاء و منکرات، منافقت و دروغ گوئی، عصمت فروشی و ضمیر فروشی، دُزدی و رہزنی وغیرہ وغیرہ۔

اس ضمن میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ معاشرتی بیماریاں چونکہ سرطانی معاشی نظام کی پیداوار ہیں لہٰذا جب تک یہ نظام قائم ہے، ان کا علاج تحصیلِ حاصل ہے، اس لیے کہ یہ پیدا ہوتی رہیں گے، جس طرح تاریکی و گندگی میں حشرات الارض پیدا ہوتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں،

سرطانی معاشرے میں سرطانی امراض کا علاج فقط ایک ہی ہے اور وہ ہے استیصالِ نظام بضرب حُسنِ انقلاب، اور عدل و احسان پر مبنی حسین و مثالی نظامِ معیشت کی تعمیرِ نو۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ اس کی تردید کی ہمارے پاس کوئی معقول وجوہ نہیں تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم اصلاحِ معاشرہ کی باتیں کرنے کے بجائے حسنِ انقلاب کی باتیں کریں، اُسے لانے کی تدبیر سوچیں اور لائحہ عمل تیّار کریں، جس کا احسن و اکمل نمونہ ہمیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃً للعالمینی میں ملتا ہے۔

۳۔ آزری نظامِ پیشوائیت: یہ غیر قرآنی نظام میں بھی ملوکیت کی ضرورت اور اس کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے ہیولے میں شرک کی صورت مضمر ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود آزر اپنے آپ کو مشرک و بُت پرست کہلانا پسند نہیں کرتے۔ یہ خود بھی سرطانی طبقہ ہے اور اس کے معاون و سرپرست بھی سرطانی یعنی فرعونی و ہامانی اور قارونی طبقے ہوتے ہیں۔ آزریت کی پہچان یہ ہے کہ یہ مختلف فرقوں میں منقسم ہوتی ہے، جو ایک دوسرے کی تکذیب و تکفیر کرتے اور باہم دست و گریباں رہتے ہیں۔ لیکن ان میں قدرِ مشرک بھی ہے اور وہ ہے مذہبی اجارہ داری و استحصال بالمکر۔ آزری نظام کے بعض نمایاں خصائص یہ ہیں۔

۱۔ شرک و مشرکانہ رسوم، مثلاً اکابرو پیر پرستی؛ مزار و آستانہ پرستی؛ غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ و رب سمجھنا، اُنھیں اپنا رازق و حاجت روا، غوث و دستگیر اور فریاد رس و مستجیب الدعوات سمجھنا، اُنھیں پکارنا، ان سے امداد طلب کرنا اور ان کے نام کی نذر و نیاز دینا، مزاروں پر چڑھاوے چڑھانا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ نذرانوں، چندوں وغیرہ کی صورت میں لوگوں کا استحصال کرنا۔

۳۔ بے قرآن و قلم مدارس، ان میں نصابِ قرآن اور علومِ جدیدہ، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین، نیز قلم کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ آزریت قومی نظامِ تعلیم میں ثنویت پیدا کرنے کی ذمے دار ہے۔

۵۔ اجتہاد و درایت کی حوصلہ شکنی؛ لیکن تاویل بالباطل کے فن کو آزریت کے لیے مخصوص سمجھنا۔ آزروں نے اپنے تاویل بالباطل کے فن کے ذریعے قرآن مجید کے احکام و تعلیمات کی صورت

کو اس بری طرح مسخ کیا ہے کہ اسے دیکھ کر ہر صاحبِ دل و اہلِ نظر ربِ جلیل کے حضور یہ فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند (اقبال)

۴۔ غیر قرآنی یا سرطانی ثقافتی نظام: یہ ثقافت رنگِ فرعونی و قارونی سے مزیّن ہوتی ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کا مزاج متکبّرانہ، رویّہ تکاثرانہ اور انداز مخمورانہ ہوتا ہے۔ اس کے بعض امتیازی سلبی خصائص مندرجۂ ذیل ہیں:

۱۔ ثقافت کے رنگِ حیا کی بے آب و تابی۔ یہ یاد رہے کہ "حیا" اسلامی ثقافت کی مابہ الامتیاز خصوصیّت ہے۔
۲۔ طہارت و نظافت اور دوشیزگی و عفّت سے بے نیازی۔
۳۔ فحشاً و منکرات، جرم و گناہ اور ظلم و عدوان کی فراوانی۔
۴۔ مشرکانہ رسومات کی جلوہ سامانی۔
۵۔ رسوماتِ قبیحہ کی گرم بازاری، برنگِ اسراف و تبذیر اور بانداز تکاثرانہ۔
۶۔ لہو و لعب، منکرات و قمار بازی اور رقص و سرور کی مقبولیت و گرم بازاری اور تشہیر باالباطل۔
۷۔ مال و دولت، قوت و اقتدار، شان و شوکت، نام و نمود اور عزت و شہرت میں دوسروں سے بڑھ جانے کی طلب و سعی۔
۸۔ ثقافتی تضادات: (ا) ایک طرف بے حجابی برنگِ عریانی اور دوسری طرف پابندیٔ حجاب برنگِ ظالمانہ؛ (ب) ایک جانب صنفِ جمیلہ کو زینتِ محفل بننے اور کھل کھیلنے کی آزادی اور دوسری طرف اس کی محکومی و غلامی اور خانہ بندی؛ (ج) ایک طرف اس کی مرد پر حکمرانی اور دوسری طرف اس کی مظلومی و بے بسی (د) ایک طرف کبر و غرور کے "خدائی" مناظر اور دوسری طرف "انسان" کی تحقیر و تذلیل کے عبرت ناک نظارے؛ (ہ) ایک طرف بخل و شحِّ نفس کے

اور دوسری جانب اسراف و تبذیر کے نظارے (و) ایک طرف زندگی کے ہنگامے اور بزم آرائیاں اور دوسری طرف احساسِ تنہائی کی نیش زنیاں؛ (ز) ایک طرف خود فراموشی و خدا فراموشی کے اور دوسری طرف خود غرضی و خود فریبی اور خدا فریبی و خدا پرستی کے نظارے۔

۹۔ ابلیس کی جمالیاتی فریب کاری و جعلسازی اور انسان کی فریب خوردگی و ضلالت کے عبرت ناک نظارے۔

الغرض، فرعونی، قارونی ثقافت ابلیس کی جمالیاتی فریب کاریوں کو جولانگاہ ہوتی ہے اور خود آگاہ و خداشناس اہلِ ایمان کے سوا عام لوگوں کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے رندانِ خراباتی کی نشے میں ہوتی ہے۔ اوّل تو وہ حق کی بات سنتے ہی نہیں، اگر سنتے بھی ہیں تو گوش فراموش و بیدلی کے ساتھ۔ اسی طرح اوّل تو وہ آیاتِ الٰہی دیکھتے ہی نہیں، اور اگر دیکھتے بھی ہیں تو دلِ نامشہود و دیدۂ مخمور کے ساتھ۔ صرف اللہ تعالیٰ اور قرآنِ مجید کی بات کرو تو ان کو سخت ناگوار گزرتی ہے اور وہ بدک جاتے ہیں، لیکن معبودانِ باطلہ اور لہو لعب کی باتیں ہوں تو محفل خوب جمتی ہے۔ باتیں آسمان کی ہوں یا زمین کی، سچی ہوں یا جھوٹی، معاشرتی سرطانوں کو گوارا ہوتی ہیں، لیکن ان کے ظلم و استحصال یا جرم و عدوان کی بات ہو اور سچی بھی ہو تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اور حق گو کے خلاف آوازِ تکفیر و تعزیر سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اس نظامِ ثقافت میں جینے کے کچھ اپنے آداب ہیں اور وہ ہیں: چشم بند و گوش بند و لب بہ بند۔

ان مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ جس معاشرے میں حکمرانی معاشرتی سرطانوں کی ہو، فقدانِ عدل و تکریمِ انسانی ہو، ظلم ہو، لیکن دستورِ زباں بندی بھی ہو تو پھر عزت و آبرو اور آزادی و خوشحالی سے جینے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے:

قرآنِ مجید اور رحمۃ للعالمینؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق حسنِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا استیصال اور معاشرتی نظام کی تشکیلِ نو۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

کی مایہ ناز تصانیف

پیغمبرِ اعظم و آخرؐ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شہرۂ آفاق کتاب، جس پر رابطۂ عالمِ اسلامی نے مصنّف کو گرانقدر انعام دیا۔

رُودادِ سفرِ حجاز

اِس کتاب کے مطالعے سے قاری پر وُہ حقائق مُنکشف ہوتے ہیں جن کے اِدراک سے اِنسان خُود آگاہ و دانائے راز بنتا ہے۔ عازمینِ حج کیلیے بہترین رہنما۔

اِسلامی ثقافت

اِسلامی ثقافت پر نہایت مؤثر اور فکرانگیز کتاب، قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں۔

حُسنِ اِنقلاب

اِسلام کے مثالی سیاسی، معاشی و ثقافتی نظام کا نہایت مُدلّل تجزیہ۔

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ISBN: 969-0-00317-8